بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالہ

برائے ڈگری **پی-ایچ-ڈی**

عنوان

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ

کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار

علی صفدر جعفری

نگرانِ کار

جناب پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

بحوالہ پنجاب یونیورسٹی مراسلہ نمبر 1448/G.M مورخہ 11 دسمبر 1973ء
مراسلہ نمبر 211/G.M مورخہ 19 فروری 1983ء

مـنـدرجـات

پیش لفظ

الحمدللہ مقالہ بعنوان " نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ،، پنجاب یونیورسٹی کے منظور شدہ خاکے کے مطابق تکمیلی مراحل طے کر چکا ھے - مین نے اپنے محدود وسائل کے باوجود زیر نظر مقالے کو بہتر سے بہتر بنانے کی حتی‌المقدور کوشش کی ھے - ساتھ ھی ساتھ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا ھے کہ مقالے کو بلاوجہ طول نہ دیا جائے اور ھر قسم کے رطب و یابس سے بچایا جائے - اسی لیے مین نے حقائق پر زیادہ زور دیا ھے اور لاحاصل بحثون سے احتراز کیا ھے - ؎

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قوم افراد کے مجموعے کا نام ھے - افراد کے اعمال و افکار سے ایک اجتماعی سرمایہ وجود مین آتا ھے - یہی اجتماعی سرمایہ قومی میراث کہلاتا ھے - افراد کے کارنامے اور ان کی زندگیون کے نشیب و فراز آئندہ نسلون کے لیے مشعل راہ بنتے ھین - لہذا بزرگون کے کارھائے نمایان کو زندہ کرنے ھی مین قومی ترقی کا راز پنہان ھے - خدا کا شکر ھے کہ اردو ادب مین یہ کام تحقیق و تنقید کے حوالے سے روز بروز ترقی پذیر ھے- زیر نظر مقالہ " نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ،، اسی سلسلے کی ایک کڑی ھے -

شاعر ہو یا ادیب اپنے گردو پیش کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ احساسوں کا جو ہجوم اس کے اردگرد ہوتا ہے اس کے بہاؤ کے ساتھ کبھی تو وہ خود بہنے لگتا ہے اور کبھی اس بہاؤ کو روکنے کے لیے دیوار بن جاتا ہے ۔ اس طرح شاعر یا ادیب کی مثال اس چٹان کی سی ہوتی ہے جو پانی کے بہاؤ سے خود بھی متاثر ہوتی ہے اور زوردار لہروں کو بھی ٹوٹنے اور بکھرنے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ اسی عمل و ردّعمل کو اجتماعی ذہنیت یا روح عصر کہا جاتا ہے اور اسی کا مجموعی تاثر شاعر یا ادیب کی انفرادیت کہلاتا ہے ۔

شیفتہ کی شخصیت پر " اسلامی ہند ایرانی تہذیب " کے گہرے نقوش تھے جن کی تہہ میں مساوات ، رواداری ، خلوص و محبت اور انسان دوستی ایسی خصوصیات جلوہ گر تھیں ۔ یہ مجموعی عکس لازمہ تھا اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب کی تعلیمات کا اور جو یقیناً تہذیب دلّی کی دین ہے ۔ شیفتہ بالواسطہ تحریک ولی اللّٰہی سے بھی متاثر تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی کٹھی آزمائشوں سے بھی گزرے تھے ۔ ایک طرف غالب و مومن ایسی عظیم ہستیوں سے بھی ان کے دوستانہ بلکہ برادرانہ روابط تھے تو دوسری طرف خاندان ولی اللّٰہی سے بھی ان کی عقیدت استوار بنیادوں پر قائم تھی ۔ ان کا علم ، حلم اور خاندانی وجاہت اس پر مستزاد۔ ان سب چیزوں نے مل کر ان کی شخصیت میں ایک ایسا نکھار پیدا کر دیا تھا جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب ، عالم اور ثقہ قسم کے نقّاد بھی تھے اور درویش صفت رئیس بھی ۔ ان کی شخصیت ان تمام رنگوں سے مل کر بنی تھی جس کی جھلکیاں ہمیں ان کی

اردو و فارسی شاعری ، تنقید ، سفرنامہ اور خطوط میں دکھائی دیتی ہیں اور جن کی شاندہی زیر نظر مقالے کے اوراق میں کی گئی ہے ۔

مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں شیفتہ کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اوّل کے سیاسی ، معاشرتی اور ادبی ماحول کا مستند کتب کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے ۔ دوسرے باب میں شیفتہ کے حالات زندگی کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ، جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے کئی ایسے گوشے سامنے آئے ہیں جو ابھی تک مخفی تھے ۔ تیسرے اور چوتھے ابواب میں شیفتہ کے آثار و افکار کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ یہاں بھی بہت سی ایسی چیزیں منظرعام پر آئی ہیں جو یا تو ابھی تک غلط فہمی کا شکار تھیں یا ان کی طرف خاطر خواہ توجہ ہی نہیں دی گئی تھی ۔ پانچویں باب میں شیفتہ اور ان کے بہت ہی قریبی دوستوں کے باہمی روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بعد میں محاکمہ پیش کیا گیا ہے ۔ ابواب کے بعد ایک فہرست کتب شامل مقالہ ہے ۔ مندرجہ کتب و رسائل سے وقتاً فوقتاً استفادہ کیا گیا ہے ۔

مواد کی فراہمی میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر اب جبکہ مقالہ مکمل ہو چکا ہے بے سود ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی ۔ اس ضمن میں میں اپنے استاد گرامی قدر اور نگران کار جناب پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب کا ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مجھے مایوسی و ناکامی کا شکار نہیں ہونے دیا ۔

مجھے اس بات کا شدّت سے احساس ہے کہ میں وقت ناوقت انھیں زحمت دیتا رہا ہوں لیکن انھوں نے ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے میرے مسائل کو سنا اور حل کیا ۔ میری تمام تر کاوشوں کی کامیابی کا سہرا موصوف کے سر ہے ۔ یہ انھیں کی راہنمائی اور بے پایاں خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج میں مقالہ پیش کر رہا ہوں ۔

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ، حضرت علّامہ احسان دانش مرحوم و مغفور اور جناب خلیل الرحمن داؤدی نے جس شفقت و محبت سے مجھے اپنے ذاتی علمی و ادبی ذخائر سے نادر کتب فراہم کیں اور وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے نوازا ، اس کے لیے میں ان بزرگوں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں ۔ وہ مواد اور کتب جو ان حضرات نے مجھے فراہم کیں حقیقتاً میری دسترس سے باہر تھیں ۔ اگر ان کی توجہ شامل حال نہ رہتی تو میں اپنا مقالہ مشکل ہی سے مکمل کر سکتا ۔ میں جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی ، جناب ڈاکٹر وحید قریشی ، جناب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور جناب ڈاکٹر محمد اقبال احمد خان کا بھی ازحد ممنون ہوں کہ ان کے مشوروں اور ہدایتوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا ۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جہاں میں نے مختلف جگہوں اور کتب خانوں کی خاک چھانی وہاں اپنے محترم دوست ناصرالدین ناصر اور استاد محترم پروفیسر انجم رومانی کی ذاتی کتب کو بھی مدتوں اپنے پاس رکھا اور ان سے استفادہ کرتا رہا ۔ میں ان کا ازحد ممنون ہوں ۔ میں اپنے والد محترم جناب مظہر جعفری ، اپنی رفیقہ حیات ، بیٹوں اور بیٹیوں کے بھرپور تعاون سے بہت خوش ہوں ۔

مقالے کی تکمیل میں ان کے صبر و تحمّل کا بھی بڑا دخل ہے ۔ میں ان کے لیے دست بدعاء ہوں کہ اللّٰہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔

شبیر بٹ صاحب ، یونیورسٹی اورینٹل کالج نے جس توجہ اور تندھی سے مقالہ ٹائپ کیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی ۔ میں ان کا ممنون احسان ہوں ۔

علی صفدر جعفری

(علی صفدر جعفری)

پہلا باب

سیاسی و معاشرتی پس منظر

(الف) اٹھارویں صدی عیسوی (نصف آخر) کے سیاسی، معاشرتی اور ادبی ماحول کا جائزہ

۱- سیاسی بدنظمی اور انتشار :

نواب مصطفی خاں شیفتہ کا دور انیسویں صدی کے ابتدائی تین چوتھائی زمانے پر مشتمل ہے، لیکن ان کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اٹھارویں صدی کے سیاسی، معاشرتی اور ادبی ماحول کا مختصر جائزہ بھی ضروری ہے -

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے وقت تقریباً پورا برصغیر مغلیہ پرچم کے زیرنگیں آ چکا تھا - لیکن اس عروج کے پس منظر میں بعض ایسی باتیں بھی نظر آ رہی تھیں جن میں اضمحلال کا پہلو موجود تھا -[۱]

اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی فتنے جاگ اٹھے، سیاسی بدنظمی اور انتشار نے خوب گل کھلائے - وارثان تاج و تخت نے خونریزیاں برپا کیں - سرداروں اور امیروں نے سازشوں میں دل کھول کر حصہ لیا - موقع پرست اور خودغرض عناصر

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ساتویں جلد، صفحہ ۱ (سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر از شمس الدین صدیقی ڈاکٹر)

لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہے ۔ ۱۷۰۷ء میں محمد معظم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ خونریز جنگوں کے بعد بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ ۱۷۱۲ء میں اس ستر اکہتر سال کے بوڑھے نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اسی دور میں سکھوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور بندہ بیراگی کا فتنہ رونما ہوا۔ راجپوتوں نے بھی سر اٹھایا لیکن کچل دیا گیا۔ تخت نشینی کے دعویداروں میں پھر خونریز جنگ ہوئی اور معز الدین جہاں دار شاہ مسند حکومت پر بیٹھا۔ وہ ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کے ہاتھوں ملک عدم کو سدھارا۔ وہ صرف گیارہ مہینے حکمران رہا مگر اس نے سلطنت مغلیہ کی تین سو سالہ عزت و آبرو ایک طوائف لال کنور کے قدموں پر نچھاور کر دی اور میدان جنگ سے بھاگ گیا ۔[1]

فرخ سیر نے ہند کی بادشاہت سادات بارھہ کی مدد سے حاصل کی تھی اور ۱۷۱۹ء میں درباری سازشوں کا شکار ہو کر انھیں کے ہاتھوں قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد سادات بارھہ نے تین شہزادوں رفیع الدولہ، رفیع الدرجات اور ابراہیم کو یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھایا۔ مگر تینوں ہی چند ماہ کے بعد وفات پا گئے تو روشن اختر ابو الفتح ناصرالدین محمد شاہ کو اٹھارہ سال کی عمر میں بادشاہ بنایا گیا ۔[2] تاریخ میں سادات بارھہ میں سے امیر الامراء حسین علی خان اور قطب الملک سید عبداللہ "بادشاہ گر" کے نام سے مشہور ہیں۔ امور سلطنت میں یہی صاحب اقتدار تھے اور بادشاہ

۱۔ منتخب اللباب حصہ چہارم ، ص ۱۳۳ ، خافی خان نظام الملک

۲۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، جلد دوم، ص ۲۰ ، ہاشمی فریدآبادی سید

کی حیثیت " شاہ شطرنج" سے زیادہ نہ تھی۔ دربار میں ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ نظام الملک کو جو اس وقت دکن میں تھا خفیہ طور پر خطوط بھجوائے گئے کہ ہمیں" سیّدوں" سے نجات دلوائی جائے[۱]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر الامراء سید حسین علی خان کو حیدرعلی کے ذریعے دھوکے سے قتل کرا دیا گیا ۔ اس طرح محمد شاہ آزاد ہوگیا کیونکہ کچھ مدّت بعد قطب الملک سید عبداللہ کو بھی زہر دلوا کر ختم کر دیا گیا تھا[۲]۔ اس میں امور سلطنت چلانے کی صلاحیت نہ تھی ۔ شروع میں وزارت اعتمادالدولہ محمد امین خان کو ملی ۔ مگر اس کے انتقال کے بعد نظام الملک کو یہ منصب سونپ دیا گیا ۔ مگر حالات سے گھبرا کر وہ بھی جلد ہی دلّی سے چلا گیا۔ اب حکومت کے سفید و سیاہ کی مالک بادشاہ کی رضاعی بہن رحیم النساء بنت محمد درویش ہوگئی ۔ بادشاہ کا زیادہ وقت زنان خانے میں گزرنے لگا۔ بادشاہ کو داد عیش دیتے دیکھ کر امیر، وزیر، خواص، عوام سبھی اس روش پر چل پڑے اور شاہد و شراب سے دل بہلانے لگے ۔

عیش و نشاط کا یہ دور جاری تھا کہ نادر شاہ قہر الٰہی بن کر نازل ہوا اور ۱۷۳۹ء میں دلّی کو جی بھر کے تاراج کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے ۔ محمد شاہ کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی کی اور خوب لد پھند کر واپس ہوا۔ نادر شاہ کے حملے نے مغل بادشاہ کی نااہلی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ سکھوں نے دوبارہ سر اٹھایا۔ آگرے کے نواح میں جاٹوں نے زور پکڑا ۔ قندھار اور کابل کے صدہا افغان اور بلوچ نادرشاہی حملے کے نتیجے میں گنگاپار کے علاقوں میں آ کر اس کثرت سے آباد ہوئے کہ یہ علاقہ ہی

۱۔ لیٹر مغلز ، جلد ۱، ص ۲۵۱ ۔ اروِن

۲۔ سیرالمتاخرین ، ص ۱۹۲، غلام حسین طباطبائی

" روهیل کھنڈ ،، کے نام سے موسوم ہوگیا۔ مشرقی ہند کے تین زرخیز صوبے بنگال، بہار اور اڑیسہ سلطنت دہلی سے عملاً کٹ گئے ۔ وہاں علی وردی خان نے جداگانہ حکومت قائم کر لی ۔ مغربی ساحل کا سارا علاقہ گجرات سے مالوہ اور بالاگھاٹ تک مرہٹوں کی تاخت و تاراج کی زد میں آ گیا۔ پنجاب کا علاقہ افغانیوں اور درّانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ محمد شاہ رنگیلے صرف محل سرا کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ۔[1]

۱۷۴۹ء میں محمد شاہ کے انتقال پر اس کا بیٹا مجاهدالدین احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بھی کم اہل باپ کا ناخلف بیٹا تھا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں محلسرا سے باہر نہ نکلا۔ محل کے اندر اس کی ماں اودھم بائی اور باہر جاوید خواجہ سرا چھائے ہوئے تھے ۔[2] غازی الدین بخشی ممالک کے ایماء سے بادشاہ اور اس کی ماں کو اندھا کر دیا گیا۔ اور ۱۷۵۴ء میں عزیز الدین عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا ۔[3] بادشاہ کی حیثیت ایک کھلونے کی سی تھی اور اقتدار غازی الدین کے ہاتھ میں تھا جس نے ۱۷۵۹ء میں اس کو قتل کر دیا ۔[4] اس وقت اس کا بیٹا عالی گہر دلّی سے دور بے خانمان و برباد پھر رہا تھا۔ اس نے باپ کے مرنے کی خبر سنی تو فوراً اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر لیا ۔[5]

ادھر نادر شاہ درّانی کو ۱۷۴۷ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد

۱۔ منتخب اللباب حصہ چہارم ، ص ۴۱۲ ، خافی خان نظام الملک
۲۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۳۰ ، ہاشمی فریدآبادی سیّد
۳۔ کیمبرج شارٹ ہسٹری آف انڈیا ، ص ۳۶۵ ، جے ۔ الان وغیرہ
۴۔ اے نیو ہسٹری آف انڈو پاکستان ، ص ۴۰۹ ، کے ۔ علی
۵۔ شاہ عالم ثانی کے عہد کا دربار ، ص ۲۸ ، لوئی آنری پولیر و لوران دولیسی

احمد شاہ ابدالی افغانستان کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس نے ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۷۶۲ء تک ہندوستان پر متعدد حملے کئے ۔ ۱۷۵۷ء کے حملے میں اس نے لاوارث دھلی کو دو ماہ تک بڑے اطمینان سے لوٹا۔ بڑے بڑے امیروں کو محتاج و فقیر بنا دیا ۔ عمائد شہر کی وہ خواریاں اور دل آزاریاں ہوئیں کہ بعض شریف لوگ خودکشی کر کے مر گئے ۔ بہت سے منہ دکھانے کے قابل نہ رہے اور وطن عزیز کی سکونت چھوڑ کر جدھر سینگ سمائے نکل گئے ۔ یہی وہ منحوس سال تھا کہ جب تقدیر کی سازش اور فریب کی تدبیر سے انگریزوں نے پلاسی کا معرکہ جیتا اور بنگالے میں اپنے قدم جمائے ۔[1]

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرھٹوں کو شکست فاش دی اور اس طرح کچھ عرصے کے لیے مرھٹہ گردی کو ختم کر دیا اور تخت دھلی پر شاہ عالم ثانی کا حق تسلیم کر کے اپنے ملک کو لوٹ گیا۔ اس نے کشمیر، پنجاب اور سندھ کے صوبوں کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔

شاہ عالم ثانی نے ۱۷۶۱ء میں بہار پر تیسری بار حملہ کیا لیکن جنرل کلائیو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا ۔ کلائیو اس کو اپنی حفاظت میں پٹنہ لے گیا اور اٹھارہ سو روپے ماہوار الاؤنس مقرر کر دیا ۔ ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی جنگ کے بعد شاہ عالم ثانی دھلی جانے کا بے حد خواھشمند تھا ۔ شجاع الدولہ کی یقین دھانی پر وہ بہار سے روانہ ہوا لیکن مزید اور دس سال تک اسے آوارہ وطن رھنا پڑا۔ اس نے ۱۷۶۳ء میں شجاع الدولہ اور میر قاسم سے مل کر بہار پر ایک بار حملے کا منصوبہ بنایا مگر

۱۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، جلد دوم، ص ۳۷ ، ھاشمی فرید آبادی سیّد

۲۲/ اکتوبر ۱۷۶۳ء کو بکسر کے مقام پر شکست کھائی - ۳/ مئی ۱۷۶۵ء کو انھوں نے کڑہ کے مقام پر دوبارہ ہزیمت اٹھائی - شاہ عالم ثانی انگریزوں سے مصالحت پر راضی ہو گیا- الہ آباد میں کلائیو نے شجاع الدولہ سے ایک معاہدے پر دستخط کرا لئے جس کی رو سے انگریزوں نے کڑہ اور الہ آباد کا کچھ حصّہ شاہ عالم ثانی کو دے دیا اور الہ آباد میں اس کی حفاظت کے لئے ایک انگریز فوج کا قیام منظور کر لیا- بادشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی چھبیس لاکھ روپے کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کر دی- ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی انگریزوں کی حفاظت میں آ گیا اور ۱۷۷۱ء تک رہا -[1]

اس اثناء میں نجیب الدولہ نے نائب سلطنت کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کو جو اب سمٹ کر مملکت دہلی بن گئی تھی، نہایت دیانت داری سے محفوظ رکھا - نجیب الدولہ کے انتقال نے شاہ عالم ثانی کو متفکر کر دیا- اسے ڈر تھا کہ کہیں سکھ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کسی آوردہ کو تخت دہلی پر نہ بٹھا دیں - اِس نے مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا اور چالیس لاکھ روپیہ اور کڑہ و الہ آباد دینے کا وعدہ کر لیا- مرہٹوں نے اس کے نام پر دہلی پر قبضہ کر لیا- انگریزوں نے اس کے اس اقدام پر ناراضگی کا اظہار کیا لیکن کوئی مداخلت نہ کی- شاہ عالم ثانی ۱۳/ اپریل ۱۷۷۱ء کو الہ آباد سے دہلی کے لیے روانہ ہوا -[2]

۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۳ء تک ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان وزیر نے بادشاہ کی ساکھ

۱- شاہ عالم ثانی کے عہد کا دربار، ص ۲۹، لوئی آنسری پولیر و لوران دو یسی
۲- ایضاً، ص ۳۰

کو قائم رکھا اور اس کو ہر طرح کی آفات سے بچایا ۔ ۱۷۸۶ء مین غلام قادر روھیلہ نے بادشاہ کو اندھا کر دیا۔ بادشاہ جان بچا کر آگرے بھاگ گیا جہان اس نے مادھو جی سندھیا سے مدد مانگی جس نے غلام قادر روھیلہ کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ اب شاہ عالم ثانی گویا مادھو جی سندھیا کی پناہ مین آ گیا۔ جب ۱۷۹۴ء مین مادھو جی سندھیا مر گیا تو اسکے جانشین دولت راؤ سندھیا نے اپنی پناہ کو اور بھی سنگین بنا دیا۔

اسی اثنا مین انگریزون کا اقتدار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے بہتر اسلحہ و فوجی تنظیم ، ذھنی و علمی فوقیت اور مدبرانہ صلاحیتون کی بناء پر وہ ھندوستان کی سب چھوٹی موٹی قوتون کو برابر ھڑپ کرتے جا رہے تھے ۔ اب شمالی ھند انگریزون کے زیر اثر آ چکا تھا ۔ جنوبی ھند مین حیدر علی خان نے انگریزون کو نکالنے کی کوشش کی مگر اس کی موت نے (۱۷۸۲ء) یہ کام مکمل نہ ہونے دیا ۔ اس کا بیٹا سلطان ٹیپو انگریزون کے مقابلے مین ڈٹا رہا ۔ سلطان ٹیپو نے ورثے مین خداداد ذھانت پائی تھی ۔ اس نے انگریزون کے خطرے سے ھندوؤن اور مسلمانون کو آگاہ کیا لیکن کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ دی ۔ مرھٹون اور نظام نے انگریزون کا ساتھ دیا ۔ خود سلطان ٹیپو کے امراء غدّاری پر اتر آئے اور وہ شیر مرد گیدڑون کا شکار ہوگیا (۱۷۹۹ء) ۔[1]

۱۸۰۳ء کی مہم مین جنرل لیک نے علی گڑھ، دھلی اور آگرہ فتح کیا اور دکن مین جنرل ولزلی نے ناگپور سے راجہ بھوسلہ کو پے در پے شکستین دین ۔ ۱۸۰۳ء مین انگریز افواج دھلی مین داخل ہوئین اور نابینا بادشاہ کو اپنی زیر حفاظت تخت پر بٹھا دیا ۔

۱۔ مومن، ص ۲۰، کلب علی خان فائق رامپوری

مگر اب اس کی حیثیت ایک پنشنر کی سی تھی اور سوائے لال قلعہ کے اس کے اختیار مین ایک گاوںؑ تک بھی نہ تھا ۔ اس طرح شاہ عالم کے زمانے مین سارا ھندوستان کمپنی کے زیر اقتدار آ گیا ۔

۲۔ معاشرتی بدحالی اور ادب پر اس کے اثرات :

اٹھارھوین صدی عیسوی ابتری، تلاطم اور آشوب کا وہ بھیانک دور تھا جس مین پورا برصغیر فتنہ و فساد کے مختلف عناصر کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ۔ جون جون سلطنت مغلیہ کی گرفت کمزور ہوتی گئی داخلی نظم و نسق درھم برھم ہوتا چلا گیا ۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات نے زندگی کے ہر شعبے کو براہ راست متاثر کیا [۱] ۔ تمام ملک اور بالخصوص دھلی مین ایک عجیب قسم کی ذھنی بے چینی، بے اطمینانی اور نفسانفسی پھیلی ہوئی تھی کہ کسی کو کل کی خبر نہ تھی کہ کیا ہونے والا ھے ۔ ہر شخص کھویا کھویا اور سہما سہما سا نظر آتا تھا ۔ اقتصادی بے بسی کے ساتھ ساتھ لوگون کی جان، عزت و ناموس کی حفاظت کا نہ کوئی معقول انتظام تھا اور نہ یقین ۔ خودغرضی، ریاکاری، نفس پرستی، بدخوئی، جھوٹ، مکرو فریب، دغا، نفرت، بغض، عناد، رقابت ایسے سفلی جذبات ہر فرد کے دل مین گھر کر چکے تھے ۔ ان حالات کا ھمارے شعراء اور نثر نگارون نے جو اثر لیا اسکی شہادت ان کے کلام سے ملتی ھے ۔ غزلون مین ان واقعات کی طرف اشارے کہین کہین

۱۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص ۲۴، نورالحسن هاشمی

تو واضح ہیں، لیکن اشاروں اور کنایوں کی صورت میں ہیں، کیونکہ غزل کا فن عام طور پر ایمائیت اور اشاریت کا ہے ۔ دیگر اصناف، بالخصوص ہجویات، طنزیات، قصائد اور شہر آشوبوں میں شعراء نے ذرا کھل کر ان حالات کا ذکر کیا ہے ۔ بعض شعراء نے اپنے ذاتی حالات و واقعات کے بیان میں بھی ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ نثر میں البتہ اس قسم کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس وقت تک اردو نثر کو ادبی حیثیت سے کوئی وقار حاصل نہیں ہوا تھا ۔[1] شعر و ادب کو زندگی میں اہم مقام حاصل ہے ۔ کسی ملک اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف اداروں اور شعبوں کا عکس اسکے ادبیات میں جھلکتا ہے ۔ سیاسی اور سماجی اداروں کی کارکردگی کے جو نتائج ظہور میں آتے ہیں ان کا جائزہ بالآخر مفکّر، ادیب اور شاعر ہی لیتے ہیں ۔ ان ذکی الحس افراد کی ذات میں معاشرہ اپنے آپ کو پہچانتا اور اپنا محاسبہ کرتا ہے ۔ یہ لوگ ان اقدار و روایات کے پاسبان ہوتے ہیں جو کسی معاشرے کی روح رواں اور فکر و عمل کی مظہر ہوتی ہیں ۔[2]

میر جعفر زٹلی نے " در احوال دنیا و اہل دنیا ،، کے عنوان سے اپنے زمانے کے معاشرتی مسائل کا ذکر کیا ہے :-

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے　　　ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

---

۱ - تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ساتویں جلد، ص ۳۶۷ (اس دور کے نثر نگار - ابواللیث صدیقی ڈاکٹر)

۲ - اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر (پیش لفظ) ، ص ۱ - غلام حسین ذوالفقار ڈاکٹر

خان آرزو (وفات ۱۷۵۶ء) کی نظرون مین زندگی اتنی بے وقعت ہو چکی ہے کہ وہ محبوب پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہین ہین ؎

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہین　　　زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

نجم الدین آبرو محمد شاہی دور کی زندگی کا مرقع یون پیش کرتے ہین ؎

اب زمانہ بری طرح بگڑا　　　کیا بنے روزگار کی صورت

محمد شاکر ناجی کے سلسلے مین مولانا محمد حسین آزاد " آب حیات،، مین اسطرح فرماتے ہین :

" نادری چڑھائی اور محمدشاہی لشکر کی تباہی مین خود شامل تھے ۔ اس وقت دربار دہلی کا رنگ ، شرفاء کی خواری ، پاجیون کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیون کی آرام طلبی اور ناز پروری کو ایک طولانی مخمّس مین دکھایا گیا ہے ۔ افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ آئے : ؎

بڑے ہوئے نو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعاء کے زور سے دائی ددا کی جیتے تھے
شرابین گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگارو نقش مین ظاہر کہ گویا چیتے تھے

گلون مین ہیکلین بازو اوپر طلا کی نال
قضا سے بچ گیا مرنا نہین تو ٹھانا تھا
کہ مین شان کے ہاتھی اوپر شانا تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا

ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دکان نہ غلّہ و بقّال "[1]

یہ دو بند آزاد نے "مجموعہ نغز" سے نقل کیے ھین ۔[2]

شرف الدین مضمون نے غزل کے اشارون مین اپنے عہد پر تبصرے کیے ھین ۔ مصطفی خان یکرنگ کے کلام مین بھی اس عہد کے عمومی حالات کا عبرتناک نقشہ نظر آتا ھے ۔ شاہ حاتم کا دور محمد شاہ کے عہد سے شاہ عالم ثانی کے دور تک کے حالات کے شاعرانہ تبصرے پر محیط ھے ۔ مظہر جان جانان کی شاعری مین بھی سیاسی رنگ کی جھلک موجود ھے ۔ اس سلسلے مین سودا کا وہ مشہور شہر آشوب بھی آ جاتا ھے جو اردو شاعری مین ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گیا ھے ۔ جو واقعات مورخین نے بیان کیے ھین انھین سودا نے اس خوبی سے نظم کیا ھے گویا سب کچھ ان کا چشم دید ھے ۔ سودا کے ایک اور قصیدے کا عنوان "تضحیک روزگار" ھے جو بظاھر تو ایک گھوڑے کی ھجو ھے لیکن دراصل اس فوجی نظام پر ایک عبرتناک تبصرہ ھے جسکے بل بوتے پر حکومت کا نظام قائم ھوتا ھے ۔ مزیدبرآن سودا کے قصیدون، مثنویون، قطعون اور رباعیون مین ان کے عہد کے نہایت تفصیلی مرقعے دکھائی دیتے ھین ۔ شیخ چاند مرحوم نے سودا کی شاعری کے بارے مین کہا ھے کہ انھون نے :

۱۔ آب حیات، ص ۱۰۵، محمد حسین آزاد مولانا

۲۔ مباحث، ص ۱۰۵، سید عبداللہ ڈاکٹر

" سلطنت مغلیه کی ابتری ، انتظامی خرابی اور امراء کی سازشون اور بادشاہ وقت کی نااھلی کی پردہ دری نہایت جراٴت سے کی ھے"۔[١]

میر تقی میر کی دردمندی مین ان کے مزاج ، شخصی حالات اور محبت کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات و واقعات کا عنصر بھی شامل ھے :۔۔

دلّی مین آج بھیک بھی ملتی نہین انھین تھا کل تلک دماغ جنھین تخت و تاج کا

خواجه میر درد باوجودیکه دنیا سے لگاوٴ نه رکھتے تھے ، اپنی شاعری مین آشوب زمانه سے متاثر نظر آتے ھین ۔ تابان نے مختلف اشارون سے اپنے اشعار مین ناساعد حالات کا ذکر کیا ھے ۔ مصحفی نے اسیری ، بلبل ، طائر ، قفس اور گلزار وغیرہ کی علامتون کو جس سیاسی شعور کے ساتھ استعمال کیا ھے اس مین کم ھی شاعر ان کے برابر قرار دیئے جا سکتے ھین ۔ اقتصادی بدحالی اور ابتری کے سلسلے مین مصحفی نے فرنگیون کو بھی مورد الزام ٹھہرایا ھے ۔ ۔۔

ھندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ که تھی کافر فرنگیون نے بتدبیر کھینچ لی[٢]

اشرف علی خان فغان، بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے اور بادشاہ کی اصلی حالت سے باخبر ۔ لہذا اپنے کرب کا اظہار اپنے اشعار مین کر کے اپنے دل کا بوجھ ھلکا کرتے رھتے ھین ۔ قائم چاندپوری نے اپنے شہر آشوبون مین عوام کی خستہ حالی بڑی دلسوزی کے ساتھ بیان کی ھے ۔ نظیر اکبرآبادی نے بھی اپنی نظمون اور شہر آشوبون مین

١۔ سودا ، ص ٢٥٣ ، شیخ چاند

٢۔ ١٨٥٧ء کا تاریخی روزنامچه ، ص ٢١ ، (از عبداللطیف) ، مرتبه خلیق نظامی

معاشرتی زبون حالی اور اقتصادی ناھمواری کا بار بار ذکر کیا ھے [1] اسی دور مین هجو نگاری کا آغاز ھوا۔ میر، سودا اور جراتؔ وغیرہ نے اپنے غم و غصے کا اظہار اس طرح بھی کیا۔ دراصل شاعر اپنے دور کی ترجمانی کرتے ھین اور جو گندگی معاشرے مین راہ پا جاتی ھے وھی ان کے کلام کے پردے سے جھلکتی ھے [2]

۳۔ نئے ثقافتی و ادبی مراکز۔۔ جاگیردار طبقے کی اھمیت :

اٹھارھوین صدی عیسوی کے وسط تک اگرچه دھلی مین مغل تہذیب و تمدن کا اور اردو زبان و ادب کا چرچا رھا لیکن اس کے گردو نواح مین بدنظمی بڑھتی رھی اور اس سے متاثر ھو کر ارباب علم و ھنر برابر دوسرے مقامات کو جاتے رھے ۔ یون تو دھلی سے شاعرون، عالمون اور اھل فن کی روانگی نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) کے بعد ھی شروع ھو گئی تھی لیکن اس مین تیزی ۱۷۵۷ء کے بعد آئی جبکه ابدالی نے دھلی تک پیشقدمی کر کے وھان کے امراؤ روسا کو اس قابل نه رکھا که وہ فنون اور شعر و ادب کی سرپرستی جاری رکھتے ۔

بادشاھی زمانے مین دیگر فن کارون کی طرح شعراء بھی دربار شاھی اور امراء کے توسّل سے جیتے، بڑھتے اور نامور ھوتے ھین ۔ جہان کہین اور جب کبھی کسی بادشاہ، امیر یا رئیس کو فراغت حاصل ھوتی تو یه افراد ان سے ملحق ھو جاتے اور جب ان کی

۱۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخ پس منظر، ص ۲۰۳، ابوالخیر کشفی

۲۔ جراتؔ ان کا عھد اور عشقیه شاعری، ص ۵۸، ابواللیث صدیقی ڈاکٹر

حالت کمزور پڑ جاتی تو ان پر بھی گردش آ جاتی[۱]۔

شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتے رہنا، رعایا کے جان و مال کا عدم تحفظ، تلاش معاش کی دقتین، شعراء کی بے قدری اور بیکاری چند ایسی وجوہ تھین جن کی بنا پر یہ اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات پر تلاش روزگار کے لیے مجبور ہو گئے ۔ چنانچہ فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد، مرشدآباد اور حیدرآباددکن وغیرہ نے دہلی کے ان شورہ بختون کو اپنی آغوش محبت مین جگہ دی ۔ صاحب " گل رعنا " فرماتے ہین :

" دلّی کی تباہی کے بعد ارباب فضل و کمال کا کوئی ملجا و ماوی نہین رہا ۔ کچھ لوگ مرشدآباد چلے گئے، کچھ حیدرآباد گئے ۔ مگر یہ مقامات دلّی سے اتنی دور تھے اور سفر مین اتنی دشواریان تھین کہ ہر ایک کو ان مقامون پر جانے کی ہمت نہین پڑتی تھی --- دلّی سے قریب تر فرخ آباد، فیض آباد دو مقام ایسے تھے جہان ان بدنصیب خانماں آوارہ لوگون کی بہت قدردانی ہوتی تھی---[۲]"

فرخ آباد :

شہر فرخ آباد کی بنیاد ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۷۱۴ء مین ڈالی گئی ۔ یہ ریاست نوّے سال قائم رہی ۔ اس زمانے مین بہت سے اہل علم و فن وہان پہنچے ۔ مرزامحمدرفیع سودا

۱۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص ۲۷، نورالحسن ہاشمی
۲۔ گل رعنا (تذکرۂ شعرائے اردو) ، ص ۳۳۰، عبدالحیؒ مولانا

اور میر سوز ایسے ممتاز شعراء نے وہان کا رخ کیا۔ اس طرح فرخ آباد اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گیا۔ یہ ریاست ۱۸۰۱-۲ء مین انگریزی حکومت کے قبضے مین آ گئی [۱]۔ یہ جاگیر ۱۸۵۷ء کے طوفان مین دریا برد ہوئی ۔ فرخ آباد مین نواب مہربان خان رند جو نواب احمد خان بنگش کے ایک معزز رکن دربار تھے خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی دان تھے ۔ شعر و سخن مین انھون نے میر سوز اور جب مرزا سودا دلّی سے فرخ آباد آئے تو ان سے بھی اصلاح لی تھی [۲]۔

کٹھیر (روہیلکھنڈ):

یہ علاقہ ہمالیہ کے دامن مین واقع ہے اور اس کے بڑے حصے کو دریائے گنگا نے سیراب کیا ہے ۔ روہیلون کے یہان آباد ہو جانے کی وجہ سے اس کا نام روہیلکھنڈ پڑ گیا [۳]۔ علی محمد خان، روہیلہ پٹھانون کا سردار تھا۔ اس نے یہان کے حاکمون کو شکست دی اور خود حاکم بن بیٹھا۔ اس کے انتقال پر حافظ رحمت خان یہان کا حاکم بنا ۔ دھلی کے بگڑنے پر نواب علی محمد خان نے کچھ دنون شعراء کو مدعو کیا تھا لیکن جلد ھی اس کا اقتدار جاتا رہا اور پھر وہان کے متوسّلین بے یارو مددگار ہو گئے ۔

شانڈہ:

یہ آنولہ ضلع بریلی اور رامپور کے قریب واقع ہے اور نواب محمد یار خان متخلص

۱- عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ، ص ۱۳-۳۲، ولی اللہ فرخ آبادی مفتی
۲- تاریخ ادب اردو، ص ۳۰۸، سکسینہ (مرتب : فاضل لکھنوی، مترجم :عسکری)
۳- حیات حافظ رحمت خان، ص ۳۱، الطاف علی بریلوی سیّد

بـہ امیـر کی قیام گاہ تھا ـ نـواب مـوصوف ، نـواب فیض اللہ خان والئی رامپـور کے چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعـر اور شعراء نـواز تھے ـ انھوں نے پہلے میـر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نـہ آئے تـو قائم چانـدپـوری کو جو خواجہ میـر درد اور مرزا سودا کے شاگرد تھے ، طلب کیا اور ان کو سو روپے ماہوار دیا اور انھین کے شاگرد ہو گئے ـ مصحفی، فـدوی لاہوری، میر محمد نعیم پـروانہ اور عشرت وغیـرہ بھی اس دربار سے وابستہ رہ چکے ھین ـ نـواب صاحب کا انـتقال بمـقام رامپـور ١١٨٨ھ مـطابق ١٧٧٣/٧٥ء مین ھوا ـ [١]

مـرشـد آبـاد :

شمالی ھنـدوستان اور مشرقی بنـگال (ڈھاکہ) کے درمیان ایک ثـقافتی سنگم تھا ـ جب دھلی نادری اور درّانی حملون مین برباد ھوئی تو اھل علم کے لیے بڑی جائے پناہ مرشدآباد ھی تھا ـ مشہور شاعر سوز ، میـر درد کے صاحبزادے الم، فـدوی لاھوری، شاہ رکن الدین عشق، اشرف علی خان فغان، شاہ قـدرت اللہ خان قـدرت دھلی سے مرشدآباد پہنچے ـ انشاء کا خانـدان بھی دھلی چھوڑ کر وھان گیا اور انشاء وھین پـیدا ھوئے ـ [٢]

عـظیـم آبـاد :

نـادری حملے مین مـظھر جان جانان کے اکثـر نامـور تلامذہ اور مریدین مین سے

١ـ تاریخ ادب اردو، ص ٣٠٩ ، سکسینہ (مرتب : فاضل لکھنوی، مترجم : عسکری)

٢ـ رود کوثـر، ص ٦١١، محمد اکرام شیخ ڈاکٹر

بعض مثلاً* ہیبت قلی خان حسرت، میر محمد باقر حزین، محمد فقیر دردمند دہلی سے عظیم آباد گئے - اس زمانے مین یہان کے بعض ہندو کائستھ رؤسا نے اردو ادب کی سرپرستی کی - مہاراجہ شتاب رائے جو عظیم آباد کے نائب صوبیدار اور مرشدآباد کے نائب دیوان تھے، اشرف علی خان کی سرپرستی کیا کرتے تھے - ان کے بیٹے مہاراجہ کلیان رائے عاشق بھی صاحب دیوان شاعر تھے - عظیم آباد کی دوسری عظیم ہستیون مین راسخ تھے جنہین بہار کا میر کہا جاتا تھا (وفات ۱۸۲۵ء)-[۱]

دکن :

محمدشاہی دور مین آصف جاہ (نظام الملک) نے دکن مین ایک نئی ریاست قائم کر لی تھی - چونکہ یہ جگہ دلّی سے بہت دور پہاڑون مین واقع تھی اس لیے اس دور کے اہل فن حضرات وہان کم ہی جاتے تھے - مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہنچ ہی گئے - چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر، آصف جاہ ثانی کے عہد مین پہنچے اور وہین ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸/۹۹ء مین رحلت کی - ان کے ایک شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے " استاد از جہان رفت،، تاریخ کہی - شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدرآباد (دکن) گئے تھے-[۲]

اودھ :

اودھ کے صوبیدارون نے دہلی کو روبہ انحطاط دیکھا تو اپنے علاقے کی

۱- رود کوثر ، ص ۶۱۸، محمد اکرام شیخ ڈاکٹر

۲- تاریخ ادب اردو، ص ۳۱۰، سکسینہ (مرتب : فاضل لکھنوی، مترجم :عسکری)

طرف متوجہ ہوئے۔ شجاع الدولہ کا مستقر فیض آباد تھا۔ ان کے بیٹے آصف الدولہ نے اپنا مستقر فیض آباد کی بجائے لکھنؤ قرار دیا۔ ان کے زمانے مین دھلی، فرخ آباد، شاہدرہ اور دوسرے شہرون سے باکمال صاحبان فن لکھنؤ پہنچنے لگے۔ یہ سب کی قدر کرتے تھے۔[1] ١٧٧۵ء کے بعد وہی تہذیب و تمدن اور ثقافتی سرگرمیون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ سراج الدین علی خان آرزو، جعفر علی حسرت، میر ضاحک، قمرالدین منت، اشرف علی خان فغان اور مرزا رفیع سودا دوسرون سے پہلے اودھ پہنچے تھے۔ بعد مین میر تقی میر، میر سوز، مصحفی، انشاء، جرأت، میر حسن وغیرہ بھی وہین چلے گئے۔[2] مرزا محمد تقی خان ترقی شاگرد میر سوز، طالب علی خان عیشی شاگرد قتیل، جعفر علی حسرت، بقاء اللہ خان بقا، میر ولی اللہ محب شاگرد سودا، میر حیدر علی حیران شاگرد رب سنگھ دیوانہ، میر ضاحک، مرزا فاخر مکین، میر غلام حسین برشتہ شاگرد میر فغان، قائم، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خان اختر (جو ھگلی کے رھنے والے تھے) وغیرہ بھی مختلف اوقات مین دھلی سے لکھنؤ آتے اور وھان کی صحبت شعر و سخن کو گرماتے رھے۔ مرزا جوان بخت ولی عہد شاہ عالم تھوڑے دن لکھنؤ رہ کر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ (مرزا جوان بخت کے چھوٹے بھائی) بعد کو آئے اور بڑے تزک و احتشام سے رھے۔ ان کی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ، عنادل خوش الحان سخن کے دلکش ترانون اور پرلطف نوا سنجیون سے معمور اور مست ہو رہا ھے۔[3]

١۔ سودا، ص ١٦، شیخ چاند

٢۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ساتوین جلد، ص ٢٩، (سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر، شمس الدین صدیقی ڈاکٹر)

٣۔ تاریخ ادب اردو، ص ٣١١، سکسینہ (مرتب : فاضل لکھنوی، مترجم : عسکری)

جاگیردار طبقے کی اھمیت اور علم و ادب کی سرپرستی کے سلسلے مین بے شمار مثالین تاریخ پاک و ھند مین ملتی ھین - نیز اس دور کے شعراء اور دیگر صاحبان فن کے حالات کے مطالعے سے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ھے - میر تقی میر اپنے خود نوشت حالات مین فرماتے ھین :

" فقیرخانہ نشین تھا اور چاھتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی کی وجہ سے معذور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے نواب وزیرالملک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میرے پاس چلا آئے --- خط کے آتے ھی لکھنئو روانہ ھو گیا۔ فرخ آباد کے راستے سے گزرا - وھان کے رئیس مظفر جنگ تھے - انھون نے ھرچند چاھا کہ کچھ روز وھان ٹھہر جاؤن --- دو ایک روز کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گیا--- بڑی عزت و توقیر سے پیش آئے --- چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب عالی جناب کی بارگاہ مین شرف ملاقات حاصل ھوا--- دو تین روز بعد یاد فرمایا - حاضر ھوا۔ جو قصیدہ مین نے مدح مین کہا تھا پڑھا--- کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازمون مین داخل فرمایا اور ھمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رھے " -[1]

۱- ذکر میر (بحوالہ انتخاب کلام میر : مقدمہ، ص ۱۱ ، از عبدالحق ڈاکٹر

مختصر یہ کہ اس دور کے جاگیرداروں اور شعر و ادب کے سرپرستوں کی فہرست بڑی طویل ہے ، جن کے دامن دولت سے مختلف اوقات میں مختلف شعراء وابستہ رہے ۔

(ب) انیسویں صدی (نصف اوّل) کے
سیاسی ماحول کا جائزہ

۱۔ متحارب سیاسی طاقتوں کی کشمکش کا خاتمہ :

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ہندوستان کے سیاسی افق پر انگریزوں کے اقتدار کا ستارہ بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ سال بہ سال ایک علاقے کے بعد دوسرا ان کے تصرّف میں آتا چلا گیا ۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب اور اس کے توابع بھی ان کے زیرنگیں آ گئے ۔[1] اہل ہند کے لیے انگریزوں کی بالادستی کسی طرح بھی نیک فال تو نہ تھی مگر وقتی طور پر اس طویل کشمکش ، بدنظمی اور افراتفری کے بعد جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہوئی تھی اور جس نے عوام کا آرام و سکون مکدّر کر دیا تھا ، بار خاطر نہ تھی ۔

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے جب سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم و نسق قائم ہوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا ۔ بلکہ بعض باتوں میں تو اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی تھی ۔ " مسٹر آر چیبالڈ سیٹن ،، دہلی کا ریذیڈنٹ،

۱۔ ہسٹری آف سکھس ، ص ۲۹۳ ، کننگھم

بادشاہ کے جذبات کا خیال رکھتا تھا اور قلعے اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی تھی ۔ بادشاہ کی جو خاصے کی جاگیرین تھین ان کی آمدنی انگریزی امن و امان کی وجہ سے بڑھ گئی تھی اور بادشاہ کی مالی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی تھی ۔ اس کے علاوہ سکوّں پر بادشاہ ھی کا نام ھوتا تھا اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت کے سلسلے مین بھی اس کی مہر توثیق ھی کو سب سے زیادہ اھمیت دی جاتی تھی ۔[۱]

اھل ھند کے نفاق اور طوائف الملوکی سے اصل نفع انگریزوں نے حاصل کیا ۔ ھندوستان کے رئیس اور راجہ ھر جگہ آپس مین کٹے مرتے تھے ۔ ان کی قوّت مین جس قدر زوال آیا اسی نسبت سے انگریزوں کو عروج حاصل ھوا ۔ ان کی فوجی تنظیم ترقی کرتی رھی اور چند سال مین شمال و جنوب کے مرھٹوں پر غالب آ گئی ۔[۲] یہان تک کہ مرھٹوں کی شرانگیزیوں کے ساتھ ساتھ سکھوں اور جاٹوں کی شورشین بھی ختم ھوگئین ۔ بادشاہ ، متحارب طاقتوں کی کشمکش سے اتنا دل برداشتہ ھو چکا تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنا " نجات دھندہ " تصوّر کیا اور ان کی آمد کو " نعمت غیر مترقّبہ " جانا ۔ لارڈ لیک کی بڑی آؤبھگت ھوئی ۔ اسے بادشاہ کی طرف سے خطاب عطا ھوا ۔ وھی خطاب جو اس سے قبل سندھیا کو دیا گیا تھا اور جس کا مطلب یہ تھا کہ نظم و نسق کی تمام تر ذمہ داری اسے سونپ دی گئی تھی ۔ اس کے نتیجہ مین ویلزلی نے بادشاہ کو یہ خط لکھا کہ انگریزوں کے زمانے مین اسے کوئی تکلیف نہ ھوگی اور وہ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا ۔ ظاھر ھے

---

۱ ۔ غالب نامہ (آثار غالب) ، ص ۳۳ ، محمد اکرام شیخ ڈاکٹر

۲ ۔ مومن اور مطالعۂ مومن ، ص ۱۸۱ ، عبادت بریلوی ڈاکٹر

اس خط کا مطلب یہی تھا کہ انگریزوں کی سیاسی طاقت نے مختلف شورشوں کو ختم کر دیا ہے اور اب وہ بادشاہ کی حفاظت کریں گے اور اسے زندہ رہنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ انہوں نے یقیناً ایسا ہی کیا۔ انہوں نے بادشاہ کی پنشن مقرر کی اور اسطرح بڑے اطمینان سے اپنی سیاسی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے میں مصروف رہے ۔[۱]

۲۔ آخری مغل تاجداروں کی بے کسی :

شاہ عالم ثانی کی بادشاہت کو میر تقی میر اپنے تذکرے " ذکر میر،، میں محض " تہمت ،، قرار دیتے ہیں ۔ دلّی کے شہنشاہ بادشاہ بن گئے ۔ جب بادشاہت چھن گئی تو لال قلعے میں قیدیوں کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ شاہ عالم بھی اسی قسم کا ایک قیدی تھا جسے کمپنی نے مرہٹوں کی قید سے چھڑا کر اپنا قیدی بنا لیا۔ کمپنی یہ چاہتی تھی کہ شاہ عالم کو لال قلعے سے جلاوطن کرکے مونگیر بھیج دیا جائے ، لیکن اس حرکت کے نتائج کے پیش نظر کمپنی ایسا نہ کر سکی ۔[۲]

اب تک کمپنی بہادر کی پالیسی بادشاہ کے تعلقات کے معاملے میں غیرمستقل سی رہی تھی ، لیکن لارڈ ہیسٹنگز کے آتے ہی حالات بہت جلد دگرگوں ہوگئے۔ وہ دہلی کی اس برائے نام بادشاہت کو بالکل ختم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنے خطوط میں اس نے " خادم شاہ،،

۱۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، جلددوم، ص ۲۳ ، ہاشمی فریدآبادی سیّد

۲۔ کمپنی کی حکومت ، ص ۹۱-۳۹۰، باری علیگ

لکھنا موقوف کر دیا تھا۔ نذر دینے کی رسم بھی اڑا دی ۔[1] مصاحبین بھی بادشاہ کو بھرے دربار میں منہ توڑ جواب دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی تھی ۔[2] غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ بادشاہ سے جنرل لیک کی پہلی ملاقات کا مرقّع ان لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے:

" جو شاندار محل شاہجہان نے بنوایا تھا وہاں سپہ سالار (لارڈ لیک) کو حضورشاہی میں پیش ہونے کا موقع ملا۔ اس نے دیکھا کہ بدنصیب اور واجب التعظیم بادشاہ کو بڑھاپے اور عزت و اقتدار کے زوال، شدید افلاس اور زوال بینائی کی مصیبتوں نے سخت بدحال کر رکھا ہے ۔ وہ ایک بوسیدہ سے شامیانے کے نیچے بیٹھا تھا۔ یہی اسکی بادشاہی کا آخری نشان رہ گیا تھا۔ بظاہر ہر شئے اس کی رنج افزا حالت کا نشان بنی ہوئی تھی " ۔[3]

١٨٠٦ء میں شاہ عالم ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا اور اسّی سال کی عمر میں ١٨٣٧ء میں چل بسا۔ شاہ عالم ثانی کی حکومت آخر میں دلّی تک محدود تھی، اس کی حکومت قلعہ معلّیٰ کی چاردیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اضافۂ پنشن کی درخواست دی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ قلعۂ معلّیٰ کے اندر جرائم پیشہ

١۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص ٢٣، نورالحسن ہاشمی

٢۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، ص ٣٨، ابوالخیر کشفی

٣۔ ١٨٥٧ء، ص ٢٣، غلام رسول مہر

جمع رہتے تھے کہ ان سے باز پرس نہ ہوگی۔ انگریزوں نے رسمی وقار میں بھی کمی کر دی۔ بادشاہ کو معلوم تھا کہ اب وہ بادشاہ نہیں ہے، کمپنی حاکم ہے۔ اسی طرح بے بسی کی زندگی گزارتا رہا اور انگریزوں سے رحم کی توقع میں عمر گزر گئی۔ سید احمد شہید کی تحریک اسی کے زمانے میں ابھری اور ختم ہوگئی۔[١] ١٨٢٠ء میں اکبر شاہ ثانی کو شہنشاہ انگلستان کی موت پر تعزیتی خط بھیجنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے دادرسی کے لیے راجہ رام موہن رائے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ سفارت بھی ناکام ہوگئی۔ اکبر شاہ ثانی کو پنشن میں تین لاکھ اضافے کی خاطر مجبور ہو کر ١٨٣٣ء کے بعد راضی نامے پر دستخط کرنا پڑے۔ بادشاہ سے شاہی خاندان کی فہرست مانگی گئی اور اس فہرست کو ردّ کر کے کمپنی نے اپنی فہرست خود مرتّب کی جو بادشاہ نے قبول نہ کی اور راضی نامے کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اسی اثناء میں اس کا انتقال ہوگیا۔[٢]

اب ١٨٣٧ء میں بہادر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ جب ولی عہد قضا کرگئے تو ڈلہوزی نے مرزا فخرو کو نامزد کیا۔ بیگم نواب زینت محل اپنے بیٹے جوان بخت کو ولی عہد دیکھنا چاہتی تھیں۔ ١٨٥٦ء میں مرزا فخرو بھی چل بسے۔ کیننگ نے محمد قریش کو اس شرط پر جانشین تسلیم کیا کہ آئندہ وہ صرف پرنس کہلائیں گے، قطب میں رہیں گے اور زر پنشن صرف پندرہ سو ماہانہ وصول کریں گے۔ زینت محل پھر رہ گئیں۔[٣]

١۔ مومن، ص ٢٣، کلب علی خان فائق رامپوری

٢۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، ص ٢١، ابوالخیر کشفی

٣۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص ٣١، نورالحسن ہاشمی

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اہل ہند نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی ۔ اس دوران میں بادشاہ نے خود بھی عجیب عجیب ستم سہے ۔ جوان بیٹوں اور پوتوں کو آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا اور اف تک نہ کر سکے ۔ خود جلاوطن کیے گئے اور ۱۸۵۹ء میں رنگون میں نظربندی کی حالت میں انتقال کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مغلیہ حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ۔[1]

اگرچہ حکومت کے انتظامی امور میں ان بادشاہوں کا کچھ دخل نہ تھا، لیکن ۱۸۵۸ء تک ہر سرکاری اعلان کے ساتھ ڈھنڈورچی پہلی صدا یہی لگاتا تھا کہ :

"خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔[2]

۳۔ نظم و نسق کا استحکام :

۱۸۰۳ء میں جب فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے نظم و نسق کی ذمّہ داری سنبھالی اور مرہٹہ گردی کا خاتمہ کر کے امن و امان قائم کیا تو دکھیاری دلّی نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ زندگی اور زندہ دلی کے دبے ہوئے سوتے ابل پڑے اور تہذیب و ثقافت کے اجڑے ہوئے چمن میں نئی بہار آ گئی ۔[3] تاریخ میں کسی دور کی روزمرّہ تبدیلیوں کا حال قلمبند نہیں کیا جاتا، ایسا تو روزنامچوں ہی میں ممکن ہے ۔ انیسویں صدی کے

۱۔ مومن اور مطالعۂ مومن، ص ۱۷۳، عبادت بریلوی ڈاکٹر
۲۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۶۳، ہاشمی فرید آبادی سیّد
۳۔ مولوی نذیر احمد (احوال و آثار)، ص ۷۱، افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر

ابتدائی دور کے بارے مین ھمین ایسا کوئی روزنامچہ نہین ملتا جس سے اس خوشگوار تبدیلی کی تفصیلات حاصل کی جا سکین، جو انگریزی عملداری کے بعد بتدریج رونما ھوئی ۔ قیاس کیا جا سکتا ھے کہ ابتدائی دس بیس سال اطمینان و سکون کے ھون گے ۔ عوام و خواص کے معاشی اور معاشرتی حالات بہتر سے بہتر ھوتے چلے گئے ھون گے ۔ اس کا سبب یہ ھے کہ انگریز اس وقت برصغیر کی سب سے زیادہ بااثر طاقت بن کر ابھرے تھے اور آھستہ آھستہ انھون نے ملکی نظم و نسق مین استحکام پیدا کر دیا تھا ۔ یہان تک کہ ۱۸۵۷ء کے غدر (جنگ آزادی) سے پیشتر کے زمانے کو دھلی کے ھندو اور مسلمان باشندے روزمرّہ کی گفتگو مین امن و امان سے تعبیر کرتے تھے ۔[۱]

دھلی شہر کے نظم و نسق ، تمدن و معاشرت ، تعلیم و مذھب ، غرض زندگی کے ھر شعبے مین دھوپ چھاؤن کی دورنگی کیفیت تھی ۔ ایک طرف لال قلعے مین خاندان مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رھا تھا لیکن اس کی روشنی سے شہری زندگی کی تمام انجمنین روشن تھین ، دوسری طرف شہر کا انتظام " کمپنی بہادر ،، کے نمائندے ریذیڈنٹ بہادر کے ذمّے تھا ۔ امن و سکون کے اس دور مین قدیم علوم و فنون کے ساتھ نئے خیالات کی لہرین بھی ذھنون کو متأثر کر رھی تھین ۔ ایک طرف انگریزون سے اجنبیت اور نفرت کا احساس محو ھوتا جا رھا تھا تو دوسری طرف انگریز سیاسی خلفشار کے دور مین عوام کے " نجات دھندہ " اور " محافظ ،، بن کر آئے تھے ۔ شہر مین ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو نئی حکومت کا ملازم اور وفادار تھا ۔ حتیٰ کہ اکابر و افاضل بھی افتاد و صدارت کے منصب قبول کر رھے

---

۱ ۔ مولوی ذکاء اللّٰہ دھلوی، ص ۵۱، سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز (مترجم: ضیاء الدین احمد برنی)

تھے ۔ نئے علوم کی ترویج و اشاعت سے تعلیم یافتہ نوجوانون مین اور پریس کے قیام سے اخبار بین حلقے مین مغربی ممالک کے حالات سے دلچسپی اور علم و دانش فرنگ کی قدرشناسی پیدا ہوتی جا رہی تھی ۔ مغرب کی خوشحالی و ترقی اور شرق کی پامالی و پسماندگی کے اسباب پر غور ہونے لگا تھا ۔ نوجوانون کے دلون مین مایوسی کی جگہ امنگ اور اصلاح و تعمیر کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا ۔[1]

انگریزی راج مستحکم ہو جانے سے جو امن و سکون کا دور دورہ ہوا، اگرچہ یہ سکون گوشۂ قفس کے سکون سے مماثل تھا، تو اس سے پیشتر کی ربع صدی کی مستقلاً غیریقینی، غیر محفوظ حالات، پراگندگی اور انتشار کے مقابلے مین اہل شہر نے عام طور پر اسے غنیمت جانا ۔ خواص و عوام کی ایک بڑی اکثریت نے انگریزی حکمرانون کی فرمانبرداری کو بطور ایک امر واقعی کے تسلیم کر لیا تھا ۔ اور اپنی معمول کی زندگی اور مشاغل مین مصروف ہو گئے تھے ۔ برطانوی حکومت کے استحکام نے انھین جو امن و سکون کی زندگی بخشی تو انھون نے اپنے حسّی، جمالیاتی، فکری اور تمدّنی تقاضون کو پورا کرنے کی کوششین شروع کر دین اور مجلسی زندگی کی ایک نئی لہر سارے معاشرے مین دوڑ گئی ۔

۴ ۔ پرامن ماحول مین ادبی سرگرمیون کا نیا دور:

۱۸۰۳ء مین جب دلّی کی بگڑی ہوئی حالت روبہ اصلاح ہوئی اور چند ہی

---

۱ ۔ مولوی نذیر احمد (احوال آثار)، ص ۷۳، افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر

سال مین رونق اور چهل پہل کے کچھ آثار نظر آنے لگے تو اردو شاعری کوبھی فروغ حاصل ہوا۔ اردو شاعری کو اس دور مین غالب ، مومن، ذوق اور شیفتہ ایسے عظیم شاعر ملے ۔ میر اور سودا کے بعد دلّی مین یہ دوسری بڑی محفل تھی ۔ موضوع کے اعتبار سے اس دور کی شاعری کا رتبہ بہت بلند ہے ۔ یہ دور انسان کی فکری قوت کو تحریک مین لانے کے لیے بڑا سازگار تھا۔ افراتفری اور انتشار کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ملک مین امن و امان بھی قائم ہو گیا تھا اور نظم و نسق بھی بحال ہو چکا تھا [1]۔ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا ۔ دھلی مین چند ایسے باکمال جمع ہو گئے جن کی صحبتین اور جلسے عہد اکبر و شاھجہان کی یاد دلانے لگے ۔ اس زمانے کے شعراء مین شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ وغیرہ علماء مین شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمعیل ، سید احمد بریلوی، مولانا فضل حق خیرآبادی، اطبّا مین حکیم محمود خان، حکیم احسن اللہ خان، حکیم رضا خان اور نقادون مین نواب مصطفٰے خان شیفتہ موجود تھے ۔

اس دور مین اردو نثر نے بھی فروغ حاصل کیا۔ اردو نثر کی نہایت ابتدائی کتابون مین قرآن مجید کا ترجمہ جسے حضرت شاہ ولی اللّٰہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ١٨٠٣ء مین مرتّب کیا تھا، شامل ہے ۔ سرکار انگریزی نے دھلی کالج قائم کیا۔ بہت سے لوگ اپنے بچون کو وھان بھیجتے ہوئے ھچکچاتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز نے بڑے زورون سے وھان تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درسگاھون مین تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔ اسی زمانے مین "کمپنی" کی زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور اس کے ذریعے آسان اردو نثر نگاری کو ترویج و اشاعت کا موقع ملا [1]۔

١۔ غالب نامہ (آثار غالب) ، ص ٣١-٣٩ ، محمد اکرام شیخ ڈاکٹر

اس نئے دور میں ثقافتی مشاغل میں شاعری کو عوام و خواص کے ہر حلقے میں مقبولیت حاصل تھی اور بہادر شاہ ظفر تک پہنچتے پہنچتے شعر و ادب کی اجڑی محفلیں پھر آباد ہو گئیں ۔ غالب ، مومن ، ذوق ، ظفر کی نغمہ سرائیوں سے یہاں کے زاغ و زغن بھی خوش نوا ہو گئے تھے ۔ اگرچہ تعلیم عام نہ تھی لیکن تہذیب و ذوق عام تھا ۔ گھر گھر شعر و سخن کا چرچا تھا ۔[۱]

۵- علماء کی تحریک جہاد کا آغاز و انجام :

گزشتہ سطور میں برصغیر میں اٹھارھویں اور نصف انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے انحطاط و زوال کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے میں غیر اسلامی رسمیں نفوذ کرتی جا رہی تھیں اور اسلامی روح بری طرح مجروح ہو رہی تھی ۔ ان حالات میں اسلامی معاشرے کی اصلاح کا کام حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے اپنے ذمّے لیا ۔ شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم دہلی کے مشہور و معروف عالم تھے جو دینی مدرسے " مدرسۂ رحیمیہ ،، کا انتظام سنبھالا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے ۔

مسلم معاشرے کی خرابیوں اور انحطاط کو دیکھ کر آپ دل ہی دل میں کڑھتے تھے ۔ شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے طبقے کو معاشرے کا حق ادا

۱- مولوی نذیر احمد (احوال و آثار) ، ص ۷۲ ، افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر

کرنا چاھیے اور انھین ملک کے امن و امان کو تباہ کرنے والے گروھون کے خلاف جہاد کرنا چاھیے ۔ شاہ ولی اللّٰہ کے زمانے مین ملک مرھٹہ گردی سے پامال ھو رھا تھا ۔ آپ نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ درّانی کو ھندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی ۔ اس کا نتیجہ ۱۷۶۱ء مین پانی پت کی تیسری جنگ کی صورت مین ظاھر ھوا جس مین مرھٹون کا زور ٹوٹ گیا ۔ اس کے تقریباً دو سال بعد شاہ ولی اللّٰہ کا انتقال ھوا ۔

شاہ ولی اللّٰہ کی اولاد مین شاہ عبدالعزیز بہت مشہور ھوئے ۔ انھون نے " مدرسۂ رحیمیہ ،، کے طلباء کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے تربیت دی کہ وہ برصغیر کے گوشے گوشے مین شاہ ولی اللّٰہ کا پیغام پہنچائین ۔ شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیُ جو سید احمد شہید کے سرگرم کارکن تھے شاہ ولی اللّٰہ ھی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔

مسلمانون مین بھی مذھبی خیالات جمود کی حالت مین تھے ۔ اس جماعت مین بحیثیت مجموعی ابھی تک انگریزی تعلیم کو بہت کم دخل تھا اور فارسی کے سرکاری زبان نہ رہ جانے سے اس کی تعلیم و تمدن کا معیار پست ھو گیا تھا ۔ عربی کی تعلیم کے لیے مسلمانون کی جو پرانی درسگاھین موجود تھین ان مین سے اکثر کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ ایسی حالت کو پہنچ گئی تھین گویا دم توڑ رھی ھون ۔ سیاسی طاقت چھن جانے کی وجہ سے بھی مسلمانون مین جذبات باقی نہ رھے تھے ۔ مزید برآن " کمپنی ،، نے رنجیت سنگھ سے اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اسطرح جس زمانے مین افغانی خانہ جنگی کے باعث تباہ ھو رھے تھے اس وقت پنجاب مین سکھون کی جارحانہ طاقت مین اضافہ ھو گیا ۔ اس کی وجہ سے اسلام مین ایک سیاسی تحریک اور اس کے ساتھ ھی ایک مذھبی تحریک پیدا ھوگئی ۔ سیاسی

تحریک کے رهنما سید احمد بریلوی تھے ۔[۱]

سید احمد شہید کی تحریک کوئی نئی یا الگ تحریک نہ تھی بلکہ شاہ ولی اللّٰہی تحریک ھی کا ایک حصّہ تھی ۔ سید احمد شہید ۱۷۸۶ء مین بریلی مین پیدا ھوئے ۔ کچھ عرصہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسے مین تعلیم حاصل کی اور وھان دو سال گزارنے کے بعد ریاست ٹونک مین ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۸۱۶ء مین دوبارہ دھلی آئے جہان شاہ عبدالحیؒ اور شاہ اسمعیل نے آپ کے ھاتھ پر بیعت کی۔ سید صاحب کو مشرکانہ رسمون سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہی رسمین مسلمانون کے زوال کا سبب بنین ۔

۱۸۲۱ء مین سید صاحب اپنے آٹھ سو ساتھیون کے ساتھ حج کے لیے گئے اور تین سال کے بعد واپس آئے ۔ واپسی پر انھون نے پنجاب مین سکھون کی حکومت کے خلاف جہاد کا پروگرام بنایا۔ سکھون کے عہد مین مسلمان مذھبی آزادی سے محروم تھے ۔ مسجدون مین اکثر گھوڑے باندھے جاتے تھے ۔ مسجدون مین اذان پر پابندی تھی۔ مسلمان باجماعت نماز ادا نہین کر سکتے تھے ۔ آپ نے سکھون کے خلاف جنگ کی تیاریان شروع کردین۔ انگریزون نے ان جنگی تیاریون کو نہ روکا۔

دشمن کے ساتھ پہلی جھڑپ ۱۸۲۷ء کے آخر مین اکوڑہ کے مقام پر ھوئی ۔ سکھون کو پسپا ھونا پڑا۔ مجاھدین کا بھی کچھ نقصان ھوا۔ حضرو کی فتح کے بعد سید احمد صاحب کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور حکومت کا خرچ چلانے کے لیے شرعی ٹیکس نافذ

۱۔ انگریزی عہد مین ھندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۱۹۹، عبداللہ یوسف علی

کر دیئے گئے۔ اس پر کچھ قبائل سردار آپ کے خلاف ہوگئے۔ اس خلفشار سے تنگ آ کر آپ پنج تار چلے گئے اور اپنی فوج کو از سر نو مرتّب و منظّم کرنے لگے ۔

ادھر سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے بھی چالیں چلنا شروع کر دیں ۔ مسلمان قبائل کے سردار، یار محمد سے آپ کی جنگ ہوئی۔ وہ مارا گیا اور ۱۸۳۰ء میں آپ نے پشاور پر قبضہ کرلیا ۔ وہاں قانون شریعت نافذ کیا گیا ۔ اب تو کچھ اور قبائلی سردار بھی آپ کے مخالف ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً اپنا مرکز ضلع ہزارہ میں منتقل کر دیا ۔ یہاں بالاکوٹ کے مقام پر مجاہدین ، سکھ فوج کے نرغے میں آ گئے ۔ بالاکوٹ کی جنگ ۱۸۳۱ء میں ہوئی۔ اس میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسمعیل دونوں نے شہادت پائی۔ ان کے علاوہ دیگر مجاہدین بھی شہید ہوئے ۔

اس واقعے کے بعد بہت سے عقیدت مند واپس ہندوستان چلے گئے اور کچھ ستھانہ میں آباد ہوگئے۔ ستھانہ کے مجاہدین نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا ۔ سکھ حکومت کے خاتمے کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رہا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اس تحریک کو ختم کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئے ۔

بنگال میں اس تحریک کا اثر گہرا اور دیرپا ہوا ۔ اس میں سید صاحب کے جان نثار، پیروکار تیتو میر، مولوی امام الدین اور صوفی نور محمد سرگرم عمل رہے ۔ سید احمد بریلوی کی تحریک ، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی پر زمانی تقدّم رکھتی ہے اور ملّی اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ مدت دراز کے بعد مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللّٰہ کا آوازہ بلند ہوا اور شرعی حکومت کے قیام کی کوشش کی گئی ۔[1]

۱۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۲۸۰ ، ہاشمی فرید آبادی سیّد

(ج) شمالی ہند میں جدید تعلیم و تہذیب کے ابتدائی آثار

۱- بنگال میں معاشرتی و ادبی اصلاح کی تحریکیں:

بنگال میں تیرھویں صدی عیسوی کے بعد ایسی تحریکیں ابھریں جو اسلام سے متاثر تھیں اور ہندومت کو بت پرستی، ذات پات کی تفریق، آلائشوں اور بدعتوں سے پاک کرنا چاہتی تھیں۔ اس قبیل میں "دھرما" کی تحریک بہت مشہور ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے بھی مختلف تحریکوں کا آغاز ہوا۔ اس قسم کی تحریکوں کے سرگرم کارکنوں میں سلاپانی اور وری ھاس کے نام آتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے۔ چیتنیہ کی "وشنو تحریک" کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس علاقے میں ہندومت کے احیاء کی کوششیں کی جائیں۔ یہ تحریک اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب رہی کہ بنگال میں اشاعت اسلام رک گئی۔ بلکہ بعض مسلمانوں نے وشنو مذہب اختیار کرلیا۔ چیتنیہ ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۳۱ء میں فوت ہوگیا۔

بنگال میں ایک اور عمل بھی وجود میں آیا اور یہ صرف بنگال ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے خطوں میں بھی اپنے اپنے دور میں بروئے کار آیا تھا۔ یہ عمل تھا ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط کا۔ اسی بنیاد پر مختلف علاقوں میں کئی ایک تحریکیں ابھریں جو نہ ہندومت کو من و عن تسلیم کرتی تھیں نہ اسلام کو، بلکہ یہ انسان کی انسانیت، انسان دوستی اور جذبات کو متحرک کرتی تھیں۔ خدا کی وحدانیت اور انسانوں کی ایکتا پر

زور دیتی تھین ۔[1]

اٹھارویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی مین کاشتکارون اور زمیندارون کی لاتعداد مزاحمتی تحریکین سامنے آئین ۔ انھون نے مسلح بغاوت کی صورت بھی اختیار کرلی۔ ان مین ھندو اور مسلمان دونون ھی شریک تھے۔ ان بغاوتون کی رھنمائی خود ان زمیندارون نے کی جن کو " کمپنی ،، کے نئے گماشتون نے نیلامی مین اونچی بولی کے ذریعے اراضی سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن ان مین شریک کسان اپنے دکھ اور اضطراب کی بناء پر شامل ھوئے ۔

انیسوین صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے مین چند تحریکین ایسی اٹھین جن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان معاشرے کو ھندوآنہ رسم و رواج سے پاک کیا جائے ۔ پہلی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللّٰہ تھے۔ یہ تحریک " فرائضی تحریک،، کے نام سے شروع ھوئی کیونکہ اس پوری تحریک کا زور فرائض کی ادائیگی پر تھا۔ گناھون اور پچھلی زندگی سے توبہ ان کی نئی زندگی کی بنیاد ٹھہری۔ اس تحریک کے نام لیواؤن کو " توبار،، کہا جانے لگا، یعنی توبہ کرنے والے۔ جب فرائضیون نے زمیندار کو ٹیکس دینے سے انکار کیا تو پورے بنگال مین کاشتکار اس تحریک سے متاثر ھوئے ۔ " فرائضی تحریک،، ایک آگ تھی جو ھر گاؤن مین بھڑک رھی تھی۔ لوگ جوق در جوق اس تحریک مین شامل ھونے لگے اور یہ ایک مذھبی تحریک سے بڑھ کر کسان تحریک بن گئی۔ ۱۸۴۰ء مین حاجی شریعت اللّٰہ کی وفات کے بعد اس تحریک کی قیادت ان کے بیٹے حاجی محسن میان عرف دودھو میان نے سنبھالی۔ انھون نے

۱۔ بنگالی مسلمانون کی صدسالہ جہدآزادی (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) ، ص ۱۶۵ ، عبداللّٰہ ملک

اس تحریک کو باقاعدہ منظم، سرگرم اور فعال بنانے مین بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو دودھو میان کو جیل بھیج دیا گیا، جہان سے ۱۸۵۹ء مین رہا ہوئے اور بعد مین ۱۸۶۲ء مین وفات پا گئے ۔

" فرائضی تحریک،، کے علاوہ دوسری اہم تحریک جس نے انیسوین صدی عیسوی کے ابتدائی وسط مین بنگال کے مسلمانون کو متحرک کیا، ان مین جوش و ولولہ پیدا کیا اور زمیندار کے ظلم کے خلاف صف آرا کیا وہ تیطو میان کی تحریک تھی۔ اس کی ابتدا بھی مذھبی خطوط پر ہوئی تھی اور بالآخر اس نے بھی کسان اور کاشتکار تحریک کا روپ دھار لیا تھا۔ تیطو میان کا اصل نام نثار علی تھا۔ تیطو میان اور ان کے ساتھیون نے ھندو زمیندارون اور انگریز تاجرون کے خلاف لڑائیان لڑین اور سارے علاقے مین خوف و ہراس پھیلا دیا۔ ایک لڑائی مین تیطو میان اور ان کے کچھ ساتھی شہید ہو گئے، بہت سے گرفتار ہوئے، جنھین بعد مین مختلف سزائین دی گئین۔ بنگال کے مسلمان آج بھی تیطو میان کو " زندہ شہید،، سمجھتے ھین ۔

اس دوران مین بنگال مین بہت سی علمی و ادبی تحریکین بھی شروع ہوئین۔ سر ولیم جونز (متوفی ۱۷۹۴ء بمقام کلکتہ) نے " ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال،، کی اس غرض سے بنیاد ڈالی کہ ایشیا کی تاریخ، علوم طبیعی، آثار قدیمہ، فنون لطیفہ، دیگر علوم و فنون اور ادب کے متعلق تحقیقات کی جائین ۔ اس سوسائٹی کو ابتدا ھی سے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ۔

اسی طرح سیرام پور کے عیسائی مشنریون کی کوششون سے ایک نتیجہ یہ نکلا

کہ جدید بنگالی لٹریچر کی بنیاد پڑ گئی ، چونکہ ایشور چند ودیا ساگر، بنکم چندر چٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور ایسے آدمیون کی بدولت برصغیر بنگالی لٹریچر کا رہین منت ہے ، یہ تحریک ایک آل انڈیا تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دوران مین روشن خیال بنگالی رہنما بھی انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کو ترقی دینے مین خاموش نہ تھے۔ انھون نے " اپنی مدد آپ ،، کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۱۷ء مین " ھندو کالج ،، قائم کیا۔ ۱۸۲۳ء مین " اورینٹل سیمینری ،، درسگاہ شرقیہ) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا نصب العین بمقابلہ ھندو کالج کے قدیم مذھبی خیالات پر مبنی تھا ، لیکن انگریزی کی تعلیم اس کے مقاصد مین بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت سے کالج مختلف اوقات مین مختلف مقامات پر کھولے گئے۔ ۳۰-۱۸۲۸ء مین بنگال مین ایک " فری مین انجمن ،، (انگلش کانسٹی ٹیوشن) قائم ہو گئی تھی۔ برطانوی ھند مین مذھبی خیالات کے ایک نئے فریق کے اوّلین اور ممتاز رکن راجہ رام موھن رائے تھے (۱۷۷۳ء تا ۱۸۳۳ء)۔ جو بیداری اور تحریک انھون نے آزادانہ مذھبی خیالات مین پیدا کر دی تھی وہ " برھمو سماج ،، مین موجود ہے۔ انھون نے بنگالی نوجوانون کے لیے انگریزی تعلیم کی حمایت کی۔ ۱۸۲۸ء مین انھون نے" برھمو سماج ،، کی بنیاد ڈالی۔ انگریزی تعلیم کے اجراء سے بنگالی نوجوانون مین مذھبی بحث و مباحثے کا رواج ہوگیا۔ بعد مین جب لوگ سیاست مین زیادہ دلچسپی لینے لگے تو مذھبی تحقیق اور اصلاح کا جوش سرد پڑ گیا ، لیکن نئے خیالات کی اشاعت کے لیے چند روزہ انجمنین اور اخبارات وجود مین آتے رہے ۔

سید احمد بریلوی کی تحریک کا اثر چونکہ بنگال مین بھی لوگون پر ہوا تھا ،

اس لئے مولوی کرامت علی جونپوری (وفات ١٨٧٢ء) نے زیادہ تر کام اردو مین کیا۔ وہ سید احمد بریلوی کے مرید بھی تھے۔ ان کی سرگرمیون کا میدان مشرقی بنگال تھا جہان کے مسلمانون پر جہالت کا غلبہ چھایا ہوا تھا۔ ان کی تبلیغ کی وجہ سے وہان کے مسلمانون مین بیداری پیدا ہوئی۔[1]

بنگال مین اخبارنویسی کی حقیقی تحریک انیسوین صدی عیسوی کے وسط مین پیدا ہوئی۔ اس سے ایک نسل پہلے انگریزی اور بنگالی کے مذہبی یا ادبی پرچے موجود تھے لیکن عام لوگون کی زندگی پر ان کا کوئی اثر نہ تھا۔ راجہ رام موہن رائے اور مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور دونون نے مذہبی اصلاح سے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ایک اخبار جاری کیا۔

اسی طرح ستی کی رسم کے خلاف تحریک چلی اور بالآخر ستی کو قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔ ہندو بیواؤن کی دوسری شادی ایکٹ ١٥ مصدرہ ١٨٥٦ء کی رو سے قانوناً جائز قرار دی گئی۔ ایکٹ ٢١ مصدرہ ١٨٥٠ء کی رو سے قرار دیا گیا کہ تبدیلی مذہب کی بنا پر کوئی شخص حق وراثت سے محروم نہین کیا جا سکتا۔ پھر ١٨١١ء مین اسی قسم کے ایک قانون کی رو سے احاطۂ بنگال مین غیر ملکون سے غلامون کی درآمد اور فروخت کی ممانعت کی گئی۔

کلکتہ کے نواب عبداللطیف (١٨٢٨-٩٣ء) نے " محمڈن لٹریری اینڈ سائینٹیفک سوسائٹی،، کی بنیاد ١٨٦٣ء مین ڈالی۔ اس کی خدمت وہ کئی سال تک کرتے رہے ۔ یہ سوسائٹی

١۔ انگریزی عہد مین ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ، ص ٢٣١، عبداللہ یوسف علی

خاص ادبی اور علمی فوائد کے علاوہ مسلمانوں کے دیگر تمدّنی فائدوں کی بھی نگہداشت کرتی تھی۔ اسی طرح سید امیر علی (۱۹۲۸-۱۸۴۹ء) نے اپنی جوانی کے ایّام مین "سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن (۹۰-۱۸۷۷ء) اور "کمیٹی امام باڑہ،، ہگلی کے ذریعے مسلمانان بنگال کی خدمت کی۔[۱]

۲۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام:

ویلزلی کے عہد مین "ایسٹ انڈیا کمپنی،، کے ملازمون اور عہدیدارون پر بہت سی ذمّہ داریان آ پڑی تھین۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ کمپنی کے ملازم اور عہدیدار ہندوستان کی زبانون سے واقف ہون۔ کمپنی کے ملازم سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر مین انگلستان سے ہندوستان کی طرف چل دیتے۔ ان نوجوانون کی تعلیم ان کے اپنے ملک مین بھی واجبی ہی سی ہوتی تھی۔ ان کے لیے ہندوستان مین بھی کوئی تربیتی ادارہ نہ تھا جو انھین یہان کی ذمہ داریان نباہنے کا اہل بنا سکتا۔ لہذا ویلزلی نے انڈین سول سروس مین بھرتی ہونے والے انگریزون کے لیے کلکتہ مین ایک کالج قائم کر دیا۔ اس کالج کے قواعد و ضوابط اس نے خود مرتّب کیے۔ وہ کبھی کبھی تقسیم انعامات کے لیے کالج جاتا اور طالب علمون کے سامنے تقریر بھی کرتا۔[۲]

ویلزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل ہندوستان تھا، ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو کالج

۱۔ انگریزی عہد مین ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ، ص ۲۹۵، عبداللہ یوسف علی
۲۔ کمپنی کی حکومت، ص ۲۲۵، باری علیگ

کی داغ بیل ڈالی۔ تعلیم و تدریس تقریباً چھ ماہ بعد شروع ہوئی لیکن کالج کے قیام کے سلسلے مین جو دستاویز تیار کی گئین اس مین ویلزلی کے حکم کے مطابق ۱۰/جولائی کے بجائے ۴/مئی تاریخ ڈالی گئی۔ یہ تاریخ اس لیے اہم تھی کہ اس دن میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹم مین برطانوی سامراج کی شاندار اور فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ تھی۔ گویا یہ کالج سقوط میسور اور فتح برطانیہ کی یادگار تھا [1]۔

۲۹/ستمبر ۱۸۰۰ء کے کلکتہ گزٹ " غیر معمولی شمارے،، مین کالج کے مختلف شعبون کے پروفیسرون کا اعلان ہوا۔ کلکتہ گزٹ کی اسی " غیر معمولی اشاعت ،، سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کالج کے انتظامی امور کو سرانجام دینے کے لیے گورنر جنرل نے ایک کونسل بھی بنائی تھی [2]۔

بہت سے ھندوستانی مصنفین، مترجمین اور منشی مختلف اوقات مین کالج کے ھندوستانی شعبے سے وابستہ رہے۔ ان سب کو " ماتحت منشی" کہا جاتا تھا اور وہ سب اپنے شعبہ کے چیف منشی کے ماتحت ہوتے تھے۔ ابتداء مین ھندوستانی شعبۂ کے عملے کی تعداد تیرہ چودہ سے زیادہ نہ تھی لیکن آگے چل کر یہ گنتی پچپن تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ طالب علمون کی رہنمائی کرنے کے علاوہ تصنیف ، تالیف اور تصحیح وغیرہ کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ ان کی تنخواہ بالعموم ۳۰ روپے ماہوار ہوتی تھی۔ ماتحت منشیون کو تقرّر سے پہلے باضابطہ امتحان بھی دینا ہوتا تھا۔ منشیون کی ایک اور قسم بھی تھی۔

۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ، ص ۱۳۷ ، محمد عتیق صدیقی

۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۸-۱۴۰ ،

ان کو سندی منشی (سرٹیفیکیٹ منشی) کہا جاتا تھا۔ ان کی تنخواہ ۳۰ روپے ماہوار تھی۔ ان کو بھی باضابطہ امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔[1]

اس کالج کے قیام کے سلسلے مین ویلزلی اور کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز مین اختلاف رائے پیدا ہوگیا تھا، لیکن بعد مین ۳۱ دسمبر ۱۸۰۳ء تک جاری رکھنے کا فیصلہ ہوگیا۔ بعد مین اس کالج کو کلرکون کی تربیت اور مشرقی زبانون کی تعلیم کے لیے محدود کر دیا گیا۔ اس کالج مین ڈاکٹر گلکرسٹ نے آسان ہندوستانی مین کتابین لکھنے اور لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ کمپنی کے ملازمین قصّون اور کہانیون کے ذریعے یہ زبان سیکھ سکین ۔[2]

۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا۔ اپنے چار سالہ قیام کے دوران مین اس نے خود بارہ کتابین لکھین اور دیگر منشیون سے بھی کتابین لکھوا کر ۶۳ کے لگ بھگ شائع کین۔[3] گلکرسٹ نے کالج کے لیے چھاپہ خانہ بھی فراہم کر لیا تھا جو ہندوستانی پریس کے نام سے مشہور ہوا۔[4] کالج کے ہندوستانی شعبۂ کے منشیون نے جو کتابین ترجمہ یا تالیف کین ان کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ اس فہرست مین قرآن مجید کا پہلا ترجمہ (بامحاورہ) بھی شامل ہے جو گلکرسٹ کے کالج سے مستعفی ہونے کے بعد چھپ نہ سکا۔[5] لیکن محمد عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق یہ گلکرسٹ کی موجودگی مین مکمل ہو چکا تھا اور اس کی طباعت بھی شروع ہو چکی تھی مگر بعد مین " گورنر جنرل باجلاس کونسل " کے حکم

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۵۶، محمد عتیق صدیقی

۲۔ کمپنی کی حکومت، ص ۲۳۶، باری علیگ

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند آٹھوین جلد، ص ۶۷، (فورٹ ولیم کالج کے مصنفین)

۴۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۵۱، محمد عتیق صدیقی

۵۔ ارباب نثر اردو، ص ۱۵۶، سید محمد

سے اس کی اشاعت روک دی گئی [1] ۔

فورٹ ولیم کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں ۔ جتنی کتابیں ۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ یا تالیف ہوئیں، باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اردو کی شکل سے لکھی گئی ہوں گی اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو چھپنا نصیب نہیں ہوا [2] ۔ اس کالج نے انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی ایک ربع میں بہت کام کیا ۔ اردو نثر میں موجودہ سلیس نگاری جس کا آغاز غالب اور سرسید سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کالج کا مرہون منّت ہے [3] ۔ اس کالج کے منتظمین نے سادہ و سلیس اردو نثر میں کتابیں، زبان و ادب کی محبت یا اس کی خدمت کے خیال سے نہیں لکھوائی تھیں بلکہ اپنی ضرورت پیش نظر تھی ۔ لیکن یہی بات اردو کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی ۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی فرماتے ہیں :

" انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے باالتزام قصّہ گوئی کی زبان کو عام بول چال سے قریب لانے کی کوشش کی ۔ میر امن اس سادہ نثر کے سب سے کامیاب نمائندے ہیں جن کی باغ و بہار بقول پروفیسر حمید احمد خان کے پاکیزہ اور شفّاف اردو کا ابلتا ہوا چشمہ ہے " [4] ۔

---

۱ ۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۸۰، محمد عتیق صدیقی
۲ ۔ داستان تاریخ اردو، ص ۲۱۱، حامد حسن قادری
۳ ۔ مومن دہلوی، ص ۲۸، ناظر حسن زیدی
۴ ۔ مولوی نذیر احمد دہلوی (احوال و آثار) ، ص ۳۲۰

۳- اردو صحافت کا آغاز :

برصغیر پاکستان و ہند مین فارسی اور اردو صحافت کا آغاز شاہی وقائع نگاری سے ہوا۔ سلطنت کے طول و عرض مین حکومت کی طرف سے وقائع نگار اور اخبار نویس مقرر ہوتے تھے جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تجارتی اور زرعی خبرون پر مشتمل خبرنامے مرتب کر کے مسلسل شہنشاہ کے نام بھیجا کرتے تھے۔ ان خبرنامون کو اخبار کہا جاتا تھا۔ جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا اور کئی آزاد ریاستین وجود مین آ گئین تو ان مین بھی وقائع نگاری کے ادارے قائم ہوئے۔ برطانوی راج کے آنے سے یہ ادارے درہم برہم ہوگئے اور شاہی اخبارات کی جگہ نجی قلمی اخبارات نے لے لی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد نجی قلمی ادارون کی بساط بھی ہمیشہ کے لیے الٹ گئی۔[۱]

انگریزون نے پہلا چھاپہ خانہ ۱۶۷۴ء مین بمبئی کے مقام پر قائم کیا۔ اٹھارھوین صدی کے آخر مین مدراس اور کلکتے مین بھی چھاپے خانے قائم کیے گئے۔ چند سال کے اندر اندر انگریزی زبان کے دوش بدوش بنگالی اور فارسی ٹائپ کی چھپائی بھی شروع ہو گئی اور چند سال مین چھاپے خانون کی تعداد مین خاصا اضافہ ہوگیا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے درجنون اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے۔ ان مین روزنامہ کوئی نہین تھا۔ ہان ہفتے مین تین بار نکلنے والے اخبار ضرور تھے۔ ان سب کی زبان انگریزی تھی۔[۲]

ہندوستان کی زبانون کے اخبارات کے متعلق عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھوین جلد، ص ۳۳۶ (صحافت - عبدالسلام خورشید ڈاکٹر)

۲- داستان صحافت، ص ۶۷، عبدالسلام خورشید ڈاکٹر

کہ ایسا پہلا اخبار بنگالی زبان میں ہفتہ وار " سماچار درپن ،، شائع ہوا جو سیرام پور کے مشنریوں نے ۱۸۱۸ء میں جاری کیا ۔[۱] برصغیر پاکستان و ہند میں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان فارسی تھی۔ انگریز فارسی زبان کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ یہ مسلمانوں کے اقتدار کے زمانے کی یاد تازہ رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کو رواج دیا ۔ انگریزوں کی سرپرستی میں کلکتے سے ۱۸۲۲ء میں پہلا ہفت روزہ اخبار " جام جہان نما ،، کے نام سے نکالا گیا ۔ جب چند ہفتوں کے بعد معلوم ہوا کہ اخبار کی خریداری بہت کم ہے تو اس کی زبان بدل کر فارسی کر دی گئی۔ دو سال بعد فارسی اخبار کے ساتھ ساتھ چار صفحے کا ایک اردو ضمیمہ جاری ہوا جو چار سال تک قائم رہا۔

۱۸۳۶ء میں " دہلی اردو اخبار ،، مولانا محمد حسین کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا جو اکیس سال تک جاری رہا ۔ اس کی ادارت پہلے مولوی محمد باقر کرتے رہے لیکن آخری سالوں میں ان کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد کے سپرد رہی ۔ اس اخبار میں صفحۂ اوّل پر بہادر شاہ کی سرگرمیوں کی رپورٹ درج ہوتی تھی اور اس کے بعد برطانوی ریذیڈنٹ اور دوسرے انگریز افسروں کی نقل و حرکت کا بیان ہوتا تھا ۔ دہلی کی خبریں خاص طور پر چھاپی جاتی تھیں۔ دوسرے شہروں کی خبریں انگریزی اخباروں سے لی جاتی تھیں [۲]۔ اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری تو مولوی محمد باقر کی تھی لیکن مدیر کی حیثیت سے ان کا نام شاذ ہی آتا تھا[۳]۔ اس اخبار میں علمی و ادبی

۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ ، ص ۱۳۰ ، عبداللہ یوسف علی

۲۔ داستان صحافت ، ص ۷۰ ، عبدالسلام خورشید ڈاکٹر

۳۔ ہندوستانی اخبار نویسی ، ص ۲۹۹ ، محمد عتیق صدیقی

سرگرمیون کا خاص ذکر ہوتا تھا ۔ بہادر شاہ ظفر، نواب زینت محل ، ذوق اور دوسرے شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا ۔ مولوی محمد باقر کا دوسرا اخبار " مظہر الحق،، تھا جو ۱۸۲۸ء سے ۱۸۴۳ء تک جاری رہا ۔ یہ اخبار شیعہ فرقے کا ترجمان خاص تھا اور کبھی کبھی " دھلی اردو اخبار،، سے بعض مضامین نقل کر لیا کرتا تھا ۔

دھلی کا دوسرا اہم اخبار " سید الاخبار،، تھا جو ۱۸۳۷ء مین جاری ہوا ۔ اس کے بانی اور مدیر مولوی سید محمد تھے جو سرسید احمد خان کے بڑے بھائی تھے ۔ موصوف وکیل تھے ۔ اس لیے اس اخبار مین قانونی مسائل پر خصوصی مضامین چھپتے تھے۔ ۱۸۴۲ء مین مولانا سید محمد عین جوانی مین انتقال کر گئے۔ اس کے بعد نام کو تو کوئی اور ایڈیٹر تھا لیکن اصل ادارت سید احمد خان ھی کرتے تھے ۔

دلّی کے علاوہ بھی ملک کے مختلف شہرون سے بہت سے اردو اخبارات جاری ہوئے۔ لاہور کے اردو اخبارات مین " کوہ نور،، کو اوّلیت حاصل ھے ۔ یہ ۱۲/اپریل ۱۸۵۰ء کو جاری ہوا ۔ اس کے چند ماہ بعد لاہور ھی سے " دریائے نور،، جاری ہوا ۔ پشاور سے " مرتضائی،، ، گوجرانوالہ سے " گلزار پنجاب،،، گجرات سے " مطلع الانوار،، ، راولپنڈی سے " سہیل پنجاب،، جاری ہوئے ۔ سیالکوٹ سے منشی دیوان چند نے یکے بعد دیگرے کئی اخبار نکالے، مثلاً " چشمۂ فیض،، ، " خورشید عالم،، ، " نور علیٰ نور،، اور " وکٹوریا پیپر،، ۔ موخرالذکر ۱۹۲۵ء تک جاری رہا ، لیکن زیادہ شہرت " چشمۂ فیض ،، نے حاصل کی ۔

۱۸۵۲ء کے آغاز مین ملتان مین " ریاض نور،، جاری ہوا ۔ اس کے مدیر منشی مہدی حسین خان تھے ، جو اس سے پہلے " دریائے نور،، مین کام کر چکے تھے ۔

" ریاض نور " کے مقابلے پر فقیر غلام نصیرالدین نے " شعاع الشمس " جاری کیا ۔

آگرے سے " صدرالاخبار " ، " قطب الاخبار " ، " اخبار اللواح " ، " نورالابصار " ، " سفیر آگرہ " ، " اخبار صبحی " ، " مطلع العلوم " ، " اشرف الاخبار " جاری ہوئے ۔

لکھنؤ سے " لکھنؤ اخبار " ، " مخزن الاخبار " ، " طلسم لکھنؤ " اور " سحر سامری " جاری ہوئے ۔ مدراس سے " اعظم الاخبار " ، " آفتاب عالم تاب " ، " بشیرالاخبار " ، " طلسم حیرت " اور " جامع الاخبار " جاری ہوئے ۔[1]

مدراس میں سب سے پہلا اخبار (اردو) " عمدۃ الاخبار " غالباً ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا ۔[2] " اردو گائڈ " (کلکتہ) جو ہندوستان کے اوّلین اخبارات میں تھا ۔ ۱۸۶۰ء تک جاری رہا ۔ مولوی کبیرالدین بنگالی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے ۔[3]

اردو اخبارات کے علاوہ رسائل و جرائد بھی وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے ۔ اردو کا پہلا رسالہ " خیرخواہ ہند " ۱۸۳۷ء میں مرزاپور سے پادری آر ۔ سی ۔ ماتھر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا ۔ یہ انگریزی اور رومن اردو میں صرف مضامین پیش کرتا تھا ۔ بہرحال مجلّاتی صحافت دھلی میں " قرآن السعدین " سے شروع ہوئی جو دلّی کالج کے پرنسپل اشپرنگر نے ۱۸۳۵ء میں جاری کیا ۔ دلّی کالج کے ایک استاد ماسٹر رام چندر نے " فوائد الناظرین " کے نام سے ۱۸۳۵ء میں ایک پندرہ روزہ باتصویر علمی اور تاریخی اخبار جاری کیا ۔

---

۱ ۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت ، آٹھویں جلد ، ص ۳۶۳ (صحافت ۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر)

۲ ۔ مدراس میں اردو ، ص ۱۱۳ ، نصیرالدین ھاشمی

۳ ۔ بنگال میں اردو ، ص ۲۶۹ ، وفا راشدی

انھون نے ١٨٢٧ء مین " محب ھند " کے نام سے ایک علمی و ادبی ماھنامہ بھی جاری کیا تھا۔ مجلاتی صحافت مین پنجاب کے رسائل کا کردار خاص طور پر نمایان ھے ۔ ١٨٥٣ء مین منشی دیوان چند نے " ھمائے بے بہا " کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ لاھور سے جاری کیا۔ پنجاب کا بہترین رسالہ " خورشید پنجاب " تھا جو ١٨٥٦ء مین لاھور سے جاری ھوا ۔[١]

١٨٥٧ء کی جنگ آزادی کے دوران دھلی سے باھر کے بہت سے اردو اخبارات و رسائل بند ھوگئے۔ لیکن دھلی انگریزون سے آزاد تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی قیادت مین حرّیت پسندون کا راج تھا۔ اس لیے دھلی کے اخبارات دھڑلّے سے انقلاب کو آگے بڑھاتے رھے ۔ ان مین " دھلی اردو اخبار " ، " صادق الاخبار " اور فارسی مین " سراج الاخبار " جو بہادر شاہ ظفر کا کورٹ گزٹ تھا ، شامل ھین۔ ١٨٥٧ء کا انقلاب ختم ھوا تو یہ اخبارات بھی ختم ھوگئے ۔

١٨٥٣ء مین اردو زبان کے اخبارون کی تعداد ٣٥ تھی لیکن ١٨٥٨ء مین صرف ١٢ رہ گئی۔ ان مین چھ پرانے تھے اور چھ نئے ۔ ان مین صرف ایک اخبار کی ادارت کسی مسلمان کے ھاتھ مین تھی ۔[٢]

١۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند ، آٹھوین جلد ، ص ٣٢٢ (صحافت: عبدالسلام خورشید ڈاکٹر)

٢۔ تاریخ صحافت ، ص ٧١ ، عبدالسلام خورشید ڈاکٹر

۴- دھلی کالج -- احیائے علوم کی تحریک کا مرکز :

دھلی کی ایک معروف اور خوبصورت عمارت مین " غازی الدین خان ،، کے مدرسے کے نام سے ایک مدرسہ ۱۷۹۲ء مین قائم ھوا اور ۱۸۲۳ء تک جاری رھا- اس مدرسے کے نصاب تعلیم کے بارے مین تفصیلات کا علم تو نہین ھے لیکن خیال غالب ھےکہ اس زمانے کے دستور کے مطابق یہان بھی عربی اور فارسی کی مروّجہ تعلیم دی جاتی ھوگی-[۱]

اقتصادی بدحالی اور سیاسی انقلابات کی وجہ سے قدیم درسگاھون کی حالت خراب تھی- ۱۸۲۳ء مین کمپنی نے تعلیم کی طرف توجہ دی تو مسٹر ٹیلر کی سفارش پر ۱۸۲۵ء مین ایک سرکاری درسگاہ کا افتتاح " مدرسۂ غازی الدین خان،، مین ھوا - اور اسطرح " دھلی کالج ،، قائم ھو گیا-[۲] اس کالج کی باقاعدہ مالی اعانت بھی کی گئی اور مسٹر ٹیلر کو اس کا مہتمم مقرر کر دیا گیا- اب یہ ادارہ تعلیمی میدان مین روبہ ترقی ھوا- ۱۸۲۸ء مین برٹش ریذیڈنٹ کمشنر سرچارلس مٹکاف کی سفارش پر اس کالج مین انگریزی کی ایک جماعت کا اضافہ بھی کر دیا گیا- اس پر کچھ ھندو اور مسلمان خفا بھی ھوئے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انگریزی سے نفرت کا جذبہ سرد ھوتا چلا گیا اور کالج مین تدریسی عمل جاری رھا-

اس کالج کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہان کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا- عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم تو ھوتی ھی اردو مین تھی لیکن دوسرے سائنسی علوم

۱- مرحوم دھلی کالج ،ص ۱۱، عبدالحق مولوی ڈاکٹر

۲- ماسٹر رام چندر (مقدمہ خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر) ص ۱۱-۱۲، صدیق الرحمن قدوائی

جو پڑھائے جاتے تھے ان کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ھی تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد حکومت کی پالیسی مین تبدیلی کے نتیجے مین انگریزی زبان نے زور پکڑا اور عربی ، فارسی و سنسکرت ھی نھین بلکہ دیسی زبانین بھی کس مپرسی کی حالت مین آ گئین ۔ صرف دھلی کالج ھی ایک ایسا ادارہ تھا جہان مغربی علوم یعنی ھیئت ، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو ھی کے ذریعے دی جاتی تھی اور نتائج پر برا اثر نھین پڑتا تھا ۔[1]

اس کالج مین ۱۸۲۹ء مین انگریزی زبان، سائنس اور ادب وغیرہ کی تحصیل کے لیے ایک الگ شعبہ بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ مشرقی اور انگریزی شعبون کی تنظیم کے بعد اس مدرسے کو " دھلی کالج "، کی باوقار حیثیت حاصل ھوگئی تھی۔ اس زمانے مین جنرل تعلیمی کمیٹی مین مستشرقین کی اکثریت تھی لہذا انھون نے کالج کے مشرقی شعبے مین قدیم فلسفہ و منطق اور فارسی و عربی کی تدریس کا پرانا نظام بھی قائم رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ مغرب کے علوم مفیدہ کا باقاعدہ انتظام و اھتمام بھی کیا گیا۔ چنانچہ مشرقی شعبون کے طلبہ کو اردو زبان مین مغربی اصولون کے مطابق سائنس ، ریاضی، تاریخ اور دیگر جدید علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی ۔ کالج مین انگریزی اور مشرقی شعبے باھمی تعاون سے یکسان ترقی کر رھے تھے ۔ ان دونون شعبون کے طلبہ اور اساتذہ باھمی تعاون کی مدد سے اھم درسی کتابون کو انگریزی سے اردو مین منتقل کرتے تھے جنھین مشرقی شعبے کی جماعتون مین بطور نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ۱۸۴۱ء مین جب فلیکس بوترو کالج کے پرنسپل مقرر ھوئے تو ان کی کوشش سے ۱۸۴۳ء مین " ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی "، قائم ھوئی اور اردو مین مفید

۱۔ مرحوم دھلی کالج ، ص ۳۳، عبدالحق مولوی ڈاکٹر

علمی کتابوں کے ترجمے کا کام منظّم طور پر ہونے لگا۔ ماسٹر رامچندر اور دیگر فاضل اساتذہ کے جوش و انہماک کی وجہ سے مشرقی شعبے کے طلبہ ریاضی، نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبہ انگریزی کے طلبہ کو نیچا دکھانے لگے تھے۔ اردو میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا یہ اوّلین تجربہ اپنے نتائج کے اعتبار سے بےحد کامیاب ثابت ہوا[۱]۔ اس انجمن نے ایک قلیل مدّت میں ۱۲۸ کتابیں شائع کیں۔ اردو زبان کی بے بضاعتی، اصطلاحات کی دشواری اور انجمن کے محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جو پرنسپل، اساتذہ اور طلبہ کی باہمی مساعی سے روپذیر ہوا[۲]۔

۱۸۳۵ء کے لگ بھگ ڈاکٹر اشپرنگر کی پرنسپلی کے زمانے میں یہ کالج ایک بہتر جگہ یعنی کشمیری دروازے میں دارا شکوہ کی لائبریری کی عمارت میں منتقل ہوگیا اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک وہیں رہا۔ ہنگاموں کے دوران اس کالج کو مشتعل ہجوم نے مسمار کر دیا اور کالج کے اس وقت کے پرنسپل مسٹر ٹیلر(*) کو قتل کر دیا[۳]۔ کالج اس ہنگامے کے بعد سات سال تک بند رہا۔ ۱۸۶۴ء میں دوبارہ کھلا مگر بالآخر ۱۸۷۷ء میں توڑ دیا گیا[۴]۔

" دہلی کالج "، کے مشہور اساتذہ میں مسٹر ایچ ۔ ٹیلر مہتمم (۱۸۲۵ء تا ۱۸۳۱ء)، مسٹر فلیکس بوترو پرنسپل (۱۸۳۱ء تا ۱۸۳۵ء)، ڈاکٹر اشپرنگر پرنسپل (۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۰ء)،

۱۔ مولوی نذیر احمد (احوال و آثار)، ص ۳۹، افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر
۲۔ مرحوم دہلی کالج، ص ۱۴۷، عبدالحق ڈاکٹر
۳۔ داستان تاریخ اردو، ص ۲۱۸، حامد حسن قادری
۴۔ قدیم دہلی کالج نمبر، ص ۱۹۳

(*) نوٹ: مسٹر ٹیلر ابتداء میں مہتمم کالج تھے اور بعد میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ پرنسپل ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ (مقالہ نگار)

مسٹر کارگل پرنسپل (۱۸۵۱ء تا ۱۸۵۳ء) ، مسٹر ایچ ٹیلر پرنسپل (۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۷ء) ،

مولوی مملوک علی، مولوی امام بخش صہبائی ، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ، ماسٹر احمدعلی ،

ڈاکٹر ضیاء الدین وغیرہ اور طلبہ میں مولوی نذیر احمد ، مولوی محمد حسین وغیرہ تھے جن پر دھلی کالج

بجا طور پر فخر کر سکتا ھے اور جو دنیائے علم و ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔[1]

اس کالج کے ذریعے شمالی ھندوستان میں پہلی مرتبہ اردو کے ذریعے مغربی علوم ریاضی، سائنس ، علم ھیئت اور فلسفہ وغیرہ کی تدریس شروع ھوئی جس نے نئی قدروں کے فروغ کے لیے فضا پیدا کی۔ اس کالج سے متأثر شخصیتوں نے ادبیات، طبیعات ، کیمیا ، ریاضیات ، ھئیت ، شہریت و تمدّن ، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ ، سیرت، شاعری ، تذکرہ نگاری ، لغت سازی ، ناول نویسی ، مکتوب نگاری اور مقالہ نگاری میں کارھائے نمایاں انجام دیئے اور فکر و احساس کے انداز کو یکسر بدل دیا۔ اس لیے دھلی کالج کو محض ایک درسگاہ ھی نہیں بلکہ نشاۃ ثانیہ کے علمبردار اور محرّک کی حیثیت حاصل ھے ۔[2]

(د) دھلی کی معاشرتی و ثقافتی زندگی کے مختلف پہلو:

۱۔ لال قلعہ ۔ تہذیب و ثقافت کا مرکز:

لال قلعہ یا شاھی اقامت گاہ فن تعمیر کے اعتبار سے مغل دور کی ایک اھم یادگار

۱۔ مرحوم دھلی کالج ، ص ۱۵۳-۱۷۳، عبدالحق مولوی ڈاکٹر

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند ، آٹھویں جلد ، ص ۸۷ (دھلی کالج کی علمی خدمات ممتاز منگلوری)

ہے - رئیس احمد جعفری نے برنیر سیاح کے حوالے سے اس کی تعمیر اور دیگر تفصیلات بیان کی ہیں -[۱] ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے بھی اے - بی - راجپوت سابق مہتمم لال قلعہ کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے قلعے کی عظمت و جبروت اور وہاں کے مکینوں کی شان و شوکت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے -[۲]

مغلوں کے اقتدار کے آخری ایام میں بھی یہ قلعہ تہذیب و ثقافت کا اہم نمونہ اور مرکز رہا - جس طرح دلّی شہر تمام برصغیر کی جان سمجھا جاتا تھا اسی طرح لال قلعہ دلّی شہر کی جان تھا - قلعے میں منعقد ہونے والی تمام تقریبات مغل تاجداروں کی نفاست و خوش سلیقگی کی آئینہ دار ہونے کے علاوہ رعایا کے ساتھ ان کی بے پناہ شفقت و محبت اور خواص و عوام کے عقائد و جذبات کے احترام کو بھی ظاہر کرتی ہیں - مثلاً قلعۂ معلّی میں شاہی خاندان کی نجی تفریحات و مصروفیات کے علاوہ نوروز، محرّم، آخری چہار شنبہ، بارہ وفات ایسی تقریبات منائی جاتی تھیں تو سلونو، دسہرہ، دیوالی اور ہولی کی تقریبات کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا - اگر ایک طرف محفل سماع اور بزم ساز و آہنگ برپا کی جاتی تھی تو دوسری طرف محفل شعر و ادب کا انعقاد بھی کیا جاتا تھا - ولی اشرف صبوحی دہلوی کے الفاظ میں :

" دلّی کا لال قلعہ، جب تک اس میں غدر کے سبز قدم نہیں آئے تھے اپنی گودیوں کے پالوں کے لیے سچ مچ کا گہوارہ تھا - ایسا گہوارہ جس میں عیشوں اور راحتوں کے سوا ہزاروں چیزیں پرورش پاتی ہیں - وہاں

۱- بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص ۱۰۲۵، رئیس احمد جعفری

۲- سن ستاون میری نظر میں، ص ۲۶۰

کا طرز تمدّن، وھان کی معاشرت اور بولیان ٹھولیان سب جداگانہ

تھین۔ ھمارے باپ دادا نے وہ دور دیکھا تھا،، ۔[1]

آخری مغل تاجداران ھند پریشان حالی و وظیفہ خواری کے باوجود بھی اپنی

داخلی اور خارجی زندگی مین شاھی وقار کا بھرم رکھنے کی حتی‌الامکان کوشش کرتے تھے۔

سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز کے الفاظ مین :

" بے دست و پا تہی دست بادشاہ خود چاھے کسی حال مین رھتا مگر

تیموری آئین و آداب کو نبھاھتا،، ۔[2]

بادشاہ اور شہزادون کے مزاج مین تیموری طنطنے کی جھوٹی جھلک باقی تھی ۔

شہزادے، سلاطین زادے بات بات مین تخت کی قسم کھاتے تھے ۔ محدود آمدنی مین خوش پوشی

و خوش خوراکی قائم رکھتے ۔ طعام و لباس مین اختراعات کرتے ۔ نشست و برخاست مین،

سیر و تفریح اور گفت و شنید مین شاھانہ انداز دکھاتے، سواری، جلوس ، دربار، خانگی

معاشرت اور آداب و رسوم کے معیّن طریقون کا اھتمام کرتے۔ ان تمام باتون کو اکثر قلعے سے

باھر خواص و عوام کی زندگی پر بھی اثر پڑتا ۔[3]

لال قلعہ مین بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ بڑے تزک و احتشام سے منائی

جاتی تھی ۔ پورے چالیس دن رنگ رلیون مین گزرتے ۔ چار دن باقی رھے مہمان داری

ھونے لگتی۔ تمام شاھزادیان، امیرزادیان رنگ محل، خاص محل، ھیرا محل، موتی محل مین

۱۔ بزم آخر (پیش لفظ) ص ۷، از منشی فیض الدین دھلوی (مرتب: ولی اشرف صبوحی)

۲۔ تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دھلوی، ص ۵۸، سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز (مترجم: ضیاء الدین احمد برنی)

۳۔ بزم آخر، ص ۱۹، منشی فیض الدین دھلوی (مرتب: ولی اشرف صبوحی)

جمع ہو جاتیں ۔ نت نئے شگون ہوتے، طرح طرح کی تیاریاں کی جاتیں۔ شادیانے بجائے جاتے[1] ۔ جشن کے دربار میں سب امیر امراء نقارخانے کے دروازے پر سے اتر کر پیدل دیوان عام میں سے ہوتے ہوئے اور مختلف آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیوان خاص تک پہنچ کر تخت کے سامنے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ۔ بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے اور دیوان عام کے میدان میں موجود پلٹنیں سلامی اتارتیں اور شادیانے بجائے جاتے ۔ اس کے بعد محل کا دربار ہوتا۔ ملکۂ دوران، بیگمات اور شاہزادیاں اپنے اپنے رتبے سے نذریں دیتیں اور بادشاہ سے بھاری بھاری دوپٹے حیثیت کے موافق پاتیں۔ بعد میں ناچ گانے کا اہتمام کیا جاتا[2] ۔

اسی طرح جشن نوروز منایا جاتا۔ سب اچھے اچھے لباس پہنتے ۔ بادشاہ حضرت علی علیہ السلام کے دسترخوان پر نیاز دیتے اور اپنے ہاتھ سے سب میں تبرک تقسیم کرتے۔ محرّم کا چاند دکھائی دیتے ہی راگ رنگ کی محفلیں بند ہو جاتیں اور ماتم کے باجے بجنے لگتے ۔ بادشاہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے فقیر بنتے اور فقیروں میں کھانا تقسیم کرتے۔ روز عاشورہ موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھتے ۔ دیوان خاص میں حاضری کی تیاری ہوتی اور بادشاہ خود کھڑے ہو کر نیاز دیتے اور کھانے پینے کی چیزیں سب کو بانٹ دیتے ۔

آخری چہار شنبہ اور بارہ وفات اور گیارھویں شریف کی تقریبات بھی اسی اہتمام سے منائی جاتیں ۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے عرس پر، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس پر اور خواجہ معین‌الدین چشتیؒ کے عرس پر بھی شاہی آداب و روایات کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ماہ رمضان اور ماہ رجب کا ہر طرح احترام لازم رکھا جاتا۔ عیدین

۱۔ دلّی کا آخری دیدار، ص ۱۳، وزیر حسن

۲۔ بزم آخر، ص ۶۲، (از منشی فیض الدین دھلوی)، (مرتب: ولی اشرف صبوحی)

کے موقع پر بادشاہ دربار کرتے اور تمام تقریبات میں بہ نفس نفیس شرکت فرماتے ۔

اس کے علاوہ سلونو، دسہرہ ، دیوالی اور ہولی کے تہواروں پر بھی بادشاہ گزشتہ شاہانہ روایات کی پاسداری کا خاص خیال رکھتے اور بھی بہت سی ایسی تقریبات و رسومات تھیں جو لال قلعے میں ہوتی رہتی تھیں اور جن کا مرکز بادشاہ سلامت ہی کی ذات ہوتی تھی ۔ مثلاً جھروکوں کا زنانہ، درگاہ پر پنکھا چڑھانا اور پھول والوں کی سیر۔[1] برسات میں پھول والوں کا میلہ اب تک اہل دہلی کے لیے بڑی دلچسپی رکھتا ہے ۔ قلعے کی خواتین بھی اس میں شامل ہوتیں اور اپنے " جہان پناہ " کے زیر سایہ خلقت کے ہجوم سے الگ کسی باغ میں اترتیں اور جی بہلاتیں ۔[2] یوں ہی برس کے بارہ مہینے دربار لگتے اور جشن رہتے ہیں ۔ دن عید ، رات شب برات ہوتی ہے ۔ حویلی (قلعہ) کی خوش وقتی، سماجی زندگی سے گتھ گئی تھی ۔ وہاں سے جو مزے کی موج اٹھتی ساری دلّی اس سے شاداب ہوتی۔ ان دنوں حویلی ایک ایسا دریا تھی جو خود بھی شاداب ہو اور اپنی آبیاری سے اغلو بغلو کو بھی سرسبز کرتا جائے ۔[3]

اپنی جسمانی کمزوری اور ذہنی بے مقدوری کے باوجود شہر دہلی کے آرام طلب باشندوں کی جانب سے بہادر شاہ کا نہایت احترام کیا جاتا تھا ۔ ان سے ہندو اورمسلمان دونوں ہی ان کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے بے حد محبت کرتے تھے ۔ شہنشاہ کی حیثیت سے ان کی کمزوریاں اور خامیاں بھی عوام کے لیے مزید گرویدگی کا باعث بن گئی تھیں ۔ وہ بہت

۱۔ بزم آخر، ص ۳۸، منشی فیض الدین دہلوی (مرتب: ولی اشرف صبوحی)

۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد (از بہادر شاہ ظفر، ص ۲۷ ، امیر احمد علوی) ، رئیس احمد جعفری

۳۔ دلّی کا آخری دیدار، ص ۱۳ ، وزیر حسن

پرامن تھے اور جنگجوئی ہی ان میں نام کو نہ تھا۔ ان کی رعایا ان کی سادگی پر ہنستی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کس قدر بے بس ہیں لیکن پھر بھی وہ ان سے محبت کرتی تھی۔ بہادر شاہ ان فنون لطیفہ میں جن کے لیے دھلی اس زمانے میں مشہور تھی اچھے خاصے ماہر تھے ۔ ان میں سے چار یعنی موسیقی، خوش نویسی، ھاتھی دانت کی نقاشی اور شاعری ان کے پسندیدہ تھے ۔ شاہی دربان ان سب فنون کا سرپرست تھا۔[1]

لال قلعہ نے تقریباً دو سو سال تک اپنے بنانے والے یعنی شاھجہان سے لے کر اس وقت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر ثانی تک ترقی و تعمیر کی منزلیں بڑے سکون سے طے کیں۔ اس دو سو سال کے عرصے میں یہ شاھی محل اسلامی ثقافت کا مرکز اور اردو زبان کے سرچشمے کے طور پر جانا جاتا رہا۔[2]

۲۔ امراء کے دیوان خانوں کی ادبی صحبتیں :

شاعری امراء کا سب سے زیادہ مرغوب مشغلہ تھا۔ امراء نے بادشاہ کے گرداگرد ایک ادبی حلقہ بنا رکھا تھا۔ اس حلقے کے فنّی مشاغل میں بادشاہ بھی برابر کے شریک رہا کرتے تھے ۔ ہر پبلک موقع پر شعراء اپنی غزلوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مشاعرے ہوا کرتے تھے جہاں ایک سے بہتر ایک غزل پڑھی جاتی تھی اور انعامات دیئے جایا کرتے تھے ۔ تمام شہر غیر معمولی حد تک ان مشاعروں میں دلچسپی

۱۔ تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دھلوی، ص ۲۱-۲۲، سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز ، (مترجم: ضیاء الدین احمد برنی)

۲۔ سن ستاون میری نظر میں، ص ۲۶۰، ناصر کاظمی و انتظار حسین

لیتا تھا اور انعام پانے والوں کی شہرت دور دور تک پہنچ جاتی تھی ـ شاھی دربار کے اکثر امراء ان مشاعروں مین حصّہ لیتے تھے ـ ان مین سے ہر ایک کا اپنا تخلّص تھا اور اسی نام سے وہ مشہور تھا ـ خود شہنشاہ بھی بسا اوقات ان مین حصہ لیتے تھے ـ اس لیے کہ وہ بادشاہ ہونے کے مقابلے مین شاعر ہونے پر زیادہ فخر کیا کرتے تھے ـ کمپنی کی طرف سے بہادر شاہ کو اجازت تھی کہ وہ اپنا شاعرانہ مشغلہ جاری رکھین ـ[۱]

مولانا عبدالحیؒ " گل رعنا " مین داغ دھلوی کے بیان مین لکھتے ھین :

" یہ بھی مان کے ساتھ لال قلعے پہنچے، وھین ان کی تعلیم و تربیت ھوئی ـ قلعے مین شعر و سخن کا چرچا زوروں پر تھا ـ بادشاہ اور مرزا فخر و دونوں شیخ ابراھیم ذوق کے شاگرد تھے ـ یہ بھی استاد ذوق سے مشق سخن کرنے لگے اور ایک عرصے تک مشاعرون مین ان کے ساتھ جاتے اور داد سخن لیتے رہے ــــ حسن اتفاق سے زمانہ بھی ان کو اچھا ملا ـ شاعری کا آغاز لال قلعہ سے جو اردوئے معلّی کا گھوارہ تھا ھوا " ـ[۲]

قلعے کے مشاعرون کے علاوہ معلوم ھوتا ھے کہ شہر مین آئے دن امراء بھی اپنے دیوان خانوں مین ادبی صحبتوں کا اھتمام کیا کرتے تھے ـ مولانا صلاح الدین احمد شیفتہ کے بیان مین فرماتے ھین :

۱ـ تذکرہ مولوی ذکاء اللہ ، ص ۳۲ـ۵۷، سی ـ ایف ـ اینڈریوز (مترجم:ضیاء الدین احمد برنی)

۲ـ گل رعنا ، ص ۳۲۲، عبدالحیؒ مولانا سید ـ

" وہ جب تک دھلی مین رھے ہر ہفتے ان کے ھان مجلس شعر و سخن بپا ھوتی اور اس مین مفتی صدرالدین خان آزردہ بلکہ خود استاد الشعراء مومن سے لے کر ضیاء الدین احمد نیّر تک شریک ھوتے ۔ شعر و سخن کے علاوہ علمی مباحث اور ادبی چرچے اس مجلس کی جان ھوتے تھے اور اس زمانے کے آداب و رسوم کے مطابق تخیّل و بیان کی خوب و زشت پر محاکمات لطیفہ کا سلسلہ پہرون جاری رھتا " ۔[1]

کریم الدین کے بیان کے مطابق بھی شیفتہ کے مکان پر شاعرہ ہوا کرتا تھا ، چنانچہ وہ کہتے ھین :

" اس سال مین یعنی ۱۸۴۷ء مین درمیان شاھجہان آباد ان کے (شیفتہ) مکان پر مشاعرہ ھوا کرتا تھا ۔ اب چند ایام سے بہ سبب اس کے کہ شاھجہان آباد مین نہین ھین موقوف ھو گیا ھے " ۔[2]

دھلی مین دو مکان ایسے تھے جہان باھر سے آنے والون کے لیے حاضر ھونا ضروری تھا ۔ آزردہ اور شیفتہ کے مکان پر دھلی کے ارباب علم و فن جمع رھتے تھے ۔ اس لیے ان کے مکان پر حاضر ھو کر دھلی کے باکمالون سے ملاقات بہ آسانی ھو جاتی تھی ۔ حج سے واپسی کے بعد شاعری کا شوق تو کم ھو گیا تھا لیکن مشاعرون کا انعقاد شیفتہ کے یہان جاری رھا ۔ داغ دھلوی کہتے ھین کہ مین نے اپنی پہلی غزل شیفتہ کے مشاعرے مین پڑھی تھی جس کا

---

۱ ۔ دیوان شیفتہ (حضرت شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۱۰ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

۲ ۔ تذکرۂ طبقات الشعرائے ھند ، ص ۳۷۰ (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

مطلع یہ تھا :ـــہ

شرر و برق نہین شعلہ و سیماب نہین

کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بے تاب نہین

نظامی بدایون نے ۱۸۲۷ء مین شیفتہ کے یہان مشاعرے مین آزردہ کا غزل پڑھنا لکھا ھے ـ وہ کہتے ھین کہ ۱۸۲۷ء کا وہ زمانہ تھا کہ نواب صاحب و مفتی صاحب کے یہان ھر ھفتہ باری باری سے مشاعرہ ھوا کرتا تھا ـ ایک روز نواب صاحب کے یہان مشاعرہ تھا جس مین مفتی صاحب نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ھے :ـــہ

یا تنگ نہ کر ناصح نادان مجھے اتنا

یا لا کے دکھا دے دھن ایسا کمر ایسی[1]

نواب صاحب نے مزاحاً مفتی صاحب کے چھیڑنے کواس طرح مین ایک غزل ایسے شخص کو لکھ کر دے دی جس کا شمار سخنوران مشہور مین نہ تھا ـ مفتی صاحب کے بعد جس وقت اس نے غزل کو پڑھا تو مفتی صاحب کی گھبراھٹ اور پریشانی قابل دید تھی ـ اس غزل کے دو شعر یہ ھین :ـــہ

هم بزمیٔ دشمن کو چھپاتا ھی تھا قاصد کہتا ھے کسی سے کوئی نادان خبر ایسی

کہتے هو علاج آپ کرین کچھ خفقان کا دل کا ھے کـور ھو یگا سنائی خبر ایسی

جو اشعار نظامی بدایونی نے نقل کیے ھین وہ شیفتہ کی محبوبہ رمجو نزاکت تخلص کے ھین اور " گلشن بے خار " (تالیف ۱۲۵۰ھ / ۳۵-۱۸۳۴ء) مین موجود ھین ـ

۱ـ کلیات شیفتہ (مقدمہ) ، ص ۲۱ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

اس لیے یہ ثابت ہوتا ھے کہ یہ مشاعرہ ۳۵-۱۸۳۴ء سے قبل ہوا تھا ، اور اگر یہ مشاعرہ شیفتہ کے مکان پر ہوا تھا تو ان کے سفرِ حجاز سے پہلے کی بات ھے ۔ نزاکت کی غزل درج ذیل ھے ۔ ؎

نا منصفی اور اے بت بیدادگر ایسی — چاہت تری غیرون کو بھی ہوگی مگر ایسی

حرمان ھے اگر چاہ کی تقریر تو ظالم — تقصیر نہ ہوگی کبھی بار دگر ایسی

ہم بزمیٔ دشمن کو چھپاتا ہی تھا قاصد — کہتا ھے کسی سے کوئی نادان خبر ایسی

کہتے ہو علاج آپ کریں کچھ خفقان کا — دل کا ھے کور ہوے گا سنائی خبر ایسی (*)

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام فرماتے ہیں کہ ان دنون دہلی مین جابجا مشاعرے ہو رہے تھے جن مین فارسی اور اردو غزلین پڑھی جاتی تھین [1] ۔ مرزا صاحب سب مین تو نہ جاتے تھے لیکن جن مشاعرون کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان مین نواب زین العابدین عارف کھینچ کر لے جاتے ۔ مرزا نے ان مشاعرون مین کئی غزلین پڑھین ۔ انھون نے عرفی کے طرز پر جو قصیدہ " گریستن ،، کی ردیف مین لکھا ھے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے تجویز کردہ مصرعۂ طرح پر تھا ۔ معلوم ہوتا ھے کہ جس مشاعرے مین یہ قصیدہ پڑھا گیا اس مین میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے نہ آئے تھے اور چونکہ فارسی کے قدردان تھوڑے تھے مرزا شش و پنج مین تھے کہ پڑھین یا نہ پڑھین کہ

(*) نوٹ: پہلے تین شعر گلشن بے خار مین درج ھین ۔ آخری دو شعر نظامی بدایونی نے مقدمہ کلیات شیفتہ و حسرتی مین بھی درج کیے ھین ۔ (مقالہ نگار)

۱ ۔ غالب نامہ (آثار غالب) ، ص ۹۸-۹۹ ،

اتنے مین مفتی صدرالدین آزردہ جو ابھی تک نہین آئے تھے ، آ گئے ۔ چنانچہ مرزا ایک خط مین مصطفیٰ خان شیفتہ کو جنھین وہ مشاعرون کے حالات میرٹھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے لکھتے ھین :

" بندہ را در زمین " گریستن ،، نگارش قصیدہ اتفاق افتادہ بود ۔ آن می سنجیدم کہ این ورق را چون برات نامقبول باز برم و ریختہ گویان را سر ندھم کہ از آمدن حضرت آزردہ دل بخود بالید و زمزمۂ دستوری یافت ،، ۔

اس زمین مین چالیس ابیات پر مشتمل شیفتہ کے کلیات مین بھی ایک قصیدہ ملتا ھے ۔[1]

شیخ محمد اکرام (ڈاکٹر) فرماتے ھین کہ مرزا نے عرصے سے اردو شاعری قریب قریب ترک کر رکھی تھی اور ۱۸۴۳ء کے مشاعرون مین اور شعراء نے تو اردو غزلین پڑھین مگر مرزا نے فارسی اشعار ھی سنائے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ ۱۸۴۵ء مین گاھے گاھے انھون نے اردو غزلین لکھنا شروع کر دی تھین ۔ چنانچہ جب نواب اصغر علی خان تسلیم نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا اور ذوق ، مومن اور غالب کو دعوت دی تو مرزا نے اردو غزل ھی پڑھی ۔ ۔۔ہ

نوید امن ھے بیداد دوست جان کے لئے　　رھی نہ طرز ستم کوئی آسمان کے لیے[2]

---

۱ ۔ کلیّات شیفتہ و حسرتی ، ص ۱۳۰ ، (مرتب : نظامی بدایونی)

۲ ۔ غالب نامہ (آثار غالب) ، ص ۱۰۰ ، محمد اکرام شیخ ڈاکٹر

اسی طرح اس زمانے مین ایک اور عظیم الشان مشاعرہ ہوا جس مین ذوق اور مومن نے طرحی غزلین پڑھین ۔ مرزا نے بھی دو غزلہ کہا ہے :

مطلع اوّل ؎ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب مین
کافر ہون گر نہ ملتی ہو راحت عذاب مین

مطلع دوّم ؎ کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب مین
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب مین

اسی زمین مین کلیات شیفتہ مین بھی تین غزلین موجود ہین جن کے مطلعے ذیل مین درج کیے جاتے ہین :؎

آرام سے ہے کون جہان خراب مین | گل سینہ چاک، اور صبا اضطراب مین
شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب مین | جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب مین
ناچار مین خموش وہ ناحق عتاب مین | طاقت تھی جتنی صرف ہوئی اضطراب مین [1]

حالی فرماتے ہین کہ مرزاکی غزل جس کا مطلع ذیل مین درج کیا گیا ہے غالباً اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب نواب مصطفیٰ خان مرحوم متخلص بہ حسرتی و شیفتہ کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، صہبائی، آزردہ، مومن اور نیر و رخشان وغیرہ بھی سب اس مین شریک ہوا کرتے تھے۔ ؎

گفتم بحکم حسرتی غالب خستہ این غزل | شاد بہیچ می شود طبع وفا سرشت ما [2]

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی، ص ۹۳، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ یادگار غالب (از حالی) ، ص ۲۹۹، مرتبہ خلیل الرحمن داودی

کلیات شیفتہ و حسرتی میں بھی اس زمین میں ایک غزل ملتی ہے ، جس کا مطلع ہے۔ ؎

منع جفاء ضاربان حیف ز سر نوشت ما   مرتع آہوی حرم گرد سپہر کشت ما [١]

لال قلعہ اور شہر میں منعقد ہونے والے چند اک مشاعروں کے بارے میں غالب کے خطوط سے بھی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ [٢]

٣۔ عوام و خواص کا ذوق شعری ۔ مشاعروں کا عام رواج :

ادبی صحبتیں امراء ہی سے وابستہ نہ تھیں بلکہ عوام اور خواص سبھی دلچسپی لیتے تھے ۔ مولانا غلام رسول مہر ، مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں :

" اٹھارھویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امراء کے سیلون اور ڈرائنگ روم کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہ یہی حال دھلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بن جاتا تھا اور اس حلقے کے لیے ٹھیک ٹھیک ایک علمی ، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا " ۔ [٣]

انیسویں صدی عیسوی میں شاعری ، عام و خاص دونوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔

١۔ دیوان و رقعات فارسی ، ص ٩ ، شیفتہ و حسرتی ، مطبوعہ ١٨٨٧ء

٢۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی ، دیباچہ) ، امتیاز علی عرشی

٣۔ نقش آزاد ، ص ٣١٦ ، غلام رسول مہر مولانا

ہوا یہ کہ مغلوں کے سیاسی زوال کے بعد جب اہل ہند میں خارجی زندگی سے مقاومت کی قوت باقی نہ رہی تو انھوں نے داخلیت کے خول میں پناہ لینا چاہی۔ رفتہ رفتہ اس داخلیت پسندی نے انھیں عملی زندگی سے اس درجہ دور کر دیا کہ وہ ایک خیالی دنیا کے اسیر ہو کر رہ گئے ۔ اس خیالی دنیا کو آباد کرنے اور سجانے میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی وہ مشغلۂ شعر و سخن تھا ۔ حافظ محمود شیرانی اس دور کے ایک تذکرے پر بحث و تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" سلاطین و عمال ، امراء و علماء ، سپاہ و اہل دیوان کے علاوہ ہر طبقے کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا ۔ مثلاً میر صیقل گر ہے --- محمد امان نثار معمار ہیں--- حسین بخش بخشی پارچہ فروش ہے، مدھ سنگھ شیفتہ آہنگر ہے ، خواجہ بیدنگا شیدا ، علاقہ بند ہے ۔ میر صادق علی صادق فیلبان ہے ۔ شبھوناتھ عزیز مہاجن ہے ۔ میر لطیف علی لطیف جواہرات کا دلال ہے ۔ مغل علی مغل علاقہ بند سوداگر ہے ۔ بدرالدین مفتون بزاز ہے ۔ یکرنگ ستار ہے ۔ محمد ہاشم شائق خیاط ہے -- محمد عارف رفوگر ہے ۔ عنایت اللہ عرف کلّو حجّام ہے --- غلام ناصر جرّاح ہے ۔ مقصود ایک سقّہ ہے ۔ قرین ایک خاکروب ہے " ۔[1]

مشاعروں میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے تھے اور طبع آزمائی کی جاتی تھی ۔ مشاعروں کا رواج بھی اردو شاعری کی تاریخ میں ابتداء سے ملتا ہے ۔ دہلی تو ان

---

۱ ۔ (مقدمہ) مجموعۂ نغز، ص ۳۲ ، حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی (مرتب: حافظ محمود شیرانی)

شاعـروں یا مراختوں کا مرکز خاص تھا ـ درد اور خان آرزو ہی کے زمانے سے وہاں جگہ جگہ شعری محفلیں منعقـد ہونے لگی تھیں ـ خود خان آرزو، خواجہ میـر درد اور میـر تـقی میـر کے یہاں ایسی محفلوں کے باقاعـدہ انعقاد کا سراغ ملتا ہے ـ شفیق اورنگ آبادی نے درد کے بیان میں لکھا ہے :

" شاہ عبدالحکیم می گوید کہ این عـزیز بزرگ عالی دودمان را فقیـر می کرد بـہ خانـۂ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختـہ گـویان ھنـدی کہ در پانـزدھم ھـرمـا ھے مـقرر بود ، دیدہ ام" ـ[1]

خان آرزو کی وفات کے بعد یـہ محفل خواجہ میـر درد اور اس کے بعد میـر تـقی میـر کے یہاں منتـقل ہوگئی جیساکہ خود میـر نے درد کے بـیان میں لکھا ہے :

" مجلس ریختہ کہ بـرخانـہ بنـدہ بـہ تاریخ پانـزدھم ھر ماہ مقرر است ـ واللہ بہ ذات ھمین بزرگ است ، زیـراکہ پیش ازین مجلس بہ خانـہ اش مقرر بـود ـ"[2]

ان مراختـوں یا مشاعـوں کو روز بـروز فروغ حاصل ہوتا رہا اور ایک دن وہ آیا کہ وہ تمـدنی زنـدگی کا اہم جزو بن گئے اور شادی و غـم کی ہر تـقریب میں منعقـد ہونے لگے ـ چنانچہ قـدرت اللّٰہ قاسم نے عـاشق کے ذکر میں لکھا ہے :

" قریب دوازہ سال بلاناغـہ ہـر روز جمعہ بہ انعقاد مجلس مشاعـرہ بخانہ

۱ـ چمنستان شعراء، ص ۷۸، مـولفـہ ۱۱۷۵ھ، مـطبـوعـہ انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۸ء

۲ـ نـکات الشعراء، ص ۵۰، مـولـفـہ ۱۱۶۵ھ، مـطبوعہ انجمن تـرقی اردو، ۱۹۳۵ء

خود پرداخت و هیچ مانع قوی بل اقوا موقوف نہ ساخت ۔ حتیٰکہ صبح خاتمہ روز سوم فرزند ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلس مراختہ منعقد فرمود و موقوف نہ ساخت ۔[۱]،،

کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین :

" حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی صاحب تذکرۂ مجموعۂ نغز،، ، میر محمد خان سرور صاحب تذکرۂ عمدہ منتخبہ ، حکیم نصراللہ خان وصال ، میر نظام الدین ممنون دہلوی ، خوب چند ذکا صاحب تذکرۂ عیارالشعراء ، میرزا اسداللہ خان غالب ، حکیم محمد مومن خان مومن ، سعادت یار خان رنگین وغیرہ کے دم سے دہلی رشک شیراز بنی ہوئی تھی ۔ اردو کے ساتھ فارسی کا بھی عام چرچا تھا ۔ اردو اور فارسی کی طرحین تجویز ہوتین اور شعراء طبع آزمائی کرتے ۔ عبداللہ خان علوی ، امام بخش صہبائی ، مومن اور غالب فارسی مین شہرت رکھتے تھے ۔ آزردہ بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے ۔ شیفتہ نے بھی دونون زبانون مین شاعری شروع کی ۔[۲]،،

شاعری کے شوق کو پورا کرنے کے لیے مدرسون اور درسگاہون مین جہان ادبیات کی تعلیم لازمی تھی طلبہ کو بیت بازی کی تربیت دی جاتی ۔ محلّے کے وہ بزرگ جنھین ادبیات سے دلچسپی ہوتی نوجوانون کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق فن شاعری کی تعلیم دیتے ۔

---

۱ ۔ مجموعۂ نغز ، ص ۳۷۹ ، مولفہ ۱۲۲۱ھ ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۳۳ء

۲ ۔ گلشن بے خار ، ص ۳۱ ، (شیفتہ) ، مرتبہ : کلب علی خان فائق رامپوری

عام مشاعرے مین کسی معینة تاریخ پر کسی شوقین کے مکان پر اساتذہ اور مبتدی حضرات جمع ہوتے اور ایک مقررہ طرح مین طبع آزمائی کرتے اور اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے۔[۱]

عموماً عشا کے بعد یہ محفل مشاعرہ شروع ہوتی اور آدھی رات یا پچھلے پہر تک قائم رکھتی۔ صاحب محفل مشاعرہ حسب توفیق تواضع کا اہتمام کرتا۔ محفل کو فرش فروش اور سازو سامان سے آراستہ کیا جاتا اور محفل مشاعرہ گرم ہوتی۔[۲]

گارسان دتاسی کہتا ہے کہ ہندوستانی ادب کے شعبون مین سے مقدّم شاعری ہے اور اسے بڑی کامیابی اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس مقدّس آگ کو خاص ادبی جلسون کے ذریعے سے جن کا نام مشاعرہ ہے زندہ رکھا جاتا ہے۔ ہندوستانیون مین اس قسم کے ادبی جلسون کا خاص ذوق ہے۔ یہان تک کہ وہ لوگ بھی جن کا پیشہ شاعری نہین شوقیہ طور پر معیّنہ ایام (عموماً پندرہ یوم) مین اپنے گھرون پر شام کے وقت ایسے جلسے کرتے ہین۔ وہ شہر کے ان تمام احباب کو جو شعر سے ذوق رکھتے ہین دعوت دیتے ہین اور ان سے درخواست کرتے ہین کہ اس موقع کے لیے فلان بحر مین شعر کہنے کی زحمت فرمائین۔[۳]

۴۔ علماء و صوفیا۔ دینی مدارس و خانقاہین :

دہلی اسلامی ہند کی ابتداء سے تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز رہی ہے۔

۱۔ لیگیسی آف انڈیا، ص ۲۹۴، گیرٹ

۲۔ مومن دہلوی، ص ۷۹، ناظر حسن زیدی

۳۔ خطبات گارسان دتاسی (ترجمة)، ص ۱۲

دجلہ و فرات سے علم و عرفان کی جو موجین اٹھی ھین وہ جمنا ھی کے کنارے سے آ کر ٹکرائی ھین ۔ بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ھین وہ یہین آکر ٹھہرے ھین۔ کبھی اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاھین تھین، قدم قدم پر مدرسے تھے اور کوچے کوچے مین مسجدین تھین ۔ تشنہ گان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے بڑی بڑی تکلیفین برداشت کرتے تھے اور یہان پہنچتے تھے ۔ ھندوستان کا یہ دارالسلطنت رشک بغداد و غیرت مصر بنا ھوا تھا۔ شاہ غلام علی کی خانقاہ مین شام، مصر، چین اور حبش کے لوگون کے ھجوم لگے رہتے تھے [۱] ۔ ایک ایک وقت مین پانچ پانچ سو فقیر (درویش) رھا کرتے تھے ۔ مسلمانون مین مذھبی تہذیب کے دو بڑے مرکز " فرنگی محل، لکھنو،، اور " مدرسۂ رحیمیہ، دھلی ،، تھے ۔ ولی اللّٰھی ادارہ کتاب و سنّت اور حدیث کی تعلیم کا مرکز تھا۔ یہ تبلیغ دین کے جوش سے معمور تھا اور قال اللّٰہ و قال الرّسول کا غلغلہ بلند رھتا تھا۔ ولی اللّٰھی سلسلے کے چشم و چراغ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالقادر، اور شاہ رفیع الدین کے دم سے رشد و ھدایت کا چراغ روشن تھا اور یہ آستانہ دھلی کے دیندار خانوادون کا مرجع و مرکز تھا [۲] ۔ سرسید کہتے تھے کہ میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی [۳] ۔ نواب مصطفٰی خان شیفتہ نے سب سے پہلے مولانا شاہ محمد اسحق صاحب سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے اور

۱۔ آثار الصنادید، باب چہارم، ص ۱۸، سید احمد خان سر

۲۔ شاہ ولی اللّٰہ کی سیاسی تحریک، ص ۱۲۷

۳۔ حیات جاوید، ص ۱۹، حالی خواجہ الطاف حسین

دھلی کے مشہور محدّث اور اکابر شیوخ سے تھے بیعت کی تھی ۔[1] شمالی ھند کے طول و عرض مین شاہ ولی اللّٰھی خاندان اپنی دینی خدمات کی بنا پر نہایت معزّز و محترم سمجھا جاتا تھا ۔ بے شمار مرید اس کے حلقۂ عقیدت مین شامل تھے ۔[2]

بزرگان دین مین شاہ غلام علی صاحب کے علاوہ عبدالغنی ، احمد سعید ، محمد آفاق ، فخرالملّت و دین مولانا محمد فخرالدین ، قطب الدین کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر رنج ، مولانا محمد حیات، رسول شا ہ بہت مشہو ر ھین ۔ ان کے علاوہ نقش بندی ، قادری اور چشتیہ سلسلے کے متعدد بزرگ اور دیگر مجذوبین اور قلندر وغیرہ بھی خدمت دین کے میدان مین مصروف تھے ۔ علماء مین شاہ عبدالعزیز ، شاہ عبداللہ ، شاہ عبدالقادر ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالغنی (پسران شاہ ولی اللّٰہ کہ یہی ایک خاندان بجائے خود علم کا خازن تھا) مین سرفہرست آتے ھین ۔ زبدۃ المحدّثین محمد اسحق نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب، خاتم المحدّثین نذیر حسین شاہ صاحب، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی مملوک العلی قابل احترام ھین ۔[3]

سرسید احمد خان فرماتے ھین کہ شاھجہانی عہد سے زیر جامع مسجد مدرسۂ " دارالبقا " چلا آ رہا تھا ۔ وہ سلطنت کی تباھی کے ساتھ برباد ھوا ۔ مفتی صدرالدین آزردہ صاحب نے اپنے روپے سے دوبارہ بنوایا ۔ عمارت درست کرائی ۔ درس و تدریس کا اھتمام کیا ۔ اساتذہ اور طلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظائف دیئے ۔ منتھی طلبہ کو عدالت کے کام

---

١ ۔ (مقدمہ) کلیات شیفتہ و حسرتی ، ص ٨ ، نظامی بدایونی
٢ ۔ آثار الصنادید ، جلد چہارم، ص ٢٥ ، سید احمد خان سر
٣ ۔ گلزار آصفیہ ، ص ٣٠١ ، (بحوالہ مومن دھلوی از ناظر حسن)

سے فارغ ہو کر اسباق خود پڑھاتے اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے ۔[1]

صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں کہ جامع مسجد کے قریب حسین بخش کا مدرسہ تھا جس میں مشہور فاضل اور واعظ مولوی نوازش علی درس دیتے تھے ۔ الطاف حسین حالی اس میں داخل ہوگئے اور بہت حسرت کے ساتھ اور تکلیف اٹھا کر علم کی دولت حاصل کرنی شروع کی ۔ مولوی نوازش علی کے علاوہ دلّی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی فیض الحسن، مولوی امیر احمد اور شمس العلماء ، سید نذیر حسین کے درس سے بھی استفادہ کیا ۔[2]

۵۔ دھلی کے مختلف اھل کمال :

اس دور کی زندگی میں حسن اتنا رچ بس گیا تھا کہ خواص و عوام دونوں ھی اس کے شیدائی نظر آتے تھے ۔ خوش پوشی، خوش خوراکی، خوش گفتاری و خوش رفتاری پر لوگ زیادہ توجہ دیتے تھے ۔ مختلف پیشہ ور ان وضعداریوں کو کماحقہٗ نباھتے تھے ۔ مثلاً سڑک پر پانی پلانے والے سقّے اس خوبی سے کٹورا بجاتے تھے کہ " جلترنگ،، کی آواز پیدا ہوتی تھی ۔ " میاں پانی پلاؤں ؟،، " آب حیات کے دو گھونٹ ،،؟ " برف کی کھرچن ،، ،

۱۔ آثار الصنادید ، ص ۲۷ ، سید احمد خان سر

۲۔ یادگار حالی ، ص ۲۸

" پسیا سو سبیل ھے یہ شہیدون کے نام کی ،، وغیرہ کلمات اس طرح ادا کیے جاتے تھے کہ خود بخود تشنگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ حقّہ پلانے والون کا بھی یہی حال تھا کہ ان کی سج دھج اور وضع قطع دیکھ کر بے اختیار ایک دو کش لگانے کو دل کر آتا ۔[1]

بازار حسن کی زینت بننے والیان بھی خوش پوشی و خوش وضعی کے ساتھ ساتھ نوشت و خواند سے بھی بہرہ ور ہوتی تھین اور آداب مجلسی مین اپنا جواب نہیں رکھتی تھین ۔ اکثر شعراء کا کلام انھین ازبر یاد ہوتا تھا جو وہ مختلف محفلون میں سناتی تھین۔ بہت سی طوائفین خود بھی شعر کہتی تھین۔ مثلاً صاحب شاعرہ تھین اور مومن خان مومن سے مشورۂ سخن کرتی تھین ۔[2] اسی طرح رمجو متخلص بہ نزاکت بھی شاعرہ تھین اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے بہت متاثر تھین ۔[3] اونچے درجے کی طوائفین بازار مین بیٹھنے کی بجائے اپنے گھرون مین رہتین۔ ان کو ڈیرہ دارنیان کہا جاتا تھا اور تمیز و تہذیب مین ایک خاص مقام رکھتی تھین ۔[4]

اس دور کی معاشرت مین طوائف کو بہت دخل تھا ۔ شادی بیاہ ، ہولی ، دیوالی ، عید ، بقرعید پر رئیسون کے دیوان خانون تک اور محرّم مین حرم سرا تک باریاب ہوتین اور انعام و اکرام پاتین ۔ ڈیرہ دار طوائفون کی حویلیان کافی بڑی بڑی ہوتی تھین جن مین کئی کئی نوچیان اپنے آراستہ کمرون مین رہتین ۔ طوائفون کے علاوہ ڈومنیان بھی

۱۔ دلّی کا آخری دیدار، ص ۸۳، وزیر حسن سید
۲۔ مومن، ص ۱۵۹ ، کلب علی خان فائق رامپوری
۳۔ (مقدمہ) کلیات شیفتہ (اردو) ، ص ۱۸ ، کلب علی خان فائق رامپوری (مرتّب)
۴۔ دلّی کا آخری دیدار، ص ٧١ ، وزیر حسن سید

شوہر دار، بے شوہر ، بیباک غرض ہر طرح کی ہوتی تھین ۔

پاکیزہ طبع لوگ فارغ اوقات مین خوش نویسی کی مشق کیا کرتے تھے۔[1] علماء و شعراء مین بعض ایسے بھی تھے جو جامع سیف و قلم کہلانے کے مستحق تھے ۔ صاحب " گلزار آصفیہ "، عبدالحلیم شرر، خواجہ عبدالروفؒ عشرت وغیرہ نے اپنی یادداشتون مین اکثر ایسے باکمالون کا ذکر کیا ہے جو تلوار لگانے، گولی سے رسی، روپے یا چراغ کی لو اڑا دینے اور پٹے، لاٹھی یا رومال سے اپنے کوہ پیکر مسلّح حریف کو گرا دینے مین حیران کن کمال دکھا سکتے تھے ۔ سرسید احمد خان نے ایسے بے شمار باکمالون کا ذکر کیا ہے جن سے دامن دہلی مالا مال تھا :

* قراء و حفاظ: قاری قادر بخش ، حافظ احمد ، قاری محمد بیگ ، قاری احمد ، حافظ عبدالرحیم ۔

خوش نویسان : سید محمد امیر ، آغا صاحب، مرزا عبداللہ بیگ، امام الدین احمد خان، محمد جان صاحب، اخوند عبدالرسول قندھاری ، حافظ کلّو خان ، میر امام الدین ، مولوی حیات علی ، پنڈت شنکر ناتھ، بدرالدین علی خان ۔

مصوّران : غلام علی خان ، فیض علی خان ، مرزا شاہ رخ بیگ، محمد عالم۔

۱۔ لیگیسی آف انڈیا، ص ۲۹۸، گیرٹ

ارباب موسیقی: همت خان ، راگ رس خان ، میر ناصر احمد ، بہادر خان ستار زن ، رحیم سین ستارزن ، نظام خان ، قائم خان ، گلاب سنگھ پکھاوچی ، مکھوا پکھاوچی ،، ۔[1]

یہ تھے وہ باکمال جن کے نام صفحۂ ہستی پر اب تک گلدستہ کی طرح سجے ہوئے ہیں اور جن سے پچھلی صدی کی محفل آراستہ رہ چکی تھی ۔ اسی طرح ہر شہر میں مختلف فنون کے ماہر بہ فرق مراتب موجود تھے اور جن کی پرورش کرنا صاحب ثروت و حیثیت لوگ اپنا فرض سمجھتے تھے ۔

۲۔ اہل دہلی کے مشاغل و تفریحات ۔ سماجی تقریبات:

انیسویں صدی کے دوسرے ربع میں تقریباً ۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان جبکہ عرف عام میں " انگریزی امن و امان ،، پوری طرح قائم ہو چکا تھا شہر کے اندر بہت خوشحالی تھی ۔ شہر کے اکثر باشندے اس عام خوشحالی کی وجہ سے جو شہر کے اندر پائی جاتی تھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ اس امن و امان کی وجہ سے جو نیا نیا قائم ہوا تھا فرصت کا وقت تفریح کی نذر ہو جاتا تھا ۔ تہوار بہت تھے اور بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے ۔ شادی کے ایام میں روزانہ جلوس کا نکلنا ایک عام بات تھی اور شادیوں پر رنگ رلیوں

۱۔ تذکرہ اہل دہلی ، ص ۳-۱۲ ، سرسید احمد خان (مرتب: قاضی احمد میاں)

اور آرائشون پر بے حد روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ بازارون مین شہریون کا باھمی میل جول بڑی دلربائی کا انداز رکھتا تھا۔ طرح طرح کے شوخ رنگ کپڑون کا استعمال فیشن مین شامل تھا اور شرفاؑ و امراؑ اپنے بھڑکیلے لباس مین خصوصیت کے ساتھ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے - جن گھوڑون پر بیٹھ کر امراؑ سڑکون پر نکلتے تھے وہ بہترین آرائشی سامان سے سجے ہوئے ہوتے تھے اور سواری اپنی بجنے والی گھنٹیون اور قیمتی لوازمات کے ساتھ دستون کی شکل مین نکلتی تھی - شہر کے جو رئیس شاھی دربار سے وابستہ تھے شاندار بہلیان رکھا کرتے تھے جن کا آرائشی سامان بہت قیمتی ہوتا تھا۔ اسی مین بیٹھ کر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے - قلعے کے اندر امراؑ کی محبوب تفریح مرغ بازی تھی۔ ایک ایک بازی پر بڑی بڑی رقوم کی ھارجیت ہو جایا کرتی تھی - غرباؑ بھی اپنی غربت مین اس قدر غرق نہ تھے کہ وہ زندگی کی مسرّتون سے لطف اندوز ھی نہ ہو سکین -[1]

شعر و سخن کے علاوہ بھی اھل دھلی کے بے شمار مشاغل تھے - مثلاً گنجفہ ، پتنگ بازی ، مرغ بازی ، بٹیر بازی ، قماربازی وغیرہ جن سے فارغ اوقات مین لوگ دل بہلایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اھل اللہ کے مزارون پر جانا ، عرس مین شریک ہونا ، عالمون کی مجلس وعظ مین شریک ہونا اور مختلف میلون ٹھیلون مین جانا بھی مشاغل و تفریحات مین شامل تھا۔ نوجوانون مین ورزش اور کشتی کا شوق بھی پایا جاتا تھا۔ اکھاڑون مین جسمانی ورزش ، لکڑی ، ناوک ، پٹے اور شمشیر زنی کی مشق بھی کی جاتی تھی - برسات کی شامون اور چاندنی راتون

۱- تذکرہ مولوی ذکاء اللہ ، ص ۳۱-۳۲، سی - ایف - اینڈریوز(مترجم :ضیاء الدین برنی)

مین کبڈی کھیلنا عام تھا ۔[1]

خواجہ الطاف حسین حالی ، سرسید احمد خان کے عنفوان شباب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہین کہ سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتون مین گزرا تھا ۔ وہ راگ رنگ کی مجلسون مین شریک ہوتے تھے ۔ باغون کی سیر کو دوستون کے ساتھ جاتے تھے ۔ وہان راگ رنگ اور دعوتون اور جلسون مین شامل ہوتے تھے ۔ پھول والون کی سیر مین خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہان کی صحبتون مین شریک ہوتے تھے ۔ دلّی مین بسنت کے میلے بہار کے آغاز مین درگاہون پر ہوتے تھے ۔ سرسید وہان بھی جاتے تھے ۔ خود ان کے نانا ، خواجہ فرید کی قبر پر چوسٹھ کھمبے مین جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا ، اس مین وہ اپنے بھائیون کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے ۔ اس زمانے مین خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلّی مین تھے ۔ ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا ۔ شہر کے خواص وہان مدعو ہوتے تھے ۔ نامی گرامی گوّیے دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے ۔ میرزا ناصر احمد جو دلّی مین مشہور بین بجانے والے تھے وہ آتے تھے ۔ گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی ۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسوین کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے ۔ اس مین بڑے بڑے نامی گوّیے آتے تھے ۔ دھرپت اور خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان مین بیعت تھے بین بجانے مین اپنا کمال دکھاتے تھے ۔ ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک منفرد رئیس اور نہایت وضعدار شخص تھے ۔ جتنا نامی طوائف

---

۱ ۔ مومن دھلوی ، ص ۸۸ ، ناظر حسن

نہایت خوش آواز، دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے مین مشہور تھی ۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے صاحب کے گھر پڑ گئی تھی ۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھوین کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے ۔ شہر کے رئیس جن سے ان کی دوستی تھی بلائے جاتے تھے ۔ بڑے بڑے گویّے، بہادر خان ستارزن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے ۔ گرمی اور برسات مین دلّی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے تھے اور تیرنے والے تیرتے تھے ۔ وہاں اکثر اشراف تیرنے والون کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے ۔ تیراندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں زین العابدین خان کے مکان پر ہوتی تھین ۔[1]

۱۔ حیات جاوید، ص ۹۰۹، الطاف حسین حالی خواجہ

دوسرا باب

شیفتہ کے حالات زندگی

(الف) آباؤ اجداد ــ خاندان

۱ـ دادا اور والد کے مختصر حالات:

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے دادا، ولی داد خان، پٹھانون کے بنگش قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ـ[۱] بنگش[(*)] فارسی لفظ " بن کش ،، سے بنا ہے جس کے معنی ہین " چمڑا ادھیڑنے والا ،، ، یعنی بہادر اور جنگ جو۔ فرنٹیر مین پشتو ماحول سے متأثر ہو کر " بن کش ،، کا " بنگش ،، بن گیا ـ کوہاٹ مین بنگش قبیلے کی تاریخ کا آغاز تقریباً آٹھ سو سال پرانا ہے ـ ابتداء مین اس قبیلے کا سردار اسماعیل اصفہانی تھا جو گھریلو خانہ جنگی سے تنگ آ کر بمعہ لشکر اصفہان سے افغانستان کے راستے " قرم پارہ چنار،، وادی مین داخل ہوا اور یہ علاقہ فتح کرتا ہوا ضلع کوہاٹ کے مقام " خوشحال گڑھ،، تک پہنچا اور اس طرح وہ بمعہ لشکر اس علاقے مین آباد ہو گیا ـ بنگش ایک پہاڑی کا نام بھی پڑ گیا ـ جو لوگ " بنگش ،، کے اوپر رہتے ہین ان کو " بالا بنگش ،، اور جو

۱ـ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۱ ، (مرتب: نظامی بدایونی)

(*) نوٹ (انٹرویو ـ از) عنایت علی خان بنگش ایم ـ اے (ہسٹری) ، سینیر کمرشل آفیسر، ریلوے ہیڈکوارٹرز، لاہور ، مورخہ جولائی ۱۹۷۳ء (مقالہ نگار)

اس کے دامن مین رہتے ھین ان کو " پائین بنگش ،، کہتے ھین ۔[1]

نظامی بدایونی فرماتے ھین کہ ولی داد خان جبکہ دھلی مین خاندان بنگش کا عروج تھا کوھاٹ سے دھلی تشریف لائے اور اپنے صاحبزادے نواب مرتضیٰ خان (والد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ) کی شادی اس زمانے کے مشہور سپہ سالار اسماعیل بیگ خان ھمدانی کی صاحبزادی ، نواب اکبری بیگم صاحبہ سے کی اور جو فوج مرھٹون سے اس وقت برسر پیکار تھی اس مین عہدیدار ھوئے ۔[2] کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ھین :

" نواب مصطفیٰ خان کی والدہ مرزا اسماعیل خان کی دختر اور
احتشام الدولہ محمد بیگ خان قاطن ھمدانی کی نواسی تھین ،، ۔[3]

نظامی بدایونی کا یہ بیان کہ ولی داد خان ، بنگش خاندان کے عروج کے دور مین وارد دھلی ھوئے قابل فہم نہین ھے ۔ اسماعیل بیگ ھمدانی ، شاہ عالم ثانی(۱۷۵۳ء ۔ ۱۸۰۶ء) کے زمانے کے آدمی ھین جبکہ بنگشون کو عروج فرخ سیر (۱۷۱۳ء ۔ ۱۷۱۹ء) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء ۔ ۱۷۴۸ء) کے دور مین حاصل تھا ۔ نواب محمد خان بنگش (ف ۱۷۴۳ء) نے ۱۷۱۳ء مین فرخ آباد شہر کی بنیاد ڈالی ۔ اس ریاست مین یکے بعد دیگرے چھ نواب ھوئے ۔ محمد خان بنگش کے بعد ھی اس ریاست کا زوال شروع ھو گیا تھا ۔ دوسرے نوابین مین قائم خان بنگش (ف ۱۷۴۹ء) ، احمد خان بنگش (ف ۱۷۷۱ء) ، دلیر ھمت خان (ف ۱۷۹۶ء) ، امداد حسین (ف ۱۸۱۳ء) اور خادم حسین (ف ۱۸۲۳ء) شامل ھین ۔ نواب دلیرھمت خان

۱۔ عہد بنگش ، ص ۳۶ ، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (مرتب : محمد ایوب قادری)
۲۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۳ ، (مرتب : نظامی بدایونی)
۳۔ گلشن بے خار ، ص ۲۲ (دیباچہ) از مرتب : کلب علی خان فائق رامپوری

کے زمانے میں ریاست فرخ آباد شجاع الدولہ نواب اودھ کے ماتحت ہو گئی تھی اور پھر ۱۸۰۱-۲ء میں انگریزی حکومت کے قبضے میں آ گئی [1] ۔ اس کے بعد یہ جاگیر ۱۸۵۷ء کے طوفان میں دریا برد ہوئی [2] ۔ مس صفیہ عبدالحق صاحبہ کے مطابق :

" مغلیہ سلطنت کے آخری زمانے میں جن امراء نے ممتاز حیثیت حاصل کی اور ناموری پائی ان میں سے ایک نواب محمد خان تھے جو افغانوں کے بنگش قبیلے میں سے تھے ۔ ان کے اخلاف کو فرخ آباد (یو - پی) کی ریاست ملی ۔ نواب تفضل حسین خان اسی خاندان کے آخری رئیس تھے جن پر غدر میں باغیوں کے ساتھ شرکت کا الزام لگا ۔ ریاست ضبط ہوگئی اور نواب تفضل حسین خان کو ان کی خواہش کے مطابق حجاز بھیج دیا گیا ۔ مکّہ معظمہ میں وہ فوت ہوگئے ۔ دوسرے ممتاز امیر محمد بیگ خان ہمدانی تھے جن کی وفات پر ان کے بھتیجے نواب اسماعیل بیگ خان ہمدانی کا بڑا شہرہ ہوا ۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا باپ بنگش قبیلے سے تھا ۔ ان کی والدہ اکبری بیگم نواب اسماعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی تھیں " [3] ۔

اس کے برعکس اسماعیل بیگ ہمدانی وہ شخص ہے جو کبھی مرھٹوں کو ناک چنے چبواتا

---

۱ ۔ عہد بنگش ، ص ۱۳ ، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (مرتب: محمد ایوب قادری)
۲ ۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، ص ۱۹۹ ، ھاشمی فرید آبادی سیّد
۳ ۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم - اے) ، ص ۲۳

هے اور کبھی غلام قادر روھیلہ (ف ۵ ؍جمادی الثانی ۱۲۰۳ھ مطابق فروری ۱٧٨٩ء) کا دست و بازو بنتا ھے ۔[1] کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ھین :

" ۱۲۰۱ھ (مطابق ٨٧-١٧٨٦ء) مین اسماعیل بیگ ھمدانی اور غلام قادر روھیلہ نے مرھٹون کو بے دخل کرنے کی کوشش کی اور مسلمانون کے گروہ کے گروہ ان کے ساتھ ھو لئے، لیکن نااتفاقی کی بدولت دوبارہ مرھٹون نے شاہ عالم ثانی کو اپنا دست نگر بنا لیا(۱۲۰۳ھ مطابق ٨٩-١٧٨٨ء) ۔[2]

ان حالات مین نظامی بدایونی یا مابعد کے مضمون نگارون کا یہ کہنا درست نھین کہ ولی داد خان بنگش خاندان کے عروج کے دور مین وارد دھلی ھوئے ، کیونکہ دونون کے زمانون مین بڑا فرق ھے ۔ ھان یہ درست ھے کہ دونون کا تعلق ایک ھی قبیلے یعنی بنگش قبیلے سے تھا ۔ محمد ایوب قادری کے الفاظ مین :

" شاہ عالم ثانی (۱٨۰٦-۵۳ء) کے عھد مین ایک شخص ولی داد خان کوھاٹ سے وارد ھندوستان ھوئے ۔ انھون نے بھی یہان آ کر قسمت آزمائی کی اور اپنی ایک حیثیت بنا لی ۔[3]"

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے دادا ولی داد خان کی ترک وطن کے بعد سکونت

۱۔ جنگ آزادی ۱٨۵٧ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳٨۳ ، (محمد ایوب قادری : مرتّب) ، ولی اللہ فرخ آبادی مفتی ۔
۲۔ گلشن بے خار (مقدمہ) ، ص ۲۵ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری
۳۔ جنگ آزادی ۱٨۵٧ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳٨۳ ، (محمد ایوب قادری : مرتّب) ولی اللہ فرخ آبادی مفتی ۔

کے بارے میں مختلف روایات ھین ۔ نظامی بدایونی اور بشیرالدین احمد دھلوی فرماتے ھین[۱] کہ ولی داد خان کوھاٹ سے دھلی تشریف لائے ۔ اس کے برعکس نواب سید علی حسن خان، کلب علی خان فائق رامپوری[۲] ، مالک رام[۳]، نثار احمد فاروقی[۴] وغیرہ کے مطابق ولی داد خان فرخ آباد مین آ کر مقیم ھوئے ۔ حکیم حبیب اشعر[۵] فرماتے ھین کہ کوھاٹ سے دھلی آئے اور اپنے مقصد کو پہنچ کر فرخ آباد مین اقامت گزین ھوئے ۔

مندرجہ بالا تمام روایات مین نظامی بدایونی کی روایت کو زمانی تقدّم حاصل ھے اور یہ زیادہ وزنی بھی معلوم ھوتی ھے ۔ ویسے بھی گزشتہ صفحات مین بیان کیا جا چکا ھے کہ ولی داد خان، شاہ عالم ثانی (۱۷۵۴-۱۸۰۶ء) کے عہد مین وارد ھندوستان ھوئے۔ اس وقت ریاست فرخ آباد کا زوال ھو چکا تھا، نیز یہ کہ ولی داد خان اور نوّابان فرخ آباد مین کوئی قرابت داری بھی نہین تھی۔ ماسوائے اس کے کہ وہ بھی بنگش کہلاتے تھے اور یہ بھی ۔ محمد ایوب قادری کے بیان کے مطابق :

" ھمارے پیش نظر بنگشان فرخ آباد کی مستند تاریخین ھین : تاریخ محمد خان از حسام الدین گوالیاری، قلمی تاریخ فرخ آباد از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، قلمی لوح تاریخ از منوّر علی خان، تاریخ فرخ آباد

۱۔ واقعات دارالحکومت دھلی، حصّہ دوم، ص ۴۳۰، بشیرالدین احمد دھلوی

۲۔ صبح گلشن (بحوالہ گلشن بے خار (دیباچہ)، ص ۲۷، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری : نواب سید علی حسن

۳۔ تلامذۂ غالب، ص ۱۷۷

۴۔ رسالہ آجکل ، دھلی، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۳

۵۔ دیوان شیفتہ ، ص ۲۶۳ ، مرتبہ حکیم حبیب اشعر

از ولیم ارون (مطبع حسنی، فتح گڑھ ۱۸۷۷ء) - ان مین کہین اس امر کا انکشاف نہین ھے کہ ان کا (ولی داد خان بنگش اور محمدخان بنگش) کا خاندان ایک ھی تھا۔[1]"

ان حالات و معلومات سے یہی نتیجہ نکلتا ھے کہ ولی داد خان یعنی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے دادا (نواب مرتضیٰ خان کے والد) نے ترک وطن کے بعد دھلی ھی مین سکونت اختیار کی -

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے والد نواب مرتضیٰ خان کی تربیت اپنے والد ولی داد خان ھی کے زیر سایہ ھوئی جو خود بھی مختلف فوجی خدمات پر مامور رہ چکے تھے - چنانچہ مرتضیٰ خان اپنے والد کی نگرانی مین فنون سپہ گری حاصل کرکے راجہ جسونت راؤ ھلکر کی فوج مین شامل ھو گئے - مرتضیٰ خان بنگش کا نام تاریخ مین پہلی بار بنگش سردار کی حیثیت سے ۱۸۰۲ء مین آتا ھے - اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ اس سے پہلے وہ فنون سپہ گری کی تحصیل کر کے اپنے قبیلے کے افراد مین نمایان حیثیت حاصل کر چکے تھے اور جو لڑائیان انگریزون اور مرھٹون مین ھوئین ان مین بنگش سردار کی حیثیت سے انھون نے شمولیت کی - ان حالات کے پیش نظر کلب علی خان فائق رامپوری کا قیاس ھے کہ مرتضیٰ خان (والد مصطفیٰ خان شیفتہ) کی پیدائش ۱۷۶۷ء کے لگ بھگ ھوئی ھوگی -[2] ایک ھم عصر وقائع نگار، مولوی عبدالقادر رامپوری (ف ۱۸۳۹ء)

۱- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳۸۳

۲- گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۲۹ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

لکھتے ہین :

" نواب مرتضیٰ خان شکستہ حال مگر قسمت کے دھنی تھے ۔ ھلکر کے لشکر مین سروسامانی حاصل کرلی۔ ایک لڑائی مین انگریزی سپہ سالار کی فوج مین شامل ہوگئے ۔ نوابی کا خطاب اور تاحین حیات علاقہ پلول خرچ کے لیے مل گیا ،، ۔[1]

اسی زمانے مین لارڈ لیک نے جولائی ۱۸۰۱ء مین فوجی ذمہ داریان سنبھالین اور ہندوستانی فوج کی بہتر تربیت مین مصروف ہو گیا۔ ۱۸۰۲ء مین اس کو جنرل کا عہدہ ملا۔ ۱۸۰۳ء مین مرہٹون کے خلاف جنگ مین سندھیا سے اس کا مقابلہ ہوا اور دو ماہ کے اندر اندر کوئل کے مقام پر مرہٹون کو شکست دیتے ہوئے کامیاب ہوگیا۔ اس نے علی گڑھ پر حملہ کیا۔ دھلی اور آگرہ پر بھی قبضہ کر لیا اور یکم نومبر ۱۸۰۳ء مین لاسواری کی فتح سے ھمکنار ہوا۔[2] سندھیا کی طاقت پارہ پارہ ہو گئی اور اس کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بالآخر دسمبر ۱۸۰۳ء مین سندھیا نے صلح نامہ کے معاھدے پر دستخط کر دیئے ۔ سندھیا کے ساتھ ساتھ ھلکر کے خلاف بھی جنگ جاری رھی اور آخر کارلیک نے فرخ آباد کے مقام پر نومبر ۱۸۰۴ء مین اسے شکست دے دی ۔ اس موقع پر مرتضیٰ خان نے ھلکر کی بجائے انگریزون کی مدد کی۔ لارڈ لیک کو فتح ہوئی ۔ مرتضیٰ خان سے غیرمعمولی خدمات اور وفاداری ظہور مین آئی۔ اس لیے ان کو جاگیر و

۱۔ وقائع علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول ، ص ۳۱۳ (مرتبہ: محمد ایوب قادری)
۲۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ، گیارھوان ایڈیشن ، جلد ۱۶ ، ص ۸۵

خطاب ملا اور وہ " نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خان صاحب بہادر مظفر جنگ ،، کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔[1]

مالک رام کا یہ کہنا کہ نواب مرتضیٰ خان کو " ہوڈل پلول ،، (ضلع گوڑ گانوہ) کی جاگیر ۱۸۰۳ء میں ملی،[2] درست نہیں ہے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جاگیر نواب مرتضیٰ خان کو اواخر ۱۸۰۲ء میں ملی۔ اس جاگیر کی آمدنی تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ تھی ۔[3]

نواب مرتضیٰ خان نے ۱۸۱۳ء میں راجہ کھودس رائے کا علاقہ جہانگیر آباد نیلام میں خریدا اور گورنمنٹ سے تعلقہ داری کی سند حاصل کی ۔ یہ علاقہ عدم ادائیگی مالگذاری نیلام ہوا تھا ۔[4] لہذا نظامی بدایونی، بشیرالدین احمد دہلوی اور دیگر تذکرہ نگاروں کا یہ کہنا کہ متذکرہ علاقہ ۱۸۱۳ء میں خریدا گیا درست نہیں ہے ۔ ایک اور جگہ نظامی بدایونی فرماتے ہیں :

" نواب صاحب کی رحلت کے بعد ہوڈل پلول کے علاقے کو گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اس کے عوض میں اراکین خاندان کی پنشن مقرر کر دی جو غدر ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ نواب مرتضیٰ خان صاحب نے جہانگیرآباد کا علاقہ اپنی حیات میں صاحبزادہ مصطفیٰ خان کے نام منتقل کر دیا تھا جو ان کے

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳۸۵، محمد ایوب قادری

۲۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۷۷، مالک رام

۳۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۲۷ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۴۔ گزیٹیر ضلع بلند شہر، ص ۳۳۹ (بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) (واقعات و شخصیات، ص ۳۸۶، محمد ایوب قادری)

بعد ان کی اولاد کی ملکیت میں آیا،، ۔[1]

مالک رام فرماتے ھیں کہ جب نواب مرتضیٰ خان کی وفات ھوئی تو ھوڈل پلول کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا ، لیکن گزشتہ خدمات کا خیال کرتے ھوئے خاندان کی بیس ہزار روپیے سالانہ زر نقد کی صورت میں پنشن مقرر کر دی ۔[2]

۱۸۱۷ء کے واقعات سے پتہ چلتا ھے کہ نواب امیر خان والئ ٹونک نے جب انگریزوں سے مصالحت کرنا چاھی تو اس نے سنبھل کا علاقہ جاگیر میں لینا چاھا ۔ انگریزوں نے پلول کا علاقہ پیش کر کے صرف ڈیڑھ لاکھ روپیے سالانہ حاصل اس کا محمد وزیر خان کے نام کر دیا ۔[3] (محمد وزیر خان ، نواب محمد امیر خان والئی ٹونک کے بیٹے ھیں : بحوالہ نقوش ، آپ بیتی نمبر ، جون ۱۹۶۴ء ، ص ۱۲۶۶) ۔ یہاں سے ظاھر ھوتا ھے کہ ۱۸۱۷ء میں انگریزوں نے پلول کا علاقہ نواب مرتضیٰ خان کی وفات پر اپنے قبضے میں لے لیا تھا ۔ اس طرح نواب مرتضیٰ خان کا سن وفات ۱۸۱۷ء یا اس کے قریب قریب قیاس کیا جا سکتا ھے ۔

نواب مرتضیٰ خان کی وفات کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ھے کہ ایک رات وہ بالاخانے کی چھت پر سو رھے تھے کہ اتفاق سے آندھی آ گئی ۔ جب آنکھ کھلی تو آپ نے اندر جانے کا ارادہ کیا ۔ اندھیرے اور نیند کے غلبے میں اندر جانے کی بجائے باھر

---

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۳ ، مرتبہ : نظامی بدایونی
۲ ۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۷۷ ، مالک رام
۳ ۔ سید احمد شہید ، ص ۱۰۷ ، غلام رسول مہر مولانا

کو بھاگے اور دو منزلہ سے نیچے گر پڑے ۔ سخت چوٹ آئی ۔ بہتیری تدبیرین اور علاج ہوئے مگر فائدہ نہ ہوا اور راہیٔ ملک عدم ہوئے [1]۔

کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین کہ اسماعیل بیگ خان ہمدانی کی دختر اکبری بیگم سے مرتضیٰ خان کی شادی ہوئی تو ان مین سے دو لڑکے محمد مصطفیٰ خان اور محمد اکبر خان اور دو لڑکیان پیدا ہوئین ۔ مرتضیٰ خان نے اس شادی سے پہلے یا بعد ایک اور شادی بھی کی جس سے دو بیٹے ارتضیٰ خان اور محمد امیر خان اور دو لڑکیان یادگار ہین غالباً محمد حسن نامی بیٹا بھی اسی بیوی سے تھا [2]۔ محمد اکبر خان بھی شاعر تھے ۔ اکبر تخلّص کرتے تھے اور مومن کے شاگرد تھے ۔ شیفتہ گلشن بےخار مین لکھتے ہین :

" اکبر ۔ تخلّص اکبر خان ۔ کہین برادر داعی آثم بہ اکثر صفات حسنہ متّصف است، از کمتر ایام رغبتے بہ شعر پیدا کردہ، از حضرت مومن استفادہ می کند " [3]۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات مین کہتے ہین کہ نواب اکبر خان کا چار برس ہوئے راولپنڈی مین انتقال ہوگیا [4]۔ اس طرح نواب اکبر خان کا سال وفات ۱۸۷۶ء کے آس پاس قیاس کیا جا سکتا ہے کیونکہ آب حیات پہلی بار ۱۸۸۰ء مین طبع ہوئی [5]۔

۱۔ وقائع علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اوّل، ص ۳۱۳، مرتّبہ محمد ایوب قادری

۲۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۲۹ ، کلب علی خان فائق رامپوری (مرتّب)

۳۔ ایضاً ص ۵۰

۴۔ آب حیات ، ص ۳۱۵

۵۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص ۲۰۹، فرمان فتح پوری ڈاکٹر

شاگردان مومن کا ذکر کرتے ہوئے کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین کہ اصغر علی خان اصغر، شیفتہ کے بہنوئی تھے - نواب شیفتہ مرحوم کی چھوٹی ہمشیرہ ، صاحبزادہ اصغر علی اصغر خان صاحب برادر زادہ نواب جنت آرام گاہ (محمد سعید خان) سے منسوب ہوئی تھین - اس وقت سے نواب شیفتہ مرحوم اور ریاست رامپور مین باہم مراسم قائم ہوگئے - شیفتہ کے اس قریبی رشتے کی وجہ سے اصغر کو مومن سے اور بھی قربت حاصل تھی - اصغر کی جوان مرگی سے اس کا کلام معراج کمال پر نہ پہنچ سکا -[1]

نظامی بدایونی نواب مرتضیٰ خان کو انگریزی دور کے سات بااختیار رئیسون مین بتاتے ہین -[2] یہ بیان کسی غلط فہمی پر مبنی ہے - سات جاگیردار رئیسون کے متعلق مرزا غالب (ف ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء) اپنے ایک خط مین انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد میر مہدی مجروح (ف ۱۹۰۳ء) کو لکھتے ہین :

" نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵/دسمبر کو یہان داخل ہون گے - دیکھیے کہان اترتے ہین اور کیونکر دربار کرتے ہین - آگے کے دربار مین سات جاگیردار تھے - ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا - جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ ، فرخ نگر، دوجانہ ، پاٹودی ، لوھارو - چار معدوم محض ہین - باقی جو رہے ان مین سے دوجانہ و لوھارو تحت حکومت ھانسی و حصار- پاٹودی حاضر - اگر ھانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونون کو یہان لے آئے تو تین

۱- مومن ، ص ۱۳۰ ، کلب علی خان فائق رامپوری

۲- کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۳ ، مرتبہ نظامی بدایونی

رئیس ورنہ ایک رئیس ۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود ۔ اھل اسلام مین سے صرف تین آدمی باقی ھین ۔ میرٹھ مین مصطفیٰ خان، سلطان جی مین مولوی صدرالدین خان، بلّی ماران مین سگ دنیا موسوم به اسد ۔ تینون مردود و مطرود، محروم و مغموم ۔" (۲ دسمبر ۱۸۵۹ء)[1]

محمد ایوب قادری کے بیان کے مطابق نواب مرتضیٰ خان نے دھلی مین ایک شاندار حویلی بنوائی تھی ۔[2] لیکن بشیر احمد دھلوی نے الگ الگ دو حویلیون کا ذکر کیا ھے[3]:

" نواب مصطفیٰ خان کی حویلی: چھیا میم کے چھتے مین سیدھی طرف بہت اچھا مکان اور کمرہ نواب صاحب کا تھا جو اس کے بانی کی رفعت اور شان کو بتلاتا تھا لیکن اب کچھ نہین رھا ۔ متفرق چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ھین ۔ ایک ھی کوچے کے دو نام ھین ۔ کوئی چھیا میم کا چھتہ کہتا ھے کوئی نواب مصطفیٰ خان کی حویلی ۔ حویلی نواب مصطفیٰ خان: نواب مصطفیٰ خان کی ایک حویلی تو چوھیا (چھّیا) میم کے چھتے مین تھی ۔ وہ تو رھی نہین ۔ مگر چیلون کے کوچے مین ایک بڑی بھاری حویلی نواب مصطفیٰ خان کے نام سے مشہور ھے ۔"[4] (*)

۱۔ خطوط غالب، جلد اول، ص ۳۶۸-۳۶۹، پنجاب یونیورسٹی لاھور

۲۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، ص ۳۸۷، محمد ایوب قادری

۳۔ واقعات دارالحکومت دھلی، جلد دوم، ص ۱۵۲، بشیر احمد دھلوی

۴۔ ایضاً ص ۱۷۲

(*) نوٹ: محمد ایوب قادری کو شاید اس لیے اشتباہ ھوا ھے کہ نواب صاحب کی ایک حویلی برباد ھو چکی تھی ۔ (مقالہ نگار)

فرحت اللہ بیگ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی رہائش کے بارے میں کہتے ہیں :

"چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ رہتے ہیں ۔"[1]

۲۔ ولادت:

آپ کا پورا نام محمد مصطفیٰ خان ہے ۔ شیفتہ (اردو) اور حسرتی (فارسی) تخلص ہیں ۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے سن ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ نظامی بدایونی ۱۸۰۲ء بتاتے ہیں ۔[2] اکثر تذکرہ نگاروں اور مضمون نگاروں نے یہی لکھا ہے ۔ کسی نے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی اختلاف کرتے ہوئے ۱۸۰۹ء بتاتے ہیں لیکن انھوں نے بھی کسی دلیل سے کام نہیں لیا ۔[3] کلب علی خان فائق رامپوری بھی ۱۸۰۹ء بتاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ شیفتہ کے اپنے بیان سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں ۔[4] اس بات پر کہ شیفتہ دہلی میں پیدا ہوئے سب کا اتفاق ہے ۔ شیفتہ کے بیان "گلشن بے خار" میں درج ہے :

۱۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ (دہلی کی آخری شمع) ، ص ۳۸

۲۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۳ ، نظامی بدایونی

۳۔ تحقیق کی روشنی میں، ص ۲۰ ،

۴۔ گلشن بے خار (مقدمہ از شیفتہ) ، ص ۳۰ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

" ابتدائے این کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دو صد و چہل و ہشت

از ہجرت بودہ و انتہا در انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ ------

و امروز اشہب تیزگام عمر روان بست و شش مرحلے طے کردہ ۔[1]"

"گلشن بے خار" ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۵/۳۶ء) مین تالیف ہو چکا ہے اور شیفتہ

کی عمر بھی چھبّیس سال ہوگئی ہے ۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ ان کا سال ولادت ۱۸۰۹ء

ہوا ۔

اسی طرح شیفتہ کا اپنا بیان جو کلیات مین بطور دیباچہ درج ہے ، مندرجہ

بالا بیان کی مزید تصدیق کرتا ہے ۔ بیان یہ ہے :

" کہ در سال شانزدہم نیروئے سخن گوئی دادند ، شہوا بیادی برتر

از عادت بخشیدند و در بست و سوم بال اعراض کرامت کردند و یک بارہ

دل ازین شغل بر گرفتند و ہر دو بارگران بار منت نہادند و آن روز

بر ہزار و دو صد چہل افزون بود و امروز بر چہل ہفت افزون است ۔[2]"

شاعری کا آغاز کیا تو ۱۲۳۰ھ تھا اور اب جب ۲۳/سال کی عمر مین یہ شغل

بند کر دیا ہے تو ۱۲۴۷ھ ہے ۔ ان ہر دو صورتون سے بھی شیفتہ کا سن ولادت

۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء ہی بنتا ہے ۔ اس پوری بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ نواب محمد

مصطفیٰ خان المتخلّص بہ شیفتہ و حسرتی بمقام دہلی ۱۸۰۹ء مین پیدا ہوئے ۔

---

۱ ۔ گلشن بے خار (مقدمہ از شیفتہ) ، ص ۹ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲ ۔ کلیات شیفتہ (مقدمہ از شیفتہ) ، ص ۳۸ ، مرتّب کلب علی خان فائق رامپوری

۳- تعلیم و تربیت :

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اکثر تذکرہ نگاروں اور مضمون نگاروں نے نظامی بدایونی کے بیان ہی کو ذرا آگے پیچھے کرکے نقل کر دیا ہے -

شیفتہ کے دور کے امراء کا معمول تھا کہ ان کے مکان پر بچوں کی تعلیم کے لیے استاد آتے تھے اور محلّے کے دوسرے بچے بھی (جو شرفاؑ کے ہوتے) پڑھتے تھے - ان کی تعلیم بھی اسی انداز میں ہوئی -[۱] یعنی شیفتہ نے زمانۂ طفلی میں کسی مکتب یا مدرسے میں جا کر تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ جو کچھ حاصل کیا اساتذہ کی توجہ سے گھر پر ہی کیا-

نظامی بدایونی فرماتے ہیں[۲] کہ شیفتہ نے میاں جی مالا مال سے جو دہلی کے ایک مشہور بزرگ اور سربرآوردہ معلّمین میں تھے فارسی ، عربی اور علوم مروّجہ حاصل کئے - حضرت مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے بھی جو جامع علوم ظاہر و باطن تھے، خاص کر فن حدیث و تجوید میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، شیفتہ نے حدیث و قراءت میں استفادہ کیا- حاجی محمد نور صاحب کا مزار سورت میں ہے - جب آپ دوبارہ بارادۂ حج جا رہے تھے تو راستے میں بمقام سورت شعبان ۱۲۵۲ھ (مطابق ۳۷-۱۸۳۶ء) میں

۱- گلشن بے خار (مقدمہ) ص ۳۱، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲- کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۴ ، مرتّبہ نظامی بدایونی

وصال ہوا ۔ میاں جی مالامال کا مزار دہلی میں حضرت سلطان الاولیاء رحمت اللہ علیہ کی درگاہ میں نواب صاحب کے سرہانے ایک چھوٹے چبوترے پر واقع ہے ۔ مالک رام[1] میاں جی مالامال کے ساتھ حاجی نور محمد دہلوی کا ذکر بھی شیفتہ کے استادوں میں کرتے ہیں ۔ محمد ایوب قادری[2] میاں جی مالامال کے ساتھ محمد نور محمد نقشبندی اور مولوی کرم اللہ دہلوی کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ مولانا عبدالحی[3] نے بھی مولوی نور محمد کا ذکر کیا ہے ۔ کلب علی خان فائق رامپوری کا بیان ذرا مختلف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" مولانا نظامی نے کہا ہے کہ ان (شیفتہ) کے استاد میاں جی مالا مال دہلوی اور مولوی محمد نور نقشبندی تھے، اور کچھ مولوی کرم اللہ محدّث سے بھی پڑھا تھا ۔ ہم میاں جی مالا مال کی شخصیت کا پتہ نہیں چلا سکے، نہ ہی مولوی محمد نور نقشبندی کا احوال دہلی کے تذکروں میں ملا ہے ۔ البتہ مومن نے ایک قطعۂ تاریخ وفات میں محمد نور صوفی کا ذکر کیا ہے ۔ ممکن ہے ان سے بھی کچھ پڑھا ہو ۔ البتہ مولوی کرم اللہ محدّث دہلوی اپنے زمانے کے جیّد علماء میں شمار ہوتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے " تفسیر عزیزی " ان ہی کے لئے

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۷۸

۲۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۸۸-۳۸۷

۳۔ گل رعنا ، ص ۳۲۰

لکھی تھی ۔ علوم متداولہ میں ان کا ثانی نہ تھا۔ مگر وہ درویش سیرت تھے ۔ ایک حج کرنے کے بعد دوسرے حج کا ارادہ کیا کہ شعبان ۱۲۵۲ھ (مطابق ۳۷-۱۸۳۶ء) میں سورت میں انتقال کر گئے۔ شیفتہ نے تکمیل علوم انھی سے کی ہوگی۔ (بحوالہ حقیقت السورت مرتبہ شیخ بہادر عرف شیخو میاں، مطبع شہابی بمبئی ۱۳۱۵ھ (۹۸-۱۸۹۷ء) –[۱]،،

جہاں تک محمد نور صوفی کی وفات پر مومن کے قطعہ[۲] کا تعلق ہے کلب علی خان فائق رامپوری کو سہو ہوا ہے ۔ مومن نے قطعہ تاریخ وفات خلیفہ نور محمد کے لیے کہا ہے اور سال وفات ۱۲۵۹ھ نکالا ہے ۔ نظامی بدایونی نے جن نور محمد کا ذکر کیا ہے ان کا سال وفات ۱۲۵۲ھ ہے اور مقام مزار، سورت بتایا ہے، جہاں وہ دوبارہ بارادۂ حج جاتے ہوئے فوت ہوئے ۔ نظامی بدایونی یہ بھی کہتے ہیں کہ شیفتہ نے مولوی کرم اللہ محدث دہلوی سے بھی کچھ پڑھا۔ کلب علی خان خان فائق رامپوری کے مطابق مولوی کرم اللہ محدّث دہلوی بھی دوبارہ بارادہ حج جاتے ہوئے شعبان ۱۲۵۲ھ میں فوت ہوئے اور ان کا مزار بھی سورت میں ہے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نظامی صاحب نے " محمد نور،، اور " کرم اللہ محدّث ،، کو خلط ملط کر دیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شیفتہ نے کرم اللہ محدّث دہلوی سے بھی استفادہ کیا جن کا انتقال سورت میں بارادہ حج جاتے ہوئے شعبان ۱۲۵۲ھ میں ہوا اور محمد نور سے بھی جو دراصل مومن خان مومن کے

۱۔ گلشن بے خار (مقدمہ) ، ص ۳۱، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ کلیات مومن، جلد دوم، ص ۱۸-۱۱۷ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

قطعہ تاریخ وفات کے مطابق " خلیفہ نور محمد " ہیں اور جن کا انتقال ۱۲۵۹ھ میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیفتہ نے دونوں سے الگ الگ استفادہ کیا۔ رہا میان جی مالا مال کا تعلق ان سے بھی ابتداء میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔

جملہ تذکرہ نگار اور مضمون نگار متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ شیفتہ نے دوران حج شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی سے علوم دینی میں استفادہ کیا اور روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اس ضمن میں نظامی بدایونی کا بیان جسے زمانی تقدّم بھی حاصل ہے، درج ذیل ہے :

" ۱۲۵۵ھ (مطابق ۳۰-۱۸۳۹ء) جبکہ آپ کو حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی مکّہ معظمہ کے فاضل اجل عالم باعمل حضرت شیخ عبداللہ سراج حنفی سے آپ نے " صحاح " کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے ۔ جب تک مکّۃ معظمہ میں قیام رہا آپ برابر ان سے فیض حاصل کرتے رہے ۔ مدینہ منوّرہ میں شیخ محمد عابد سندھی سے اکثر حدیث کی کتابوں کے خاص خاص مقامات پڑھے اور روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔[1] "

کلب علی خان فائق رامپوری مزید فرماتے ہیں :

" علوم درسیہ کی تحصیل کے ساتھ ساتھ (مصطفیٰ خان شیفتہ نے) فنون سپہ گری بھی سیکھے ۔ شہسواری اور تیر اندازی کا شوق تھا۔ علوم ریاضی

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۵ ، مرتبہ نظامی بدایونی

مین دلچسپی کے باعث علم اصطرلاب پر بھی نظر تھی۔[۱]،،

۴۔ ازدواج و اولاد:

مالک رام کے مطابق[۲] شیفتہ نے دو نکاح کیے تھے ۔ پہلی بیوی سے محمد علی خان رشکی پیدا ہوئے اور دوسری بیوی افضل بیگم سے دو لڑکے نقش بند خان اور محمد اسحق خان ہوئے ۔ نواب اسمعیل خان صاحب (نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے پوتے) ایک خط مورخہ ۱۹/جنوری ۱۹۵۰ء (از مصطفیٰ کاسل، میرٹھ) بنام ص صفیہ عبدالحق کے مطابق بھی شیفتہ نے دو شادیاں کین ۔ وہ رقمطراز ہین:

" نواب مصطفیٰ خان مرحوم کی شادی نواب ولی داد خان والئی مالا گڑھ کی بہن سے ہوئی تھی اور نواب شیفتہ کی بہن کی شادی ولی داد خان سے ہوئی تھی ـــ نواب شیفتہ نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد حج سے واپسی پر دوسری شادی افضل زمانی بیگم سے کی۔ وہ شیر علی خان دیوان کپورتھلہ کی صاحبزادی تھین۔[۳]،،

کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین:

" ـــ اب شیفتہ ہی خاندان کے بزرگ تھے ۔ زندگی کا رخ سفر حج

۱۔ گلشن بے خار (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۵، مرتّبہ نظامی بدایونی
۲۔ تلامذۂ غالب، ص ۸۵
۳۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم ۔ اے)، ص ۳

سے تبدیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ پاکبازی سے زندگی بسر کرنے لگے ۔ ۱۲۵۸ھ

(مطابق ۴۳-۱۸۴۲ء) کے آخر یا ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) کے آغاز مین انھون

نے شادی کرلی۔ محمد علی خان اسی بیوی سے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) مین پیدا

ہوئے ۔ دوسری شادی انھون نے مسماۃ افضل بیگم سے ۱۲۶۷ھ (۵۱-۱۸۵۰ء)

کے متصل کی۔[1]،،

یہ تو واضح ہے کہ شیفتہ نے دو شادیان کین ۔ لیکن کب ؟ یہ بات وضاحت طلب

ہے ۔ نواب اسمعیل خان صاحب کے مطابق شیفتہ نے پہلی شادی سفر حج سے پہلے کی

اور دوسری بعد مین ۔ کلب علی خان فائق کے مطابق انھون نے دونون شادیان سفر حج

کے بعد کین۔ اس ضمن مین نواب اسمعیل خان صاحب کے بیان کو واقعات و حقائق سے

تقویت نہین ملتی اور کلب علی خان فائق کی بات درست معلوم ہوتی ہے ۔ پہلی بات تو

یہ کہ نواب محمد علی خان رشکی، کلب علی خان فائق کے مطابق ۱۸۴۳ء مین اور مالک رام[2]

کے مطابق ۱۸۴۴ء مین پیدا ہوئے ۔ یہ شیفتہ کے سب سے بڑے بیٹے ہین جو پہلی بیوی

سے ہین ۔ دوسری بات یہ کہ شیفتہ اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ ذی الحجۃ ۱۲۵۴ھ (م ۱۸۳۹ء)

حج کے لیے سدھارے اور تقریباً دو سال کے بعد ذی الحجۃ ۱۲۵۶ھ (م ۱۸۴۱ء) مین دھلی

واپس پہنچے ۔ مان اور نانی دونون ھی حج کے دوران وفات پا چکی ہین ۔[3] تیسری بات کہ

۱۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۳۲ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۱۷

۳۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ص ۳۲ ، کلب علی خان فائق رامپوری

حج پر روانہ ہونے سے پہلے شیفتہ عشق مجازی مین مبتلا رہ چکے ہین اور یہ سلسلہ ۲۹-۱۸۲۸ء سے ۳۹-۱۸۳۸ء تک جاری رہا ہے - شیفتہ عشق مجازی مین ناکامی کے صدمے سے دل برداشتہ ہین - نانی اور والدہ کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہین آتا کہ ان کو سفر حج کے لیے آمادہ کرین اور خود بھی اس سفر مین شریک ہون - کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین :

" شیفتہ کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا --- غالباً شیفتہ نے مان اور نانی کی اس تجویز کو درخور اعتنا نہ سمجھا کہ کسی موزون خاندان مین شادی کر لینا چاہیے - ان کی یہ حالت دیکھ کر مان اور نانی نے کہا کہ ہمین حج کرا دو- ظاہر ہے کہ شیفتہ مان اور نانی کی اس آرزو کو ٹھکرا نہین سکتے تھے --- ۱۰/ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹ء) کو سفر حج کی تیاری کر کے ایک قافلے کے ساتھ دھلی سے نکل کھڑے ہوئے --- فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مان اور نانی ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) مین دنیا سے چل بسین--- ۲۳/ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ (۴۲-۱۸۴۱ء) دھلی مین داخل ہوئے - واپسی پر احباب نے گرمجوشی سے خیرمقدم کیا -[1] "

دوسری بیوی سے پہلے بیٹے کا نام نواب نقش بندخان تھا- انھون نے ۱۸۷۷ء مین انتقال کیا-[2] نقش بند کا انتقال " صبح گلشن " کی روایت کے مطابق ۲۵ سال کی عمر مین

۱- گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۳۲ ، کلب علی خان فائق رامپوری

۲- نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم - اے) ، ص ۲۶ ، صفیہ عبدالحق س

۲۸/شوال ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) کو ھوا ، لیکن اخبار لش گزٹ دھلی (جلد ۲ ، شمارہ ۲۱ ، مورخہ ۷/ نومبر ۱۸۷۷ء روز چہارشنبہ) مین یہ خبر ملتی ھے کہ نواب محمد نقش بند خان کا انتقال گیارہ بجے دن کے عین عالم شباب مین ۲۳ برس کی عمر مین ھوا[1] ۔ اسطرح نواب نقش بند خان کا سال ولادت ۱۸۵۳ء یا ۱۸۵۲ء بنتا ھے ۔ لھذا قیاس کیا جا سکتا ھے کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے دوسری شادی ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۳ء کے دوران کی ھوگی۔

مندرجہ بالا واقعات و حالات کی روشنی مین یہ کہنا کہ شیفتہ نے سفر حج پر جانے سے پیشتر شادی خانہ آبادی کی تھی ناقابل فہم ھے ۔ یقیناً نواب اسمعیل خان صاحب کو غلط فہمی ھوئی ھے ۔ درست یہی ھے کہ شیفتہ نے سفر حج سے واپسی پر ھی اپنا گھر آباد کیا۔

نواب محمد اسماعیل خان صاحب کے مطابق :

" اس بیگم (پہلی بیوی) سے ایک فرزند نواب محمد علی خان تھے ۔ افضل زمانی بیگم (دوسری بیوی) سے کئی بچے پیدا ھوئے مگر دو لڑکے اور دو لڑکیان طبعی عمر کو پہنچین ۔ پہلے لڑکے کا نام نقش بند خان تھا --- ان کے دوسرے حقیقی بھائی کا نام حاجی محمد اسحق خان تھا --- دونوں بیٹیون کا عقد بھوپال مین نواب شاھجہان بیگم صاحبہ کے برادر خورد کے فرزندون سے ھوا تھا ۔"[2]

۱۔ آجکل دھلی ، جنوری ۱۹۶۳ء (شیفتہ کا ایک غیرمطبوعہ خط مومن خان مومن کے نام -- نثار احمد فاروقی) ، ص ۳

۲۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم ۔ اے) ص ۲۲ ، صفیہ عبدالحق س

بقول مالک رام :

" پہلی بیگم سے صرف ایک صاحبزادہ جناب محمد علی خان رشکی ہوئے۔۔۔ جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقش بند خان اور نواب محمد اسحق خان اور دو صاحبزادیاں۔" [1]

کلب علی خان فائق رامپوری (تذکرہ صبح گلشن تالیف سید علی حسن خان ، تلخیص و ترجمہ شاہ عطاء الرحمن کاکوی، صفحات ۲۷ تا ۲۹ مطبوعہ پٹنہ ، بھارت) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں :

"۔۔۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں انتقال کیا۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑے۔ بڑے محمد علی خان محل اولیٰ سے تھے اور دونوں بہنوں اور ماں مسمی (مسماۃ) افضل بیگم کے ساتھ ملکۂ بھوپال کی ملازمت میں داخل ہوئے۔" [2]

نثار احمد فاروقی کے مطابق :

" اولاد میں پہلی بیوی سے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہوئے جن میں سب سے بڑے محمد علی خان رشکی تھے ۔ دوسری زوجہ کے بطن سے نقش بند خان اور محمد اسحاق خان نیز دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔" [3]

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۸۵

۲۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۲۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۳۔ آج کل ، جنوری ۱۹۶۳ء ، ص ۳

سید خضر برنی فرماتے ھین :

"--- (نواب مصطفیٰ خان شیفتہ) تین صاحبزادے اور دوصاحبزادیان یادگار چھوڑین --- شیفتہ کی دونون صاحبزادیان ثروت اور سرت (جن کے عقد بھوپال کے شاہی خاندان مین ھوئے) بھی صاحب دیوان تھین۔"[۱]

نثار احمد فاروقی کا بیان کہ پہلی بیوی سے دو صاحبزادیان اور تین صاحبزادے ہوئے قابل تسلیم نہین ھے ، کیونکہ نہ تو انھون نے کوئی حوالہ ھی دیا ھے اور نہ اس بات کی کہین سے تصدیق ھی ھوتی ھے ۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ شیفتہ کی پہلی بیوی سے محمد علی خان رشکی اور دوسری بیوی سے نقش بند خان ، محمد اسحق خان اور ثروت و سرّت صاحبزادیان یادگار ھین ۔ غالب نے حکیم نجف خان کو شنبہ ۳/ ذی قعد ۱۲۸۱ھ (اپریل ۱۸۶۵ء) کو ایک خط لکھا جس مین وہ کہتے ھین :

" نواب مصطفیٰ خان کل شہر مین آ گئے ۔ مع قبائل آئے ھین ۔ ذیعقد مین چھوٹے لڑکے کی ختنہ اور ذی الحجۃ مین محمد علی خان کی شادی کرین گے۔"[۲]

۱۔ نگار ، مئی ۱۹۶۰ء ، جلد ۱۷ ، شمارہ ۵ ، ص ۲۱

۲۔ خطوط غالب حصّہ دوم ، ص ۸۰ ، مرتبہ غلام رسول مہر مولانا

نواب محمد علی خان رشکی :[1]

نواب محمد مصطفیٰ خان کے سب سے بڑے بیٹے، پہلی بیوی سے ۱۸۲۳/۲۲ء مین پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی مین گھر پر ہوئی ۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ سے عربی پڑھی ۔ بعد مین انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے ۔ یہ بھی جہانگیر آباد مین حالی کی اتالیقی مین رہے ۔ والد کی وفات کے بعد جاگیر کے وارث ہوئے ۔ ضلع بلند شہر مین انھین مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے ۔ ۱۸۹۰ء مین صوبجات متحدہ کی طرف سے واشرائے کی کونسل کے رکن نامزد ہوئے ۔ ۱۸۹۵ء مین خان بہادری اور نوابی کے خطابات ملے ۔ ۳/مئی ۱۸۹۵ء کو ریاست رامپور کی انتظامی کونسل کے رکن مقرر ہوئے اور یکم جون ۱۸۹۲ء کو سکبدوش ہوئے ۔ رشکی ۲۰/مئی ۱۸۹۹ء (۹/محرّم ۱۳۱۷ھ) کو کاربنکل سے لاولد فوت ہوئے ۔ اپنے والد کے پہلو مین سلطان جی مین مدفون ھین ۔

اردو فارسی دونون زبانون مین شعر کہتے تھے ۔ ان کا ایک مشہور شعر ھے ؎

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا　　　ھر مدعی کے واسطے دارورسن کہان

میر مہدی مجروح نے قطعہ تاریخ لکھا ۔ تاریخ کا شعر ھے ؎

پئے سنین وفاتش خرد بمن فرمود　　　بگوئے " رفت ز دنیا امیر ابن امیر "

مولانا حالی کی کہی ہوئی تاریخ وفات مین مادۂ تاریخ " بخشش زحق " ھے ۔ ادھون نے ایک قطعہ بھی کہا جو ان کے دیوان مین شامل ھے ۔

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۱۷-۱۲۰ ، مالک رام

نواب نقش بند خان[1]: یہ نقش بندخان ہی تھے جن کے لیے حالی مقرر ہوئے ۔ یہ شعر بھی کہتے تھے ۔ مہجور تخلص تھا ۔ ان کا انتقال ۲۳ یا ۲۵ برس کی عمر میں ۵/ نومبر ۱۸۷۷ء (۲۸/ شوال ۱۸۹۳ھ) کو ہوا ۔ حالی نے تاریخ کہی ۔ دخلوا اساور من فضۃ (سورہ دھر)

نواب محمد اسحق خان[2]: ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ آگرہ کالج سے اوّل درجے میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۲۳ سال کی عمر میں سول سروس کے لیے انتخاب ہوا اور ضلع مظفرنگر میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ مقرر ہوئے ۔ پھر ترقی کر کے مستقل طور پر سیشن جج کے عہدے پر پہنچے ۔ پانچ سال تک ریاست رامپور میں مدارالمہام رہے ۔ ۱۹۱۳ء میں نواب وقار الملک کے مستعفی ہونے پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے آنریری سیکریٹری منتخب ہوئے۔ اسی زمانے میں ۱۹۱۷ء میں حضور نظام عثمان علی خان محمڈن کالج علی گڑھ میں تشریف فرما ہوئے ۔ یونیورسٹی میں عثمانیہ ہوسٹل کی رفیع الشان عمارت اسی دور ہمایون کی یادگار ہے ۔ کالج کی مسجد کی تکمیل بھی نواب صاحب کے زمانے میں ہوئی۔ نواب محمد اسحق کا سب سے بڑا کارنامہ امیر خسرو (۷۲۵ھ م ۱۳۲۵ء) کی مثنویات اور دیگر تصانیف کو تحقیق و تفتیش اور صحت کے ساتھ

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۸۵ ، مالک رام

۲۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ، ص ۸۸ ، الطاف علی بریلوی سید و محمد ایوب قادری پروفیسر

طبع و شائع کرانا ھے ۔ جس کی وجہ سے نواب محمد اسحق کا نام علمی دنیا مین ھمیشہ یادگار رھے گا۔ ۱۹۱۷ء مین حرکت قلب بند ھو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ھوگیا ۔ نعش میرٹھ سے دھلی پہنچائی گئی اور درگاہ نظام الدین اولیاؒ مین اپنے بزرگون کی پٹواڑ مین دفن ھوئے ۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صاحبزادیان: گزشتہ صفحات مین ذکر کیا جا چکا ھے کہ دونون بیٹیان محترمہ ثروت اور محترمہ عزّت شاعرہ تھین اور دونون صاحب دیوان تھین ۔ ان کا عقد بھوپال مین نواب شاھجہان بیگم صاحبہ کے چھوٹے بھائی کے بیٹون سے ھوا تھا۔

شجرۂ نسب:[۱] نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی اولاد کا شجرۂ نسب دوسرے صفحے پر درج کیا گیا ھے ۔

۱۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم ۔ اے) ، ص ۳ ، صفیہ عبدالحق مس

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

نواب محمد علی خان رشکی — نواب نقش بند خان

نواب محمد اسحق

نواب زادہ ابراھیم خان — نواب علاؤ الدین خان

(*)
نواب محمد اسمعیل خان

غلام احمد خان مدنی — اکرام احمد خان — افتخار احمد خان

(*) نوٹ: نواب محمد اسمعیل خان، بیرسٹر، نواب محمد اسحق خان کے بڑے صاحبزادے تھے ۔ آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر، صوبۂ متحدہ کی مسلم لیگ کے صدر اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے وائس چانسلر رھے ۔ (بحوالہ مخزن جلد ۳، نمبر۴، اپریل ۱۹۵۰ء، لاھور۔ مضمون: شیفتہ کی شخصیت اور شاعری پر ایک نظر، از بدرالحسن اختر بدایونی) ---

نواب محمد اسمعیل خان، جو نواب محمد مصطفیٰ خان کے پوتے ھیں، کی اولاد کے سلسلے میں ھماری معلومات کا ذریعہ محترمہ بیگم اختر محمد خان، دختر نواب محمد اسمعیل خان صاحب مرحوم و مغفور کا وہ گرامی نامہ (از میرٹھ، مصطفیٰ کاسل، مورخہ ۵- جنوری ۱۹۷۷ء) ھے جو مقالہ کے استفسار کے جواب میں انھوں نے از راہ نوازش ارسال فرمایا تھا ۔

(ب) مجلسی زندگی کے مختلف پہلو:

۱۔ روداد عشق مجازی :

عابد علی فرماتے ہین[1] کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے زہد و اتقا کے متعلق اکثر مورخ ہم نوا ہین ۔ سوائے کچھ تذکرہ نگارون کے کسی نے ان کے اس مشہور معاشقے کا ذکر نہین کیا جس کی بنا پر شیفتہ کے مخالف تذکرہ نویسون نے ان کو طرح طرح بدنام کیا ہے ۔

دوسرے تذکرہ نگارون سے قطع نظر شیفتہ نے " گلشن بے خار ،، مین جوکچھ نزاکت (رمجو نام) کے متعلق لکھا ہے اسی سے ان کی شیفتگی کا ثبوت ملتا ہے ۔ اس مین انھون نے نزاکت کی شاعری کے بارے مین کم اور اس کے فن و جمال ، خدو خال ، سن و سال ، جان نوازی و دلبری ، محاسن ظاہری و باطنی کی نہایت والہانہ انداز مین تعریف کی ہے ۔ انھی کے الفاظ مین :

" نزاکت: تخلص مہ جلوہ ، مہر تمثال ، نادرالحسن ، بدیع الجمال ، جان نواز ، دل آرام، رمجو نام ۔ اصلش از بلدہ نارنول و از اوان صبا جلوہ فرمائے شاہجہان آباد است و رونق افزائے این شہر فرخندہ بنیاد ۔ شاہدے ست شیرین و دلبرے ست نمکین ۔ از شعشۂ عذار تابانش خورشید خجل و از جلوۂ قامت زیبائش شمشاد پا در گل ۔ غنچہ از لب خندانش طرز تبسم

۱۔ نگار دہلی ، مارچ ۱۹۵۵ء ، جلد ۶۲ ، شمارہ ۳ ، ص ۳۲ ۔

آموختہ و شمع از عارض رخشانش چہرہ برافروختہ ۔ نسیم کویش عطر بیز از باد بہاری ست و شمیم مویش رنگ ریز تر از ناف آہوان تتاری ۔ کجستہ روئے و خجستہ خوئے و خجستہ گام، خوش ترکیب و خوش حرکات و خوش خرام ۔ تازہ گل گلشن جوانی است و نورس ثمر باغ زندگانی ۔ در گلستان حسن سروی ست نوخاستہ ۔ باچنین صفات ظاہر باحاسن باطن آراستہ از حسن صورت چہ گوید کہ بہ معنی صد چندان ازان است ۔ بہ صفائی فکر و جودت دہن و درستی عالم وحید عالم و یکتائے زمان ۔ طبع لطیفش بہ مقتضائے فطرت بہ کسب فنون کمال مالوف است و بہ حسب سرشت از اوضاع ناپسندیدہ نصور و بہ سجایائے مرضیۃ شغوف ۔ از زیرکی و فطانت و شوخی و متانت بہ کلّی بہرہ ور و از آئین دردمندی و بے دردی و وفاپروری و بے رحمی بہ خوبی باخبر ۔ گاہ گاہ بہ فکر سخن می پرداز و ابیات دلکش منظوم می سازد ۔ طرز کلامش نیکوست[۱]،،

شیفتہ ایسے نقاد نے نزاکت کی شاعری پر رائے زنی سے زیادہ جو اس کی صفات دلبرانہ و محبوبانہ کی تعریف کی ہے محلّ غور ہے ۔ کریم الدین " تذکرۂ شعرائے ہند ،، میں جہاں اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں وہاں یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ وہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی آشنا تھی ۔ وہ فرماتے ہیں :

" نزاکت تخلّص ایک رنڈی پریزاد رمجو نام کی ہے ۔ اصل اس کی بلدۂ

---

۱ ۔ گلشن بے خار، ص ۲۱۷، (از شیفتہ) ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

نارنول هے - وہ بچہ پن سے جلوہ فرمائے شاہجہان آباد اور رونق
بخش اس بلدۂ فرخندہ بنیاد کی هے - اپنے وقت مین یہ رنڈی
بہت خوب صورت اور حسین اور نمکین هے - شاہجہان آباد مین اس کے
حکم کا چرچا تھا - سننے مین آیا هے کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
کے آشنا تھی - اب بڑھیا ہوگئی هے - قابل دیکھنے کے نہین هے -[۱]،،

" بہارستان ناز،، (تذکرۂ شاعرات) کے مولّف حکیم فصیح الدین رنج ، شاگرد غالب بھی نزاکت کو " مصرعہ برجستہ جوانی،، کہنے کے ساتھ ساتھ اس کی شعرگوئی اور فکر سخن کا ذکر کرتے هین - انھون نے نزاکت اور شیفتہ کے تعلقات کو پردۂ اخفا مین رکھنے کی کوشش کی هے ، مگر اشعار وهی نقل کیے هین جو شیفتہ نے گلشن بے خار مین درج کیے هین - ان کے الفاظ مین :

" نزاکت تخلص ، نام اس کا رمجو، نارنول کی رهنے والی - نہایت خوش گو هے - مدتون شہر فیض آباد شاہجہان آباد مین عیش و عشرت سے بسر کرتی رهی ، هر شام امید کو هم دوشیٔ شاهد مراد فکر سے سحر کرتی هے، یعنی شعرگوئی کا هروقت خیال رها ، فکر سخن مین همیشہ ایک حال رها - آخر قضا نے اس " مصرعہ برجستہ خوبی،، کو یاد کیا عین شادی مین ناشاد کیا - بعالم حیات جس مین رها کرتی تھی بمقام دهلی چرخہ والون مین وہ مکان

۱- تذکرہ شعرائے هند ، ص ۳۹۲

ہے ۔ اب حضرت سلطان جی صاحب میں اس کا قبر کا اک شان ہے ۔[1]،،

عابد علی عابد[2] فرماتے ہیں کہ مولف " گلدستہ نازنینان ،، مطبوعہ ۱۸۴۵ ،، نزاکت تخلّص ، دل آرام، رمجو نام، بچپن سے جلوہ آرائے شاھجہان آباد ہے ،، تو کہتا ہے مگر کھل کر شیفتہ اور رمجو کے تعلقات کی بات نہیں کرتا ۔ شاید اس لیے کہ اس وقت نواب صاحب بھی زندہ تھے ۔

حکیم میر قطب الدین باطن صاحب " گلستان بے خزان عرف بہ نغمۂ عندلیب،،[3] شیفتہ پر یہ اعتراض کرتے ہوئے کہ انھوں نے صرف اپنے دوستوں کی تعریف کی ہے اور کہتے ہیں کہ انھوں نے (یعنی شیفتہ نے) جوش محبت میں ان نیک بخت (یعنی رمجو) کی تعریف کرتے ہوئے ان کا رتبہ استادوں سے بھی بڑھا دیا ہے ۔ عابد علی عابد اس ضمن میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" صاحب گلستان بے خزان کے بیان سے یہ بات جھلکتی تھی کہ شیفتہ اور نزاکت کے درمیان معاشقہ ہوا تھا لیکن وضاحت ان کے بیان میں بھی نہ تھی ۔ البتہ درگا پرشاد نادر نے " تذکرۃ النساء ،، (مطبوعہ اکمل المطابع دھلی ۱۸۸۴ء) میں یہ بات بالکل صاف کر دی اور لکھا کہ " نزاکت تخلّص ، رمجو نام، نارنول کی بت بازاری ۔ ستم شعاری ہے جو شیفتہ مرحوم

۱۔ بہارستان ناز (تذکرہ شاعرات) ، ص ۲۲۱ ، (مرتب : خلیل الرحمن داؤدی)
۲۔ نگار دھلی ، جلد ۲۲ ، شمارہ ۳ ، مارچ ۱۹۵۵ء ، ص ۳۵
۳۔ گلستان بے خزان (نغمۂ عندلیب) ، ص ۳

صاحب گلشن بے خار کی دوست داری سے شاعری مین نام پا گئی ۔ منگلو نامی اس کی دوسری بہن ، میر احمد علی مختار کار عدالت فوجداری کے گھر مین پڑ گئی تھی ۔ گلشن بے خار مین خود شیفتہ نے جو کچھ لکھا ھے اس کو تذکرہ نویسون کے ان بیانات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو واقعے کی اصلی صورت ظاھر ھو جاتی ھے ۔ یہ مان کر بھی کہ گلستان بے خزان کا مولف شیفتہ کی مخالفت پر تلا ھوا ھے رھی سہی جو کسر تھی وہ کلب علی خان فائق رامپوری نے پوری کر دی ھے اور انھون نے شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام شائع کر کے (معارف ستمبر ۱۹۵۳ء) اس قصّے کی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ھے ۔ اس کلام مین وہ مثنوی بھی ھے جو رمجو اور منگلو طوائفون کی مسّی مالی کے موقع پر شیفتہ نے لکھی ھے اور خود ھی سال تاریخ بھی نکالا ھے ۔

ع کہا اس نے " دو غنچۂ سوسن ،،

۱۲۴۴ھ مطابق ۲۹-۱۸۲۸ء ،،[1]

رمجو کے بار ے مین مالک رام فرماتے ھین :

" یہ دو بہنین تھین ۔ رمجو اور منگلو ۔ دونون بڑی طرح دار اور یکتائے روزگار تھین ۔ رمجو چند ے شیفتہ کے پاس رھی ۔ منگلو میر رحیم مختار کار عدالت فوجداری کے گھر پڑ گئی ۔ چرخہ والون(دھلی)

۱۔ نگار دھلی ، جلد ۲۶ ، شمارہ ۳ ، مارچ ۱۹۵۵ء ، ص ۳۵

مین ان کا عالیشان مکان اب تک موجود ہے ۔ مشن اسکول کے برابر والی عمارت ہے ۔ یہ ان سے سیٹھ لچھمی نرائن نے خریدی اور موخرالذکر نے بعد مین حکیم احسن اللہ خان بہادر کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ رمجو شعر بھی کہتی تھی ۔ نزاکت تخلّص تھا۔ مرنے کے بعد سلطان جی مین دفن ہوئی۔[۱]»

کلب علی خان فائق رامپوری[۲] نے حالات کا جو تجزیہ کیا اس کے مطابق شیفتہ کے استاد مومن خان مومن نت نئی حسینوں کو پھانسنے کی کوشش مین رات دن لگے رہتے تھے اور شاگردون سے بھی امداد لینے مین عار نہ سمجھتے تھے ۔ شیفتہ نے دولت اور جوانی سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی ۔ نارنول کی دو نوخیز طوائفین رمجو اور منگلو تھین ۔ ان مین سے رمجو پر شیفتہ کی نظر انتخاب پڑی ۔ ۱۸۲۸ء کے متصل شیفتہ نے رمجو کو جیت لیا۔ اس سلسلے کی مثنوی " مثنی مالی» (۱۲۴۴ھ مطابق ۲۹-۱۸۲۸ء) ان کے مخطوطہ دیوان مین شامل ہے ۔

شیفتہ کا سن ولادت جیساکہ گزشتہ صفحات مین بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۰۹ء ہے۔ رمجو اور منگلو کی مثنی مالی کی تاریخ انھون نے " دوغنچۂ سوسن» سے ۱۲۴۴ھ (مطابق ۲۹-۱۸۲۸ء) نکالی ہے ۔ اس اعتبار سے اس معاشقے کے وقت شیفتہ کی عمر انیس بیس سال کی قیاس کی جا سکتی ہے ۔ چنانچہ کلب علی خان فائق رامپوری مزید روشنی ڈالتے

۱- تلامذۂ غالب ، ص ۱۲۸

۲- کلیات شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۱۹ ، کلب علی خان فائق رامپوری (مرتّب)

ہوئے کہتے ہین :

" شیفتہ بیس سالہ جوان تھے کہ ان کی ملاقات ایک طوائف رمجو نارنولی سے ہوگئی۔ ان کے استاد مومن خان مومن کوچۂ عاشقی کی خاک چھانے ہوئے تھے ۔ طوائف کا امراء کی مجلس مین بڑا درجہ تھا۔ رئیسون اور امیرون کے دربار مین طوائف کی رسائی عام بات تھی ۔ شیفتہ باپ کے مرنے پر آزاد ہو چکے تھے ۔ سالانہ آٹھ نو ہزار پنشن کا انگریزی خزانے سے ملتا تھا۔ پھر جہانگیرآباد کا تعلقہ ان کے نام پر خریدا گیا تھا جس کے وہ تنہا مالک تھے ۔ مان اور نانی پردہ نشین مستورات تھین ۔ کوئی خاندانی بزرگ سر پر نہ تھا، اس لیے آزادی سے زندگی گزارنے لگے ۔[1] "

حبیب اشعر کے الفاظ مین :

" نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جب لڑکپن کی حدود سے گزر کر نوجوانی کی زندگی مین قدم زن ہوئے تو ان کے بھی ایک ہاتھ مین " جام شریعت " تھا اور دوسرے ہاتھ مین " سندان عشق " اور وہ بڑی مہارت کے ساتھ " جام و سندان " سے کھیل رہے تھے ۔[2] "

۱۔ گلشن بے خار (مقدمہ) ، ص ۳۳ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ دیوان شیفتہ (مقدمہ) ، ص ۲۶۹ ، مرتبہ حبیب اشعر

شیفتہ کی مثنوی بعنوان[۱] " تاریخ مسّی مالی یا قوت لبان مروارید دندان،،
جو انھوں نے رمجو اور جنگلو کی مسّی مالی کی تقریب کے موقع پر لکھی اس بات
کو واضح کرتی ہے کہ شیفتہ بھی جوان ہیں اور رمجو و منگلو کیبھی شوخیزی کا زمانہ
ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

یعنی دو نازنین دل آرام ۔۔۔ جنکا ہے رمجو اور جنگلو نام

صبح عیش ایک، ایک شام سرور ۔۔۔ روز عید ایک ، اک شب پرنور

ہیں اگرچہ وہ دونوں مہ پیکر ۔۔۔ لیک بالاتر ان میں بالا تر

شیفتہ ہے جو لالہ چیں سخن ۔۔۔ کہا اس نے " دوغنچۂ سوسن،،[۲]

یہاں یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ شیفتہ کی نظر انتخاب " بالاتر،،
یعنی رمجو پر پڑی ہے ۔ یہ واقعہ ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) کا ہے ۔

شیفتہ اپنی نظم بعنوان " نامۂ شیفتۂ جان گداز بہ جانب محبوبہ دلنواز،،
میں کہتے ہیں :

اے ساقئ محفل نکویاں ۔۔۔ اے رونق بزم شمع رویاں

اے زمزمہ سنج نغمہ پرداز ۔۔۔ اے ماہ لقائے زہرہ انداز

(معلوم ہوتا ہے کہ " محبوبۂ دلنواز،، رقاصہ و مغنیہ ہے) مزید کہتے ہیں :

اس شہر سے کر گئے سفر ہائے ۔۔۔ کی میری طرف نہ کچھ نظر ہائے

عاشق سے یہ " رم جو،، کر گئے تم ۔۔۔ ہاں اپنے ہی نام پر گئے تم

۱۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۷۷-۱۷۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری
۲۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۷۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

(معلوم ہوتا ہے کہ محبوبہ کا نام رمجو ہے اور شیفتۂ جان گداز کو کہین چھوڑ کر چلی گئی ہے) ۔ کہتے ہین :

لو شہر ہی چھوڑ کر چلے ہم — تم وان گئے اور ادھر چلے ہم
کیا وصل محال ہو گیا اب — تھا خواب، خیال ہو گیا اب
تم آئے تو ہم بھی آئین گے یان — دیکھین گے تو منہ دکھائین گے یان [1]

(معلوم ہوتا ہے کہ رمجو کے چلے جانے کے بعد اب شہر مین شیفتہ جان گداز کا جی نہین لگتا اور وہ بھی شہر چھوڑ کر کہین اور جا رہے ہین) ۔

اسی طرح ان کی نظم بہ عنوان " ہجران فسانۂ شیفتہ جان باز پیش نازنین خواب ناز،، اور ان کی نظم بہ عنوان " نامہ مہر تصویر بہ خدمت یار ماہ نظیر بہ گونہ گونہ دراز نفسی ہا ، بہ شرح طول شب ہجران و تمنائے طلوع ستارۂ سحری یعنی بہ مددگاری انجم فوز نعمت وصال آن ہم جلوۂ خورشید درخشان،، [2] مین شیفتہ نے شاعرانہ انداز مین حرمان نصیبی ، ہجر اور تمنائے وصال وغیرہ کے دل دوز مرقعے پیش کیے ہین ۔ شیفتہ وصال محبوب سے مایوس ہو چکے ہین اور دلّی چھوڑ کر غالباً جہانگیرآباد چلے گئے ہین ۔ غالب نے بھی اپنے ایک خط مین اظہار افسوس و ہمدردی کیا ہے اور ان کی خیریت طلب کی ہے ۔ [3] شیفتہ نے غالب کے خط کا جواب دیا ہے ۔ اس مین انھون نے محبوب کی بے وفائی اور اپنے غم جدائی کا ذکر کیا ہے ۔ آخر مین وہ کہتے ہین :

۱۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۸۳ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری
۲۔ ایضاً ، ص ۱۹۳ ،
۳۔ گلشن بے خار (مقدمہ) ، ص ۳۳ ، مرتّبہ کلب علی خان فائق رامپوری

" آخر شوری دردل افروخت و متاع کاسد پاک بسوخت "

اسطرح انکا عشق مجازی، عشق حقیقی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے - یہ واقعہ نومبر ۱۸۳۸ء کے قریب کا ہے - شیفتہ کا خط درج ذیل ہے:

" نامہ سی و سوم بخدمت نجم الدولہ میرزا اسداللہ خان بہادر غالب - زبان فروبستہ بجنبش آشنا میگرد و خواجہ را دل کہ در بند غمخواری بیدلاست کشایش پذیرباد، از سرگذشت من پرسیدہ اند کہ روزگارت در فراق دوست چوشت - شرح این جان آشوب الم را اگر از توانائی تنومندان بیرون نیست از نیروی ناتوان خود بیروشت - بر فرمان پذیری من هزار گونہ آفرین باید خواند و بگونہ گون شیوہ آباد باید گفت باچنین دلیکہ در فرمان من نیست و باچنین اضانۂ کہ گزاردن آن در توان من نیست - خامہ بکف و ورق بدست گرفتہ ام - یا ایہاالخلیل الجلیل - اگرچہ این بیت در شرح ماجرائے من جامع و مانع است ؎

(آنچہ دل از بیم آن میسوخت هجران تو بود - آخر از بی مهری گردون بآنهم سوختم) لیکن لختی بہ تفصیل گویم کہ در آغاز این جان گسل سانحہ، اندوهی رو نمود کہ گرانباری آن دل و جگر را نیکو بشکست - اگرچہ در آن هنگام هم چندان بیجادہ خرام نیفتاد کہ نامش در جریدۂ ناشکیبان میتوان نگاشتن - امّا انصاف بالای طاعت و در وادی ضبط و

تحمل هم شائستہ جا بگاهی بدست نیاورد و هرچند میحۂ جانخراش

از لب بدر نہ زد ۔ امّا از کجا کہ صد صفیر بیهادہ بدل اندر

نزد ۔ شعر

بحفظ گریہ مشغولم درونم را اگر کاری

ز دل تا گوشۂ چشم دوشاخ ارغوان بیدنی (عرفی)

آخر دوری دردل افروخت و متاع کاسد پاک بسوخت ۔ بیت

مژدہ صبح درین تیرہ شبانم دادند + شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

(میرزا غالب)

الحمدللہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً ۔ شب دوازدهم رمضان سال هزار و

دویست و پنجاہ و چهاردهم در روز ورود همایون صحیفہ نگارش پذیرفت ۔[۱]،،

غالب اور شیفتہ کے ان دونوں خطوں کو اگر گزشتہ صفحات میں بیان کردہ حالات و

واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو رمجو

کی محبت میں ناکامی ہوئی ہے اور اب ان کے عشق مجازی کا رخ عشق حقیقی کی طرف مڑ

چکا ہے ۔ یہ واقعہ جیساکہ ظاہر ہوتا ہے اواخر نومبر ۱۸۳۸ء کا ہے اور اس وقت شیفتہ

کی عمر تقریباً ۲۹ سال کی ہے ۔ یعنی رمجو سے شیفتہ کا تعلق خاطر انیس بیس سال

کی عمر میں شروع ہو کر تقریباً ۲۹/۲۸ سال کی عمر تک رہا یعنی یہ سلسلۂ عشق مجازی

۹/۸ سال جاری رہا ۔

۱۔ دیوان و رقعات فارسی، ص ۳۹، شیفتہ و حسرتی مصطفیٰ خان نواب

رقعات فارسی (لحن عراق) مین جو خطوط مکتوب الیهم کے نامون کی صراحت کے بغیر شائع ہوئے ہین ، ان مین سے آٹھ خط قیاس کہتا ہے کہ رمجو کے نام ہین ۔[1]

۲۔ مذہبی عقائد:

نظامی بدایونی کے الفاظ مین :

" سب سے پہلے قدوۃ الاصفیا ، شیخ الفقہا ، سیدالمحدثین مولانا شاہ محمد اسحق صاحب سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز کے نواسے اور دھلی کے مشہور محدّث اور اکابر شیوخ سے تھے ، بیعت کی ۔

ان کے وصال کے بعد شاہ ابو سعید صاحب اور شاہ احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندی مجدّدی قدس سرہ کی خدمت مین حاضر ہو کر استفادہ فیوض باطنی کرتے رہے ۔

آخر مین شاہ عبدالغنی صاحب دھلوی قدس سرہ العزیز سے بیعت فرمائی ۔[2] "

۱۔ دیوان شیفتہ ، ص ۳۷۳ ، مرتبہ حبیب اشعر

۲۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۸ ، مرتّبہ نظامی بدایونی

بشیرالدین احمد دھلوی بھی تقریباً مندرجہ بالا بیان ھی دھرا رھے ھین :

" نواب صاحب بزرگان دین کی خدمت مین بڑی عقیدت رکھتے تھے ۔ آپ نے سب سے پہلے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے اور دھلی کے مشہور محدث اور اکابر شیوخ سے تھے ، بیعت کی ۔ ان کے وصال کے بعد شاہ ابو سعید و شاہ احمد سعید سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندی مجدّدی قدس سرہ کی خدمت مین حاضر ہو کر فیوض باطنی کرتے رھے۔ آخر مین شاہ عبدالغنی صاحب نے آپ کو سلسلہ علیہ نقشبندیہ مین سند خلافت بھی عطا کی ۔[۱]"

اسی طرح مالک رام کے الفاظ ھین :

" شیفتہ کو بزرگان دین کی خدمت کا شروع سے بہت شوق تھا ۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ محمد اسحق سے بیعت کی ۔ ان کے وصال کے بعد شاہ غلام علی نقشبندی (سجادہ نشین و خلیفہ حضرت مظہر جان جانان) کے دونون خلفاً شاہ ابو سعید اور شاہ احمد سعید کی خدمت بابرکت مین حاضر ھوئے اور ان سے فیوض باطنی حاصل کیے ۔ آخر مین حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی سے سلسلۂ نقشبندیہ مین سلوک کی تکمیل کی اور انھین سے سند خلافت لے کر خود صاحب

---

۱ ۔ واقعات دارالحکومت دھلی ، حصۂ دوم، ص ۳۳۰

اجازت ہوئی ۔[1]"

کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہیں :

" اس سے (یعنی حج پر جانے سے پہلے) پہلے انھیں شاہ محمد اسحق محدّث دہلوی مہاجر مکّی، شاہ ابو سعید مجدّدی اور شاہ احمد سعید مجدّدی سے عقیدت تھی ۔ شاہ محمد اسحق صاحب سے بیعت بھی تھی ۔ آخر میں شاہ عبدالغنی مجدّدی (متوفی ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء) سے بیعت ہوئے ۔[2]"

ایک اور جگہ کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہیں :

" شیفتہ جب مجازی عشق و محبت کی الجھنوں سے تنگ آ گئے اور بادہ گساری میں کشش نہ رہی (اس کے اسباب معلوم نہ ہو سکے) تو تصوّف کی طرف راغب ہوئے اور شاہ اسحق مہاجر مکّی (۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء) کے مرید ہوگئے۔ ظاہر ہے دلی ارمان نکل چکے تھے اس لیے مرشد کی ادنیٰ توجہ سے کایا پلٹ ہوگئی ۔ حریم کعبہ اور دیار حبیب کے شوق نے بےقرار کر دیا ۔[3]"

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۷۹

۲۔ گلشن بے خار (مقدمہ) ، ص ۳۲ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۳۔ کلیات شیفتہ (مقدمہ) ، ص ۱۹

محمد ایوب قادری کے الفاظ میں :

" پہلے شاہ محمد اسحاق دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ/مطابق ۳۶-۱۸۳۵ء) سے بیعت ہوئے - پھر شاہ ابو سعید (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء) اور شاہ احمد سعید (ف ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) سے استفادہ کیا۔ پھر آخر میں شاہ عبدالغنی (ف ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) سے تجدید بیعت کی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔[1]"

مندرجہ بالا اقتباسات سے تقریباً ایک ہی سے نتائج نکلتے ہیں - مثلاً یہ کہ :

۱- نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ نے پہلے شاہ محمد اسحق سے بیعت کی -

۲- شاہ محمد اسحق کے وصال کے بعد انھوں نے شاہ ابو سعید اور شاہ احمد سعید سے فیوض باطنی حاصل کیے، اور

۳- بعد میں شاہ عبدالغنی سے بیعت کی، اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے -

کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مناسب ہے کہ اختصار کے ساتھ شاہ محمد اسحق، شاہ ابو سعید، شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائیں[2] :

۱- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، ص ۳۸۸

۲- (اقتباسات) از، تذکرہ اہل دہلی، ص ۱۷-۱۹، مرتبہ اختر قاضی احمد میاں جوناگڑھی

۱- شاہ محمد اسحق : شاہ عبدالعزیز کے نواسے - ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) مکّہ معظمہ ہجرت کرگئے - ۱۲۶۲ھ (۳۶-۱۸۳۵ء) مین وفات پائی -

۲- شاہ ابو سعید : شاہ غلام علی کے خلیفہ اعظم ہین - ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) مین وفات پائی -

۳- شاہ احمد سعید : شاہ ابو سعید کے بڑے بیٹے - ۱۲۷۷ھ (۶۱-۱۸۶۰ء) مین وفات پائی -

۴- شاہ عبدالغنی : شاہ ابو سعید کے چھوٹے بیٹے - ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) مین وفات پائی -

۵- شیفتہ کے سفر حج کا آغاز شاہجہان آباد سے ۲/ مارچ ۱۸۳۹ء کو شروع ہوتا ہے -[1]

مندرجہ بالا تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ شیفتہ سفر حج پر روانہ ہونے سے پہلے کسی وقت شاہ محمد اسحق کی بیعت کر چکے ہین - شیفتہ فروری ۱۸۴۱ء مین حج سے واپس آتے ہین تو ان کے مرشد شاہ محمد اسحق پہلے ہی مکّہ معظمہ کو ہجرت فرما چکے ہین - ان کے وصال کے بعد (۳۶-۱۸۳۵ء) شیفتہ کا شاہ ابو سعید سے فیوض باطنی حاصل کرنا ناممکن ہے کیونکہ شاہ ابو سعید صاحب کا سن وفات ۳۵-۱۸۳۴ء ہے - البتہ ان کے بیٹے شاہ احمد سعید حیات ہین - ان سے فیض باطنی کے حصول کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے - شاہ عبدالغنی ، شاہ ابو سعید کے چھوٹے بیٹے ہین اور حیات ہین لہذا ان سے تجدید بیعت کرنا درست ہے - نثار احمد فاروقی[2]

۱- نقوش (آپ بیتی نمبر) ، جون ۱۹۶۴ء (مصطفیٰ خان شیفتہ ، ص ۱۶۶۳ء)

۲- آج کل ، دہلی ، جنوری ۱۹۶۳ء ، ص ۳

فرماتے هین کـه شیفتـه نے چالیس سال کی عـمـر کے بعد شاه عبدالغنی مجدّدی نقشبندی سے بیعت کی ـ نظامی بدایونی کے مطابق شاه صاحب نے آپ کو سلسلۂ علیۂ نقشبندیه مین سند خلافت بھی عطا کی ـ شاه صاحب موصوف ان کو اپنے خلفائے اجل سے سمجھتے تھے اور اپنے مریدین کو تکمیل کے واسطے نواب صاحب کی خدمت مین بھیجا کرتے تھے ـ شاه صاحب کا مندرجه ذیل خط اس بات کی مزید وضاحت کرتا ہے:

" بسم الله الرحمن الرحیم از عبدالغنی عمیم الاحسان

نواب محمد مصطفیٰ خان صاحب ـ سلام مطالعه فرمایند ـ تا شانزدهم محرّم الحمدللّٰه بخیر هستم و سلامتی ایشان مطلوب ـ بیشتر بدست مومن علی خان مومن مکتوب فرستاده ام ـ امید که دعاء در حق فقیر می فرموده باشند ـ میان اسدالله داخل طریقه شده اند ـ امید که بهرحال ایشان عنایت مبذول دارند والسلام بفرزند عزیز معه فرزندان سلام برسد ـ میان عزیز و میان رشید سلام خوانند ـ "[1]

مولانا عبدالحی صاحب گل رعنا فرماتے هین:

" نواب دیندار اور مذهبی آدمی تھے ـ جوانی مین مولانا اسحاق محدّث کے هاتھ پر بیعت کی تھی ـ وه هندوستان سے هجرت فرما گئے ـ صحبت میسّر نهین هوئی ـ پھر جب خدا کی توفیق نے رهبری کی حضرت شاه عبدالغنی محدّث سے تجدید بیعت کر کے مشائخ مین داخل هوگئے ـ

---

١ ـ کلیات شیفته و حسرتی (حضرت شیفته کے مختصر حالات) ، ص ٩ ، مرتبه نظامی بدایونی

اس لحاظ سے وہ " دنیا خورد و عقبیٰ برد " کے صحیح مصداق تھے۔"[1]

۳۔ حج بیت اللہ :

وزیرالحسن عابدی فرماتے ہیں :

" نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی دوشنبہ ۱۷/ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ(*) (۲/ مارچ ۱۸۳۹ء) کو حرمین شریفین کی زیارت کے لیے دارالخلافہ شاہجہان آباد سے شام ہوتے روانگی ہوئی۔"[2]

آپ کی نانی صاحبہ، والدہ ماجدہ اور چند متوسلین آپ کے ہمراہ تھے۔ بمبئی تک منزل بہ منزل خشکی کا راستہ طے کیا۔ اثنائے راہ میں اکثر بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دی۔ اور اکثر اہل اللہ سے قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا۔[3]

شیفتہ کے اپنے الفاظ میں :

" پہلے پیر نورانی عالم ربانی مولانا محمد اسحق مدظلہ العالی سے رخصت ہونے اور دعائیں لینے کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ پھر

۱۔ گل رعنا، ص ۳۳۲

۲۔ نقوش (آپ بیتی نمبر)، ص ۱۲۲۳

۳۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)، ص ۱۳، مرتبہ نظامی بدایونی

(*) نوٹ: نظامی بدایونی نے کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) میں ۱۳۵۴ھ درج کیا ہے۔ جو یقیناً طباعت کی غلطی ہے۔ ص ۱۳ (مقالہ نگار)

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہ العزیز
کے آستانے پر رخصتی کے لیے حاضری دی اور والد مرحوم اور
دوسرے عزیزوں کی قبروں سے بغلگیر ہو کر خواجہ قطب الدین
بختیار رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ رات اسی آستانے
پر گزاری اور دوسرا دن بھی ۔ اگرچہ دل ترک علائق کا
خوگر اور محبت و نفرت کے بند و پیوند سے آزاد ہے ، لیکن
ان عزیزوں اور بزرگوں کے ہجوم میں جو پہنچانے آئے ہیں منت پذیری
کے جذبات سے جی اس طرح امڈا آ رہا ہے کہ بیان سے باہر
ہے ۔"[1]

شیفتہ قافلے کے ساتھ اپنی والدہ اور نانی کو لے کر دلّی سے روانہ ہوئے اور خشکی
کے راستے سے مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے بالآخر ربیع الاوّل ۱۲۵۵ھ (مئی ۱۸۳۹ء/
میں بمبئی پہنچے ۔ اس کے بعد بحری سفر شروع ہوا۔ اس سفر کی روداد انھوں نے " ترغیب
السالک الی احسن المسالک" (المعروف بہ رہ آورد) فارسی زبان میں لکھی ہے ۔[2] اس کے
علاوہ شیفتہ کا ایک غیر مطبوعہ خط جو انھوں نے مومن خان مومن کو فارسی میں
لکھا اس سفر میں بعض ایسی مشکلات کا پتہ دیتا ہے جن کا ذکر " رہ آورد " میں نہیں ہے۔
اس خط کی تلخیص ذیل میں بزبان اردو پیش کی جا رہی ہے:

۱۔ نقوش (آپ بیتی نمبر) ص ۱۲۶۳ ، وزیرالحسن عابدی
۲۔ آجکل ، دھلی ، جنوری ۱۹۶۲ء (شیفتہ کا ایک غیر مطبوعہ خط مومن خان مومن
کے نام معہ اردو ترجمہ، ص ۳) ، نثار احمد فاروقی

" ۱۵/ کو (۱۵/ ربیع الاوّل ۱۲۵۵ھ مطابق مئی ۱۸۳۹ء)
جہاز چلا اور پانچویں رمضان (یعنی رمضان ۱۲۵۵ھ مطابق
نومبر ۱۸۳۹ء) کو عدن پہنچے ۔ دو دن کے بعد عدن سے
روانہ ہوئے اور دسویں تاریخ (یعنی ماہ رمضان ۱۲۵۵ھ
مطابق نومبر ۱۸۳۹ء) کو " مخا " میں آئے ۔ وہاں تین دن
ٹھہر کر پندرھویں (یعنی ۱۵/ رمضان ۱۲۵۵ھ مطابق نومبر
۱۸۳۹ء) کو " حدیدہ " میں قیام کیا ۔ یہاں دس دن ٹھہرے ۔
چھبیسویں (یعنی ۲۶/ رمضان ۱۲۵۵ھ مطابق دسمبر ۱۸۳۹ء)
کو حدیدہ سے چلے ۔ راستے میں جہاز ایک چٹان سے ٹکرا گیا جو
پانی میں چھپی ہوئی تھی ۔ اس سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گیا ۔
کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ جگہ کونسی ہے ۔ جہاز کے تین طرف
بہت زیادہ پانی تھا اور ایک طرف قد آدم سے زیادہ نہ تھا ۔ اتنے
فاصلے پر کہ جہاں تک توپ کا گولہ جا سکے، ایک چھوٹے سے جزیرے
کا سراغ نظر آیا ۔ ادھر پانی بھی بہت کم تھا ۔ لوگ پانی میں کود
پڑے کہ جس طرح بھی بن پڑے جزیرے تک پہنچ جائیں ۔ نہ وہاں
پانی کا کنواں تھا ، نہ برگ و گیاہ ۔ نہ کوئی ایسا درخت جس کا
میوہ کھایا جا سکے ۔ نہ ایسا جھاڑ جس کے سایے میں آرام کیا جا سکے ۔
بہرحال اب ڈوبنے کا خطرہ دل سے نکل گیا ۔ اب یہ خوف رہا کہ اس

جزیرے سے نکلنا بظاہر مشکل بلکہ محال ہے ۔ یہان کھانے پینے
کا سامان تو ہے ہی نہین اور جہاز والے دو سو سے زیادہ ہین۔
عافیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہین تھا کہ ایک چھوٹی کشتی
جو جہاز مین موجود تھی کسی طرف بھیجی جائے ۔ اگر ہم لوگون
کی زندگی باقی ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سلامتی کے ساتھ
واپس آ جائین ۔ ورنہ وہ سمندر مین مر جائین گے اور ہم خشکی
مین ۔ ہم مین سے مولوی فضل علی، سعادت خان سپاہی اور تین
دوسرے اشخاص اس مین سوار ہوئے اور کشتی چلا دی ۔ جہاز ٹوٹنے
کے سولہ دن بعد جب ان کی واپسی نہ ہوئی تو یقین ہوگیا کہ وہ
سب ڈوب گئے ۔ ناگاہ دو چھوٹی کشتیان نمودار ہوئین ۔ جب وہ
نزدیک آئین تو پتہ چلا کہ ہمارے لوگون مین سے تو ان مین ایک
بھی نہین ۔ جب کشتی والے ساحل پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ
کشتی ایک ہفتے دریا مین پھرتی رہی اور آخر ساحل قنفذہ پر
سلامت پہنچی ۔ قنفذہ کے حاکم نے جیسے ہی یہ حال سنا تو ان
کے ساتھ چھ کشتیون کو روانہ کیا جن مین سے دو یہ ہین ۔ اس
وقت یہ معلوم ہوا کہ ہم بحر عجم مین ہین ۔ جب چھ دن تک ان کا
کوئی نشان نہ ملا تو ان دونون کشتیون مین کچھ لوگون کو سوار کرکے
روانہ کیا۔ اس خیال سے کہ یہان جتنے بھی کم لوگ رہین اچھا ہے، جو
بھی نکل جائے وہ تو نجات پا جائے گا ۔ باقی لوگون کے لیے بھی خدا

کوئی سبب پیدا کر دے گا ۔ مجھے (شیفتہ) ان کشتیوں میں

جانا اس لئے گوارا نہ ہوا کہ اگر چلا گیا تو دوسروں کی دل شکنی

ہوگی اور یہ مروّت کے خلاف ہے کہ وہ بیچارے یہاں رہیں اور میں

(شیفتہ) نکل بھاگوں ۔ اس لیے میں نے کہا کہ یہاں اگر ایک

آدمی بھی رہا تو وہ میں ہوں گا ۔ اس کشتی کے روانہ ہونے کے

بعد جب ایک ہفتہ گزر گیا تو دو کشتیاں اور نظر آئیں ۔ یہ

دونوں کشتیاں اگرچہ پہلی کشتیوں سے بھی چھوٹی تھیں لیکن اب

کی بار یہی طے ہوا کہ سب لوگ سوار ہو جائیں اور جتنا ہو سکے

سامان ساتھ لے لیں باقی چھوڑ دیں ۔ بہرحال دس دن کے بعد اللہ

پر بھروسہ کر کے روانہ ہوئے ۔ عنایت الٰہی نے ساحل پر پہنچا دیا ۔

وہاں چھ دن قیام کیا ۔ پھر خشکی کے راستے سے چار دن میں حرم شریف

پہنچے (محررّہ یکم ذی الحجہ ١٢٥٥ھ مطابق فروری ١٨٤٠ء) ۔"[١]

زیارت بیت اللہ کی مسّرت نے تمام مصائب سفر کو بھلا دیا[٢] ۔ حج سے فارغ ہونے کے

بعد نواب صاحب کی والدہ ماجدہ اور نانی صاحبہ چار روز کے وقفے سے یکے بعد دیگرے

وفات پا گئیں (ذی الحجہ ١٢٥٥ھ مطابق فروری ١٨٤٠ء) اور اسی خاک پاک میں

جنت البقیع کے مقدّس قبرستان میں مدفون ہوئیں ۔

---

١ ۔ آجکل ، دھلی ، جنوری ١٩٦٣ء (شیفتہ کا ایک غیر مطبوعہ خط مومن خان مومن کے نام
معہ اردو ترجمہ ، ص ٣ ، نثار احمد فاروقی

٢ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ٢٢ ، مرتّبہ نظامی بدایونی

مکہ معظمہ مین دو ماہ پانچ دن قیام کرنے کے بعد آپ مدینۃ منوّرہ کو روانہ ہوئے ۔ جب آپ کا قافلہ قریب شہر کے پہنچا تو شیخ الحرم تشریف لائے اور پوچھا کہ محمد مصطفیٰ خان نامی کوئی شخص اس قافلے مین ہے ؟ لوگون نے اثبات مین جواب دیا ۔ شیخ نے نواب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ میرے مہمان ہین ۔ آپ نے معذرت کا اظہار کیا ۔ شیخ نے کہا کہ مجھ کو حضور اقدس ص کاحکم ہوا ہے کہ مین جا کر حضور علیہ السلام کی طرف سے شرط مہمانی بجا لاؤن ۔ یہ سنتے ہی آپ پر ایک حالت وجد طاری ہو گئی ۔ (*) ۱

مدینۃ منوّرہ مین اڑتالیس روز قیام کرنے کے بعد شیفتہ مکّہ معظّمہ کو واپس ہوئے اور وہان سے طائف تشریف لے گئے ۔ یہان کے قابل دید مقامات دیکھے اور جو یادگارین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی موجود تھین ان کی زیارت سے مشرّف ہوئے ۔ طائف سے پھر حرم محترم مین پہنچے ۔ پندرہ روز مکّہ معظمہ مین آخری قیام کر کے وطن کو مراجعت فرمائی اور پورے دو سال چھ دن کے بعد ۲۳/ ذی الحجۃ ۱۲۵۶ھ (فروری ۱۸۴۱ء) دھلی مین وارد ہوئے ۔ ۱

(*) ۱ ۔ نوٹ: یہ واقعہ نواب صاحب نے اپنے سفرنامہ مین نہین لکھا بلکہ آپ نے اپنے ہمراہیون مین سے ان اشخاص کو جنھین اس واقعہ کا علم تھا ممانعت کر دی تھی کہ وہ کسی سے اس امر کا ذکر نہ کرین ۔ صرف مولوی محمد احمد جان صاحب، خلیفہ شاہ عبدالغنی صاحب، برادر اکبر مولوی سمیع اللہ صاحب سی ۔ ایم ۔ جی مرحوم جو نواب صاحب مرحوم کے دوست اور پیر بھائی تھے اس واقعے سے واقف تھے ۔ لیکن انھون نے بھی نواب صاحب سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ان کی زندگی مین اس واقعے کا اعادہ نہین کرین گے مگر نواب صاحب کی سوئم کی مجلس کے بعد اس کا تذکرہ کیا تھا ۔ (بحوالہ کلیات شیفتہ و حسرتی، (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۲۳ ، مرتبہ نظامی بدایونی ۔

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۲۲-۲۳ ، مرتبہ نظامی بدایونی

نظامی بدایونی ، شیفتہ کے قیام مکہ کے دوران کا ایک واقعہ پیش کرتے ہین ۔
انھی کے الفاظ مین درج ذیل ہے: (*) ۱

" قیام مکہ معظمہ کے زمانے مین مسجد حرام مین ایک کردستانی بزرگ نے یہ معلوم کر کے کہ نواب صاحب کی کشتی ٹوٹ گئی تھی، سرمایہ تلف ہو گیا تھا ، آپ سے درخواست کی کہ میرے پاس ایک خاک ہے وہ لے لو اور اپنا سامان درست کر لو ۔ چنانچہ ایک پڑیا کمر سے نکال کر سامنے رکھ دی ۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ نواب صاحب کو سخت رنج ہوا اور دل مین کہا کہ خدایا مین تو بخشایش کا طالب ہون نہ کہ زر کا ۔ اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا مجھ کو معذور رکھو ۔ اس نے پھر اصرار کیا اور آپ نے انکار کیا تو وہ بولا کیا مجھ کو شعبدہ باز یا مکار سمجھتے ہو ۔ آپ نے جواب دیا کہ مین گمان بد کرنے والا آدمی نہین ۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ یہ سونا ہے نہ چاندی محض خاک ہے اس کے لینے سے کیون عار ہے؟ نواب صاحب نے کہا کہ اس خاک پر تو خاک ڈالو ۔ ہان کوئی ایسی چیز دو جو مس وجود کو سونا بنا دے ۔ کردی نے کہا کہ ایسی چیز کی خواہش تو تم

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۲۳-۲۵ ، مرتبہ نظامی بدایونی

(*) نوٹ: نظامی بدایونی نے یہ واقعہ بہ زبان فارسی بھی کلیات شیفتہ و حسرتی(حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) مین درج کیا ہے ۔ (مقالہ نگار)

سے زیادہ خود مجھ کو ہے۔"

شیفتہ کے غیر مطبوعہ خط بنام مومن خان مومن میں، اس زمانے کے مشہور شاعر شہیدی کا ذکر تو نہیں ہے لیکن روایت ہے کہ شیفتہ نے اسی سال حج کیا جس سال منشی کرامت علی شہیدی بھی وہاں گئے تھے اور اس سفر میں شیفتہ کی موجودگی میں ان کا انتقال ہوا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ مکّہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے سفر میں دونوں ایک ہی محمل میں تھے۔ شہیدی[۱] اسہال کے مریض تھے اور بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ضعف سے غش پر غش آ رہے تھے۔ جب مدینے کا سواد نظر آنے لگا تو شیفتہ نے ان سے کہا "شہیدی آنکھیں کھولو، دیکھو گنبد خضرا سامنے نظر آ رہا ہے۔ شہیدی نے آنکھ کھولی، روضۂ مبارک پر نظر ڈالی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے روضۂ رسول کے درختوں پر جا بیٹھا۔

نثار احمد فاروقی فرماتے ہیں:

"اس جزیرے میں قیام کے دوران چنا، چاول اور باجرہ وغیرہ ابال ابال کر سب نے کھایا۔ صحت تو سب کی متاثر ہوئی لیکن شہیدی بیمار ہوگئے۔ انھیں اسہال کبدی شروع ہو چکے تھے۔ جدّہ سے بمشکل تمام مکّہ پہنچے اور وہاں سے اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ

۱۔ تلامذۂ غالب، ص ۱۸۰، مالک رام (بحوالہ "صلائے عام دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲۷)
نوٹ: شہیدی کے انتقال کا ذکر تو شیفتہ نے اپنے "سفرنامہ"، "رہ آورد" میں کیا ہے مگر یہ واقعہ بیان نہیں کیا۔ (مقالہ نگار)

مکرمہ کا ارادہ کیا۔ شیفتہ ان کی تیمارداری کر رہے تھے ۔ سفر کی تھکان اور جھٹکوں کے باعث شہیدی پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے ۔ جب مدینہ منورہ کا سواد نظر آیا اور گنبد خضرا نمودار ہوا تو شیفتہ نے فرط شوق سے پکارا۔ " شہیدی دیکھو ، گنبد خضرا نظر آ رہا ہے۔،، شہیدی نے غشی کے عالم میں آنکھیں کھول دیں ۔ حسرت سے روضۂ مبارک کی طرف دیکھا اور روح پرواز کر گئی ۔ ان کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ ؎

تمنا ہے تر ے روضہ کی دیواروں پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقیّد کا

یہ ان کے ایک مشہور نعتیہ قصیدے کا شعر ہے۔،،[۱]

نظامی بدایونی ، شیفتہ کی سفر حج سے واپسی پر ایک بزرگ سے ملاقات بتاتے ہیں جس نے دوران ملاقات ان پر یہ واضح کر دیا کہ بحری سفر کے دوران جو تکالیف ہوئیں ان میں اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی اور برکتیں پوشیدہ تھیں ۔ وہ فرماتے ہیں :

" علاوہ ان گونا گوں فیوض اور برکات کے جو اس سفر سے حاصل ہوئیں سن رسیدہ بزرگ کی اشارت ہے جن سے انھیں بڑودہ میں بوقت مراجعت وطن قدمبوسی کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے اس مبارک سفر کا ایک نکتہ بتایا جس کو آپنے اپنے سفرنامہ (رہ آورد) میں لکھا ہے :" جو فاسد مادہ

۱۔ آجکل ، دھلی ، جنوری ۱۹۶۳ء ، (شیفتہ کا ایک غیر مطبوعہ خط مومن خان مومن کے نام) ص ۵

خودی اور اسباب ظاہری میں گرفتار رہنے کا انسان کے اندر موجود ہے اس کے دور کرنے کے لیے سمندر کا سفر نہایت مفید ہے ۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ موجیں شکرائیں، آسمان پر ابر غلیظ گھرا ہو ، اس کے وقت میں کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکے اور تمام ظاہری اسباب مفقود ہوں، پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور کثرت کے غالب ہونے کا خیال نکل جاتا ہے اور خدا وند واحد کا غلبہ معلوم ہوتا ہے ۔ خودی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے — " لمن الملک الیوم،، للہ الواحدالقہاد کا مطلب ظاہر ہو جاتا ہے،، ۔ ان باخدا بزرگ کے مقولے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب پر جو خاص قسم کی مصیبت اس سفر میں گزری تھی اور جس کا مجمل ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے وہ دراصل ایک مبارک ابتلا تھا (تھی) جس میں خدا کو مشاہدۂ وحدت کرانا اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں کو منظور تھا[1]۔،،

۴۔ دینی و دنیوی مشاغل:

شیفتہ کے دولت کدے پر مشاعروں اور ادبی محفلوں کے انعقاد کی تفصیلات

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۲۷ ، مرتبہ نظامی بدایونی

باب اوّل مین ذیلی عنوان " امراء کے دیوان خانون کی ادبی صحبتین،، کے تحت بیان کی جا چکی ہین ۔ اب ہم دیگر مشاغل حیات کا ذکر کرتے ہین ۔ کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین :

" دہلی کے دوران قیام مین مکان پر مجمع احباب رہتا ۔ جہانگیرآباد مین جاتے تو مخلص احباب وہان بھی ملنے جلنے چلے جاتے اور اس طرح ان کی علمی و ادبی زندگی مین فرق نہ آیا ۔،،[1]

عشق مجازی مین ناکامی اور حج بیت اللّٰہ کی سعادت نصیب ہونے کے بعد ان کے روزمرّہ کے مشاغل مین عبادات و اذکار کو ایک اہم مقام حاصل ہوگیا جو تادم زیست قائم رہا ۔ اب وہ " شوق صنم،، اور " خواہش صہبا ،، اور تمام منہیات سے توبہ کر چکے تھے ۔ انہی کا ایک شعر ہے ۔ ؎

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہین حرم سے　　　شوق صنم و خواہش صہبا نہین رکھتے[2]

اسی طرح مالک رام، غالب سے شیفتہ کا شراب کے متعلق ایک لطیفہ بیان کرتے ہین :

" ایک دن سردی کے زمانے مین سرشام شیفتہ ان سے ملنے گئے تو میرزا اس وقت " ساغر و مینا ،، سے شوق کر رہے تھے ۔ انھون نے

۱۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۳۲ ، مرتبۂ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۲۸ ، مرتبۂ کلب علی خان فائق رامپوری

شیفتہ کو بھی دعوت دی ۔ انھون نے جواب دیا : " حضرت مین

نے توبہ کر لی ھے ،، ۔ تو غالب بولے : " ارے غضب کیا ، کیا

جاڑون مین بھی ؟ ،، اسی زمانے کا ایک شعر ھے ۔ ؎

ما حسرتی ز شیوۂ غالب گرفتہ ایم

آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را ،،[۱]

سفر حجاز سے واپسی کے بعد شیفتہ نے متعدد سفر مختلف مقامات کے کئے ۔

شیفتہ کے " رقعات فارسی ،، سے ۱۲۵۷ھ کے آخر مین (۱۸۴۲ء) سفر رامپور کا حوالہ

ملتا ھے ۔ ان کا خط نمبر ۲۱ بخدمت مولانا محمد صدرالدین خان بہادر ، رامپور سے

لکھا گیا ھے :

" در ذی حجہ سال ہزار و دو صد و پنجاہ و ہفت از رامپور نوشتہ

شد ۔ ،،[۲]

اس سلسلے مین کلب علی خان فائق رامپوری کا خیال ھے کہ شاید مومن بھی

اس سفر مین شیفتہ کے ہم سفر ھون اور یہ کہ رامپور کے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۶ء کے سفرون کا

حال غالب کے رقعات سے بھی واضح ھوتا ھے ۔ جہانگیرآباد مین آنا جانا تو بیشتر رہتا

تھا ۔ غالب ، سید غلام علی وحشت اور مومن بھی جا کر ان کے مہمان رہتے ۔[۳]

۱۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۲۸

۲۔ رقعات فارسی (لحن عراق) ، ص ۵۴ ، شیفتہ مصطفیٰ خان نواب

۳۔ کلیات شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۲ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

خلیل الرحمن داودی کے مطابق حالی نے ۱۸۶۱ء مین شیفتہ کی مصاحبت اختیار کی اور آٹھ نو سال ان کے بچون کے اتالیق کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے ۔[۱] شیفتہ کا جہانگیرآباد سے دلی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ حالی بھی اکثر ان کے ساتھ دلی جاتے اور رہتے تھے ۔ صالحہ عابد حسین فرماتی هین :

" حالی کا مستقل قیام تو جہانگیرآباد مین رهتا تھا مگر دلی بھی شیفتہ کے ساتھ اکثر آتے رهتے تھے ۔"[۲]

غالب کے بہت سے خطوط سے بھی یہ بات واضح هو جاتی هے کہ شیفتہ گاہ بگاہ جہانگیرآباد سے دلی جاتے رہتے تھے ۔ مثلاً ان کا خط بنام تفتہ :

" پرسون سے نواب مصطفیٰ خان صاحب یہان آئے هوئے هین ۔ ایک ملاقات ان سے هوئی هے ۔ ابھی یہین رهین گے۔ بیمار هین۔ حکیم احسن اللہ خان معالج هین ۔ فصد هو چکی هے ۔ جونکین لگ چکی هین ۔ اب مسہل کی فکر هے --- صبح جمعہ ۱۲/ ماہ اکتوبر ۱۸۶۳ء۔"[۳]

غالب کا خط بنام مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ :

" جناب بھائی صاحب قبلہ ، یقین هے کہ آپ مع الخیر اپنے دارالریاست مین پہنچ گئے هون اور بجمعیت خاطر روزہ رکھتے هون ۔ سوا پان کے کوئی

۱۔ یادگار غالب از حالی (مقدمہ) ص ۱۸ ، مرتّبہ خلیل الرحمن داودی

۲۔ یادگار حالی، ص ۳۶،

۳۔ خطوط غالب حصّہ اوّل ، ص ۲۰۷ ، مرتّبہ غلام رسول مہر مولانا

خیال اور مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو --- ۱۰/رمضان ۱۲۸۱ھ مطابق ۷/فروری ۱۸۶۵ء -"[1]

غالب کا خط سید احمد حسن مودودی:

" تین برس عوارض اشراق خوں میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی - آپ کے خطوط آئے ہوں گے کوئی عنوان ناکشودہ پڑا رہا ہوگا - البتہ حاجی مصطفیٰ خان کا آنا مجھکو یاد ہے - یقین کرتا ہوں کہ انہوں نے از روئے مشاہدہ میری خستگیٔ تن کا حال حضرت کو لکھا ہوگا --- ۲۴/جولائی ۱۸۶۵ء -"[2]

غالب کا خط بنام شیفتہ:

" مصطفیٰ خان صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمول جشن آنے والے ہیں - اس وقت تک نہیں آئے - جشن یکم دسمبر سے شروع ۵/دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع - دوشنبہ ۲۸/نومبر ۱۸۶۵ء بوقت چاشت -"[3]

شعر و شاعری کا شوق تو شیفتہ کو بچپن ہی سے تھا - آغاز جوانی میں یہ

۱- خطوط غالب حصّہ دوم، ص ۳۳۵، مرتّبہ غلام رسول مہر مولانا

۲- خطوط غالب حصّہ دوم، ص ۱۳۸، مرتّبہ غلام رسول مہر مولانا

۳- ایضاً ، ص ۳۱۶

شوق شدّت اختیار کر گیا لیکن تھوڑے ھی عرصے بعد ماند پڑ گیا۔ بہرکیف یہ مشغلہ کسی نہ کسی صورت مین پایان عمر تک جاری رہا۔ شیفتہ گلشن بے خار مین فرماتے ھین:

" مین بچپن سے اس شغل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ مین نے بہت وقت اس کے پیچھے برباد کیا۔۔۔ اب تو عرصے سے مجھے شعر و شاعری سے کوئی سروکار نہین رہا، مگر اس وقت جبکہ ھم مذاق لوگ تحریک کرتے ھین ادھر توجہ کر لیتا ھون اور وہ بھی کبھی کبھی ۔ نیا کلام کہنے کی توفیق نہین ھوتی، مگر مہینون کے بعد نہین بلکہ برسون کے بعد ایسا اتفاق ھوتا ھے ۔ اور جب ریختہ شاعری کے دلدادہ مجبور کرتے ھین تو ریختہ کی طرف توجہ کرتا ھون اور اسی طرح فارسی کلام کے دلدادگان کی توجہ دلانے سے ادھر توجہ کرتا ھون۔۔"[۱]

حالی، جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ھے، ۱۸۶۱ء مین شیفتہ کے پاس جہانگیرآباد گئے اور شیفتہ کی وفات (۱۸۶۹ء) تک وھان رھے ۔ وہ شیفتہ کے شغل شعر و سخن کے بارے مین بیان کرتے ھین:

" میرے وھان جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدّت سے افسردہ ھو رھا تھا تازہ ھو گیا۔۔۔ اس زمانے مین اردو اور فارسی کی اکثر غزلین خواب مرحوم کے ساتھ کہنے کا اتفاق ھوا۔ انھین کے ساتھ مین بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔۔۔"[۲]

۱۔ گلشن بے خار(دیباچہ از شیفتہ) (اردو ترجمة)ص ۱۲۰، نفیس اکیڈمی ، کراچی

۲۔ یادگار غالب ،ص ۱۸، (الطاف حسین‌حالی خواجہ) ، مرتّبہ خلیل الرحمن داودی

نظامی بدایونی کو مولانا فرخی سے جب بمقام رامپور اوائل ستمبر ۱۹۱۵ء میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو شیفتہ کے کچھ حالات کا پتہ چلا۔ مولانا موصوف کو ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۹ء تک شیفتہ کی خدمت میں مسلسل رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لہذا نظامی بدایونی مولانا فرخی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں :

" نواب صاحب مرحوم رات باختلاف موسم دو بجے سے تین بجے تک تہجد کے واسطے بیدار ہوتے تھے اور نماز تہجّد اور صبح کے درمیان مسنون قیلولہ کے بعد صبح کی نماز مسجد میں جا کر، سفر ہو یا حضر اوّل جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے اور اکثر مسجد سے واپس آ کر اشراق تک وظائف و اذکار کے بعد متعلقین سے ملتے تھے ۔ دس بجے کھانا تناول فرما کر قدرے قیلولہ فرماتے تھے ۔ اس کے بعد ظہر سے پہلے حدیث شریف یا تصوّف یا سیر کی کسی کتاب کا مطالعہ بھی فرما لیتے تھے ۔ اوّل وقت ظہر کی نماز مسجد میں جا کر جماعت اولیٰ کے ساتھ پڑھتے تھے ۔ اسی طرح عصر اور مغرب کی نمازیں اوّل وقت ادا فرماتے تھے ۔ عشاء کی نماز کے بعد رات کا کھانا تناول کرکےبلا فصل استراحت فرماتے تھے ۔ بیماری کی حالت میں جبکہ راتوں کو نیند کم آتی تھی دیگر امراء کی طرح داستان یا قصّے نہیں سنتے تھے بلکہ کسی کتاب سے حمد و نعت ، مناجات یا منقبت اہل بیت پڑھوا کر سنتے اور سو جاتے ۔

عصر اور مغرب کے درمیان مصاحبین و اکابر مہمانوں سے جو آپ
کی مہمان نوازی کے سبب اکثر موجود رہتے تھے، صحبت رہتی تھی۔
مصاحبت مین مولانا حالی جیسے لوگ ہم صحبت تھے۔[۱]"

شیفتہ آنے والے خطوط کے بارے مین بڑے محتاط تھے اور ان کے جوابات فوراً دینے
جانے کے قائل تھے، چنانچہ نظامی بدایونی فرماتے ھین :

" جو خطوط آپ کے پاس آتے تھے ان کا جواب ھمروزہ لکھوا دیتے تھے ۔
جس زبان مین خطوط آتے تھے اسی زبان مین جواب لکھواتے تھے ۔ فارسی
خطوط کا جواب فارسی مین اور اردو خطوط کا اردو مین جواب دیتے تھے۔
آپ اپنے پیش دست کو عبارت خطوط کی خود نہین لکھواتے تھے بلکہ وہ
خط لکھ کر پیش کرتا۔ آپ اس کی اصلاح فرما دیتے تھے ۔ اصلاح کے
بعد خطوط صاف کیے جاتے تھے ۔ ایک زمانہ تک خطوط نویسی کا کام
نواب صاحب اپنے بڑے صاحبزادے نواب محمد علی خان صاحب سے لیتے
رہے جس سے صرف ان کی تربیت و تعلیم مقصود تھی ۔ مولانا فرخی
صاحب نے بھی جب مولانا موصوف جہانگیرآباد مین طالب علمی کے زمانے
مین موجود تھے نواب صاحب کی اس خدمت کو انجام دیا تھا۔ مولانائے
موصوف فرماتے تھے: " نواب صاحب مرحوم ھمارے لکھے ھوئے خطوط کی
اصلاح مین محاورات زبان اور املا کا بے حد خیال فرماتے تھے ۔ یہان تک

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۵ تا ۶، مرتّبہ نظامی بدایونی

که اگر کبھی میں لفظ " تم نے" کو ملا کر " تمنے،، لکھ دیتا تو اس کو کاٹ کر " تم نے ،، لکھ دیتے،، ۔ گویا آپ ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ لکھنے کے حامی تھے اور اردو املا کے اس رسم خط کی ضرورت کو جسے آج کے مصلحان اردو رائج کرنا چاھتے ھیں آپ آج سے پچاس برس پہلے محسوس کر چکے تھے ۔[1]،،

نواب صاحب کا خط نہایت پاکیزہ تھا ۔ قلم ، کاغذ کیسا ھی خراب ھو مگر معلوم ھوتا تھا کہ مینا کیا ھوا ھے ۔ باوجود خوش خط ھونے کے اپنے ھاتھ سے قلم نہیں بناتے تھے ۔[2]

جوانی میں آپ کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا ۔[3] پیرانہ سالی کے زمانے میں بھی اسی شوق کی یادگار کے طور پر ان کا اصطبل گھوڑوں سے معمور رھتا تھا ۔

شیفتہ کے مجاھدے اور ریاضت کے بارے میں نظامی بدایونی فرماتے ھیں :

" نواب صاحب شب و روز مجاھدے اور ریاضت میں بسر کرتے تھے ۔ آپ کا کشف قبور اس وقت مشہور تھا اور ضبط زبردست تھی ۔ مولانا ولی اللّٰہی صاحب رامپوری جو خاندان نقشبندیہ کے صاحب کمال بزرگ تھے فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے دھلی پہنچنے کی اطلاع نواب صاحب کو خط کے ذریعے سے دی مگر اتفاق سے وہ خط کے پہنچنے سے پیشتر پہنچ گئے اور خط نواب صاحب کو ان کی موجودگی میں ملا ۔ قبل

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۸ ، مرتبہ نظامی بدایونی
۲-۳۔ ایضاً

اس کے کہ خط کو کھولیں یا پڑھیں ان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:

" کیا آپ کو بھی اس وقت نقشبندیہ کی کچھ خوشبو آتی ہے ـ میرا دماغ تو اس خوشبو سے مالا مال ہوگیا ہے۔،، مولانا حالی مرحوم کی زبانی نقل ہے کہ ایک بار نواب صاحب مولانا شاہ غوث علی پانی پتی کی زیارت کو پانی پت گئے ـ چند روز مولانا سے اوقات خاص میں صحبت رہی ـ وقت مراجعت و رخصت مولانا نے صافحہ کیا اور آپ کا ہاتھ ذرا زور سے دبایا ـ اسی طرح تین بار مصافحہ کیا ـ نواب صاحب فرماتے تھے کہ ہر بار میرے قلب میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی تھی جو بیان میں نہیں آ سکتی ـ،،[1]

شیفتہ کی زندگی کے آخری زمانے کے بارے میں اور ان کے معمولات کے سلسلے میں نظامی بدایونی کا بیان:

" آخری زمانے میں جبکہ ان کے ہم عصروں کا شمار آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا تھا آپ نے عزلت نشینی اختیار کر لی تھی اور سوائے یاد الٰہی کے اور کچھ شغل نہ تھا ـ اکثر مزارات پر حاضری کا معمول تھا ـ چنانچہ سبزی منڈی دہلی میں ایک بڑے بزرگ کا مزار ہے جو حضرت شاہ آفاق صاحب رحمۃ للہ علیہ کے مزار کے قریب واقع ہے، وہاں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے ـ اور حضرت شاہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور

---

۱ ـ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۱۰ ، مرتّبہ نظامی بدایونی

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت

شاہ نورالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات پر اکثر تشریف لے جاتے

تھے یا دہلی کے مشہور علماء سے صحبت رہتی تھی ۔

دنیاوی معاملات سے قطعی دلچسپی نہین رہی تھی ۔ تمام ریاست

کا کام اپنے فرزند اکبر نواب محمد علی خان صاحب کے سپرد کر

دیا تھا۔[۱]،،

(ج) سیاسی شعور

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء :

انگریزون کے غاصبانہ ہتھکنڈون اور حوس ملک گیری کی نازیبا حرکتون کی وجہ سے پاکستان و ہند کے محبّ وطن عناصر کے دلون مین ان کے خلاف نفرت و حقارت کی روز بروز بڑھتی ہوئی آگ ۱۸۵۷ء کی ناکام " جنگ آزادی ،، کی صورت مین ظاہر ہوئی ، جس سے کچھ عرصے کے لیے امن و امان کی فضا درہم برہم ہو گئی ۔ بعد مین انگریزون نے استحکام حاصل کرنے کے بعد مجاہدین آزادی سے انتقام لینے کی آڑ مین محبّ وطن عناصر کو طرح طرح سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ سید ہاشمی فریدآبادی فرماتے ہین :

" نفرت کی سرنگ کا پہلا بڑا دھماکہ میرٹھ چھاؤنی مین ہوا ۔

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۱۰ ، مرتبہ نظامی بدایونی

جنوری ۱۸۵۷ء مین ایک نئی قسم کی بندوق فوجون مین رائج کی گئی تھی ۔ اس کے کارتوس کو چربی سے چکنا کیا جاتا تھا ، پھر دانت سے کارتوس کا ایک سرا کترا جاتا تھا ـــ شمالی ھند مین آناً فاناً مشہور ہوا کہ اسے چکنا کرنے مین گائے اور سور کی چربی لگائی جاتی ھے کہ ھندوؤن اور مسلمانون کا دین چکٹ جائے ـــ اجتماعی طور پر میرٹھ کے ایک جوق نے حکم عدولی کی جسارت کی اور جنگی عدالت سے ھر شخص کو دس دس برس کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ـــ ۹/ مئی ۱۸۵۷ء ـــ اسی رسالے اور دو پیادہ پلٹن والون نے جیل کا دروازہ توڑ کر ساتھیون کو رھا کیا اور انگریزون کو جو ھاتھ پڑا قتل کر ڈالا ـــ باغی سپاھیون نے دھلی کی راہ لی جہان ان کی آمد آمد کی خبر سن کر بلوہ ھو گیا اور انگریزون کو چن چن کر مارا جانے لگا ـــ دھلی کو باغی سپاھیون نے اپنا پہلا مرکز بنایا اور ابو ظفر بہادر شاہ کی آزاد بادشاھی کا اعلان کر دیا ـــ ڈیڑھ دو مہینے کی سخت بدنظمی اور افراتفری کے بعد بریلی کی ایک اور فوج انگریز کو ھندوستان سے اور مغل سلطنت کو ذلّت کی قبر سے نکالنے کے لیے دھلی پہنچی (جولائی ۱۸۵۷ء) ـــ اس مین صرف کمپنی ھی کے باغی سپاھی نہ تھے بلکہ بہت سے مجاھدین تازہ بھرتی کئے گئے تھے جس کا سپہ سالار بخت خان روھیلہ تھا ـــ بہادر شاہ نے ملکی اور عسکری اختیار بخت خان

کے سپرد کئے - گویا اپنا نائب السلطنت بنا دیا --- مرزا مغل اور ان کے تلنگے رفیق ، بخت خان سے حسد کرنے لگے - ان کا حکم ماننے کی بجائے ضد سے مخالفت کرتے تھے - اسی دوران مین انگریزون نے اپنے حامی ملازم سپاھیون کی مدد سے دھلی پر چڑھائی کر دی - یہان تک کہ شمالی پہاڑی سے شہر پر گولے برسنے شروع ہو گئے - بادشاہ سلامت نے قلعہ خالی کر دیا --- ھمایون کے مقبرے مین پناہ لی اور اسی مدفن مین ان کی گرفتاری پر نام نہاد تیموری سلطنت ھمیشہ کے لیے دفن ہوئی --- بخت خان رخصت ہو کر اودھ چلے گئے، پھر نیپال کی پہاڑی وادیون مین جا کر گم ہو گئے --- دھلی کی دوبارہ تسخیر اور بہادر شاہ کی قید و معزولی (ستمبر ۱۸۵۷ء) مغلون کی پرانی نام موروثی بادشاہت کی موت کا نقارہ تھی --- ۱۸۵۷-۵۸ء مین غلبہ حاصل کرنے کے بعد انگریزون نے فساد کے اکثر مقامات پر وحشیانہ انتقام لیا -[۱]،،

محمد ایوب قادری " جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ،، مین ضلع بلند شہر کے ضمن مین لکھتے ھین :

" اس علاقہ کے سب سے بڑے بااثر رئیس نواب ولی داد خان تھے جو ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو اتفاق سے دلی مین موجود تھے - قریب دو

---

۱ - تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، جلد دوم ، ص ۳۳۲

ہفتے نواب ولی داد خان دھلی مین رھے - ۱۶/ مئی ۱۸۵۷ء کو دھلی سے دوآبہ کی حکومت کی سند لے کر مالاگڑھ روانہ ہوئے - غازی آباد سے اپنا انتظام کرنا شروع کر دیا - مہربان علی خان و مظفر علی خان امروھوی ہمراہ تھے - وہان سے قصبہ رادری مین آ کر قیام کیا - کئی ہزار گوجر فوج مین بھرتی ہوئے - تیسرے دن نواب صاحب مالاگڑھ مین آ گئے - سائنل پور کا زمیندار سو سوارون کی ایک جماعت لے کر نواب صاحب سے ملا --- نواب ولی داد خان نے مالا گڑھ آنے کے بعد جولائی کی بالکل ابتدائی تاریخون مین انگریزی حکومت کے خاتمے اور اپنے لیے بادشاہ دھلی کے صوبیدار ہونے کا اعلان کر دیا -[1]"

نواب ولی دادخان کے رفقاء مین غلام حیدر، مہدی بخش سہارنپوری، قاضی وزیر علی بلند شہری، عبداللطیف رئیس خان پور، عظیم خان (عبداللطیف خان کے چچا) ، منیر خان (عبداللطیف خان کا بھتیجا) ، اسماعیل خان، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ رئیس جہانگیرآباد، حاجی یار اللہ خان ایچانوی اور ایمن پدھان جمع ہو گئے -[2]

ولی داد خان کو دھلی گورنمنٹ سے بھی حتی المقدور فوجی مدد ملی - نامہ و پیام کا کام نواب مصطفیٰ خان شیفتہ انجام دیتے تھے -[3]

۱- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۱۹۰

۲- علماء ھند کا شاندار ماضی ، جلد چہارم ، ص ۳۵۲ ، محمد میان صاحب سید نیز جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، ص ۱۹۱ ، محمد ایوب قادری

۳- گزٹیر ضلع بلند شہر ، ص ۲۳۹ وغیرہ (بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، ص ۱۹۰ ، محمد ایوب قادری

محمد ایوب قادری دھلی میں جنگ آزادی کے آغاز کی کہانی مولوی رضی الدین بدایونی کی زبانی بیان کرتے ھیں کہ دوران سفر ستمبر ۱۸۵۷ء از دھلی تا بدایوں ---

" اب یہاں قصبے کے باھر نواب مصطفیٰ خان صاحب رئیس جہانگیرآباد کے سپاھی متعین تھے - انھوں نے ھمارے دادا اور چچا صاحب سے کہا کہ تلواریں اپنی پھاٹک پر رکھ دو تب اندر داخل ھونے دیں گے - --- ھم لوگ جہانگیرآباد میں داخل ھوئے - وھاں مولوی ثناء الدین مرحوم ھمارے وطن کے حسن اتفاق سے موجود تھے اور ان سے خاندانی ارتباط تھا --- نہایت خاطر سے پیش آئے اور دعوت کی - وھاں دو روز آرام کیا - پھر وھاں سے نواب مصطفیٰ خان صاحب مرحوم جو گورنمنٹ کے خیرخواہ غدر میں رھے اور باغیوں کے شریک نہ ھوئے ، دس بندوقچی سپاھی ھماری محافظت کے واسطے مقام انوپ شہر تک کر دیئے [۱] -،،

مولوی رضی‌الدین بدایونی کا یہ کہنا کہ " نواب مصطفیٰ خان گورنمنٹ کے خیرخواہ غدر میں رھے اور باغیوں کے شریک نہ ھوئے ،، ، حقائق پر مبنی نہیں ھے بلکہ بعض مصالح پر مبنی ھو سکتا ھے - نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ، جیساکہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ھے، نواب ولی داد خان کے رشتہ دار تھے اور خود بھی ایک شریف‌النفس انسان کی طرح زندگی گزار رھے تھے - وہ خود بھی وطن عزیز کو غیر ملکیوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے خواھاں تھے - جنگ آزادی کے دوران بھی انھوں نے کافی نقصان اٹھایا

۱- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، ص ۳۲۶

اور بعد مین بھی قید و بند کی صعوبتون مین گرفتار رہے ۔ نظامی بدایونی فرماتے ہین :

" غدر ۱۸۵۷ء مین ہندوستان کے عمائد و شرفاء پر جو مصیبت گزری ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے ۔ نواب صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہے ۔ ان کا دارالریاست جہانگیرآباد خطرناک حالت میں تھا ۔ نواب صاحب اس کو چھوڑ کر خان پور ، جہانگیرآباد سے چند میل کے فاصلے پر ہے ، اپنے عزیز دوست عبداللطیف خان صاحب رئیس خان پور کے ہان اقامت گزین ہو گئے تھے ۔ ٹھاکرون نے قلعہ جہانگیرآباد پر قبضہ کر لیا تھا اور نواب صاحب کے عالیشان اور خوبصورت محلون کو آگ لگا دی ۔ تمام قیمتی اور پرتکلف اثاث البیت جل کر خاک سیاہ ہوگیا ۔ یہان تکہ ان کا گران بہا کتب خانہ اور ان کی اپنی تصانیف جس مین اردو فارسی کا کلام بھی شامل تھا آگ کے شعلون کی نذر ہو گیا ۔ جس وقت بھیم سنگھ اور اس کے ساتھی ٹھاکرون نے جہانگیرآباد میں یہ ہنگامہ فساد برپا کر رکھا تھا ، حسن اتفاق سے ریاست رامپور کی فوج دہلی جانے کے لیے جہانگیرآباد سے گزری ۔ اس فوج کا افسر ، نواب یوسف علی خان فردوس مکانی والئی رامپور اور نواب مصطفیٰ خان صاحب کے دوستانہ تعلقات سے واقف تھا ، اس لیے اس نے ٹھاکرون کے مقابلے مین نواب صاحب ممدوح کے تابعین کی مدد کی اور ان کو از سر نو جہانگیرآباد

پر قبضہ دلا دیا ۔" [1]

جب ۱۴/ستمبر ۱۸۵۷ء کو دھلی پر انگریزون کا قبضہ ہو گیا تو دوسری جگہ کے انقلابیون کی همتین بھی پست ہوگئین اور مالاگڑھ سے ولی داد خان نے بریلی کا رخ کیا اور خان بہادر خان کے همراہ وہ انگریزون سے مقابلہ کرتے رھے ۔ [2] بلند شہر پر جب انگریزون کا کلیتہً قبضہ ہو گیا تو نواب مصطفیٰ خان شیفتہ باغی قرار پائے ۔ ان پر مقدمہ چلا ۔ سات سال کی سزا ہوئی ۔ جرم کی نوعیت کے متعلق گزیٹیر ضلع بلند شہر مین اشارہ ملتا ھے :

" مصطفیٰ خان، ولی داد خان کے رشتہ دار تھے جو انگریزون کے خلاف جنگ مین لڑے ۔ ان (مصطفیٰ خان) کے مقدمے مین یہ بات ثابت ہوگئی ھے کہ وہ (مصطفیٰ خان) بادشاہ دھلی سے (انگریزون کے خلاف) باغیانہ خط و کتابت کرتے تھے اور ان کو سات سال کی سزا ہوئی ۔ آخر مین معاف کر دیئے گئے ۔" [3]

اس خط و کتابت کی تفاصیل تو کہین نہین ملتین البتہ کہین کہین نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی بہادر شاہ ظفر کے دربار مین حاضری اور ان کی طلبی کی اطلاع ملتی ھے:

" ۱۷/مئی ۱۸۵۷ء کو بروز اتوار مصطفیٰ خان نے بادشاہ کے حضور مین حاضری دی اور دو روپے نذر دیئے ۔" [4]

---

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۲۸ ، مرتبہ نظامی بدایونی

۲ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳۹۲، محمد ایوب قادری

۳ ۔ گزیٹیر ضلع بلندشہر، ص ۲۳۹ ، (بحوالہ نمبر ۱)

۴ ۔ فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش ، جلد پنجم، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ ، لکھنؤ، ۱۸۶۰ء

اسی طرح ایک اور اطلاع ہے:

" یکم ذیقعد - ۲۵/ جون : نواب ولی دادخان کی عرضی سے ظاہر ہوا کہ مصطفیٰ خان ولد مرتضیٰ خان سرکار انگریزی کے تعلق سے سبکدوش ہو کر دربار میں حاضری کے مشتاق ہیں اور شرف ملازمت کے شیدائی ہو کر یہاں بے قرار ہیں - حکم ہوا کہ چاہیے کہ اپنے جرگہ کے ساتھ ان کو دارالخلافہ میں پہنچا دیں -"[۱]

اس سلسلے میں معین الدین و جیون لال لکھتے ہیں:

" ۲۵/ جون ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے ایک شخص عبدالصالح خان کے نام حکم بھیجا کہ نواب مصطفیٰ خان کو بحفاظت تمام دھلی بھیجا جائے"[۲]

اسی طرح ایک اور اقتباس اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ہوڈل پلول کا انتظام بھی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کو تفویض کیا گیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکا:

" ۲۱/ ذیعقد، ۱۵/ جولائی: نواب صمصام الدولہ فرخ جاہ احمد علی خان بہادر وزیر مالیات نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہوڈل پلول کا انتظام مصطفیٰ خان کے اور ہتین کا بندوبست غلام حسین خان کے لڑکے کے لیے مخصوص ہوا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوا -"[۳]

۱- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۱، عبداللطیف، (مرتبہ خلیق احمد نظامی)

۲- غدر کی صبح و شام (اردو ترجمہ روزنامچہ معین الدین و جیون لال)ص ۱۳۵، شائع کردہ خواجہ حسن نظامی پریس ۱۹۲۶ء

۳- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۳۸-۱۳۹، عبداللطیف (مرتبہ خلیق احمد نظامی)

بہرحال ابو ظفر بہادر شاہ سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے تعلقات ۱۸۵۷ء میں ضرور تھے ۔ اسی جرم میں ان کو سات سال کی سزا ہوئی ۔ ان کو سات سال کی پوری قید بھگتنی نہیں پڑی بلکہ جلد ہی رہا ہو گئے ۔[۱]

۲۔ قید و بند کے مصائب :

شیفتہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جس انداز سے وطن دوستوں کا ساتھ دیا اس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے ۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پا لینے کے بعد شیفتہ پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا اور اس کے نتیجے میں سات(*) سال کی قید اور تمام املاک اور پنشن کی ضبطی کا حکم سنایا ۔ لیکن شیفتہ ، نواب صدیق حسن خان کے مطابق دو تین ماہ کے بعد ہی رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ، چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

" ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) واقعۂ فتنۂ ہندوستان ایشان نیز ماخوذ شدند و املاک جملگی بہ ضبط درآمد و حکم قید ہفت سال شد ، لیکن بعد دو سہ ماہ از زندان نجات یافت ---"[۲]

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳۹۲، محمد ایوب قادری

۲۔ تاریخ قنوج (قلمی) ص ۱۰۸ ، نواب صدیق حسن خان (بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) (واقعات و شخصیات)ص ۳۹۳ مرتبہ محمد ایوب قادری

(*) نوٹ: عرشی صاحب " مکاتیب غالب" ، طبع ششم (حواشی) ص ۱۵۸ ، پر مدت قید چھ سال بتاتے ہیں (بحوالہ کلیات شیفتہ مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری ، ص ۲۳) ، یہ غلط ہے کیونکہ نواب صدیق حسن خان ، غالب ، صاحب گل رعنا وغیرہ کی تحریروں سے سات سال قید کی سزا کا پتہ چلتا ہے ۔ (مقالہ نگار)

غالب کے ایک خط سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ھے کہ شیفتہ کو اپریل ۱۹۵۸ء

مین سزا کا حکم سنایا جا چکا تھا، چنانچہ وہ اپریل ۱۸۵۸ء مین حکیم نجف خان کو

لکھتے ھین: (خط پر اپریل کے مہینے کی تاریخ نہین لکھی)

" مصطفیٰ خان کا حال سنا ہوگا؟ خدا کرے مرافعہ مین چھوٹ جائے،

ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ مین کہان؟"[۱]

جن دنون شیفتہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے الزام مین قید و بند کی صعوبتون

مین گرفتار تھے، نظامی بدایونی[۲]، خواجہ الطاف حسین حالی کے حوالے سے فرماتے ھین کہ

ایّام غدر ۱۸۵۷ء مین جبکہ نواب صاحب مصیبت حبس مین بمقام میرٹھ تشریف رکھتے

تھے، ایک مرتبہ بہت کوشش سے اپنے مہربان قدیم، شرمیل صاحب کے پاس، جو پہلے

کلکٹر بلند شہر اور بعد مین میرٹھ مین جج ہو کر آ گئے تھے، یہ پیام بھجوایا

کہ آپ کسی وقت آ کر مجھے مل لین - انھون نے علی الصبح آنے کا وعدہ کیا - چنانچہ جب

وہ حسب وعدہ آئے تو نواب صاحب اس وقت دوگانہ سنّت ادا کر کے فریضہ کے تہیہ

مین تھے کہ آدمی نے اطلاع کی - نواب صاحب نے نہایت اطمینان کے ساتھ نیت فریضہ

باندھ لی اور حسب عادت سورۂ دھر پڑھی - اختصار گوارا نہ فرمایا - نتیجہ یہ ہوا

کہ شرمیل صاحب بعد انتظار بسیار واپس چلے گئے اور ایک ظاہری قوی تدبیر ہاتھ سے

جاتی رہی - مگر اس تدبیر کے فوت ہونے سے ان کے استقلال مین کچھ فرق نہ آیا -

---

۱- خطوط غالب حصّہ دوم، ص ۷۰، مرتبہ غلام رسول مہر مولانا

۲- کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۲۹، مرتبہ نظامی بدایونی

اسی طرح نظامی بدایونی، حاجی باسط علی صاحب ، ساکن کرسی، جو ایک دیندار اور ثقہ آدمی تھے کے حوالے سے فرماتے ہین کہ مصائب ایام غدر مین ایک دن نواب صاحب مرحوم پیادہ پا محافظین کے ساتھ سڑک پر جاتے تھے ۔ اس اثناء مین آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تیری شان کریمی کے قربان، اتنی ہی سزا دی ورنہ مین تو اس سے بہت زیادہ سزا کا مستوجب ہون ۔

۳- برئیت -- قید و بند سے رہائی :

نظامی بدایونی، بغاوت کے الزام سے، شیفتہ کی بریّت کے بار ے مین فرماتے ہین :

" نواب صاحب پر بغاوت کا الزام بھی لگایا گیا تھا اور کچھ عرصہ تک یوسف زندان بنائے گئے تھے ۔ مگر آخرکار اس سے گلوخلاصی ہوئی اور نواب صاحب بفضل خداوندی مامون مصئون رہے اور مدارج و مناصب بھی برقرار رہے ۔"[1]

نواب صدیق حسن خان نے شیفتہ کی رہائی کے لیے بڑی کوشش کی ۔ اس ضمن مین وہ خود فرماتے ہین :

" در ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) بزمانہ برگشتگی افواج ہند ہر گاہ (بہ) تہمت غدر مبتلا شدہ ، بحبس افتاد ۔ محرّر سطور

۱- کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۲۸ ، مرتبہ نظامی بدایونی

بواسطۂ بعض حکام سعیٔ موفور در اخلاص بکار برد و حق تعالیٰ
او را (شیفتہ) ازان عقبہ کود نجات بخشید ۔[1]

نواب صدیق حسن کی کوششوں کا ذکر عبداللطیف کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے:

" ۔۔۔ ہنگامے کے بعد ان کو (شیفتہ) سات سال کی سزا ہوئی ۔
نواب صدیق حسن کی کوشش سے رہائی ہوئی ۔۔۔[2]"

غالب کے ایک خط مورخہ ۲/ فروری ۱۸۵۹ء بنام میر مہدی مجروح سے پتہ چلتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء یا اواخر ۱۸۵۸ء میں شیفتہ کو قید و بند سے رہائی مل گئی تھی، لیکن جہانگیرآباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا ۔ لہذا غالب فرماتے ہیں:

" ۔۔۔ نواب مصطفیٰ خان بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی ۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے ۔ جہانگیرآباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنسن (پنشن) کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا ۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں ۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے، ڈاک میں بیٹھ

---

۱ ۔ شمع انجمن، ص ۱۳۲، نواب صدیق حسن خان، مطبع شاہجہان ۱۳۹۳ء، بھوپال

۲ ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۲۰۳، از عبداللطیف (مرتبہ خلیق نظامی)

کر میرٹھ گیا ۔ ان کو دیکھا ۔ چار دن وہاں رہا ۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا ۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں ، مگر ہفتہ کو گیا ۔ منگل کو آیا ۔ آج بدھ دوم فروری ہے ۔ مجھکو آئے ہوئے نواں دن ہے --- ۲ / فروری ۱۸۵۹ء ۔"[1]

ایک اور خط مورخہ ۲۶ / جنوری ۱۸۵۹ء بنام تفتہ میں غالب کہتے ہیں :

" جواب میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خان کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا ۔ تین دن وہاں رہا ۔ کل وہاں سے آیا ۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا --- محررہ و مرسلہ چہارشنبہ ۲۶ / جنوری ۱۸۵۹ء ۔"[2]

اسی موضوع پر غالب نے ایک اور خط تفتہ کو ۳۰ / جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا ہے :

" --- میرٹھ سے آ کر تم کو خط لکھ چکا ہوں ۔ شاید نہ پہنچا ہو ۔ اس واسطے از روئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خان کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبہ کے دن دلّی آگیا اور چہار شنبہ کے دن تم کو خط بھیجا --- صبح یکشنبہ سی ام

۱۔ خطوط غالب حصّہ اول ، ص ۳۰۵ ، مرتبہ غلام رسول مہر مولانا

۲۔ ایضاً ، ص ۱۶۲

(۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء)[1] -"

مندرجۃ بالا شواھد کے پیش نظر نواب صدیق حسن خان کا یہ کہنا کہ شیفتہ کو دو تین ماہ کے بعد ھی رھائی مل گئی تھی درست نہین ھے - غالب کے خطوط سے واضح ھو جاتا ھے کہ شیفتہ کم و بیش سات آٹھ ماہ ضرور قید و بند کی تکلیفون مین گرفتار رھے - بہرحال اس رھائی کی شکرگزاری اور جائیداد کی واگزاشت کی سفارش کے لیے خود شیفتہ نے بھی نواب صدیق حسن خان کو ایک خط لکھا تھا جو " شمع انجمن " از نواب صدیق حسن خان مین موجود ھے - خط کی عبارت:

" خط سامی کہ در زمان مبتلا بودن مخلص بہ بند بلا بنام صدر الصدور صاحب بہادر رسیدہ بود بر طبق آن صاحب ممدوح آن چنان مساعی جمیلہ و کوشش ھائی نبیلہ فرمودند کہ صورت نجات مخلص بظہور رسیدی - آرے مقتضائے صحت ھائے سامی ھمی بود - این احسان فراموش شدن نیست - اکنون نجات صوری روداد ، لیکن نجات معنوی باقی است - یعنی جائداد وغیرہ - وجوہ معاش ھنوز مطلق واگزاشت شدہ - این مقدمہ ھم باجلاس صدرالصدور موصوف رسید - پس ضرورت افتاد کہ بہ آنجناب اطلاع کنم تا بنام شان خط سفارش چنانکہ سابق نوشتہ اند بر قیم فرمائید و تحریر این معنی کہ بظہور این امر شکرگزار سامی خواھم شد - فضول است کہ میان ما و شما گنجائش ھمچو امور

---

۱ - خطوط غالب حصّہ اوّل ، ص ۱۷۲ ، مرتبہ غلام رسول مہر

نیست که یاد از بیگانگی ها می دهد و ظاهر است که بار این منت بس عظیم خواهد بود ۔ مورخہ یکم شعبان ۱۲۷۶ھ (مطابق فروری ۱۸۶۰ء) "

یہ خط ملنے پر نواب صدیق حسن خان نے دوبارہ سفارش کی چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

" چون این خط آمد خط دیگر به مومن علی خان صدالصدور ساکن سندیلہ نوشتہ شد و نیمہ معاش بعد کشش و کوشش بسیار واگزاشت ـ "[1]

مندرجہ بالا بیانات سے یہ بات بھی سامنے آ جاتی ہے کہ فروری ۱۸۶۰ء تک شیفتہ کی جائیداد اور پنشن کے واگزاشت ہونے کا حکم نہیں ہوا تھا ۔ اس کے بعد آدھی جائیداد واگزاشت ہوگئی۔

شیفتہ کی پنشن ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء تک بھی واگزاشت نہیں ہوئی تھی حالانکہ ان کی بہن کی پنشن دوبارہ ملنے لگی تھی ۔ شیفتہ کی پنشن کی یہ صورت آخر دم تک قائم رہی ۔ چنانچہ غالب اپنے ایک خط بنام میرزا تفتہ میں فرماتے ہیں :

" --- جناب بھائی صاحب یعنی مصطفیٰ خان بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہدینا ۔ ہمشیر کی پنشن کا جاری ہونا بہت خوشی کی بات ہے ۔ مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے ۔ کیا

۱۔ شمع انجمن ، ص ۱۳۲ ، صدیق حسن خان نواب

عجب ھے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بر روئے کار آوے یعنی آپ کا پنشن بھی جاری ہو جاوے ۔صبح یکشنبہ ۲۰/جنوری ۱۸۶۱ء"۔[1]

شیفتہ کی رہائی اور جائیداد کی واگزاشت کے سلسلے میں غالب کو بھی خاصی تشویش رہی اور انھوں نے بھی حتی المقدور کوشش کی ۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر، مولانا ابوالکلام کے حوالے سے فرماتے ھین :

" شیفتہ کے مرافعہ کی کامیابی مین مرزا غالب کی سعی و کاوش کو بھی کافی دخل ھے ۔ نواب صدیق حسن جب دھلی مین مفتی صدر الدین سے پڑھتے تھے تو مرزا غالب سے بھی رسم و راہ ہوگئی تھی اور شاید ان سے فارسی کی بعض چیزین پڑھی بھی تھین ۔ غدر کے بعد وہ سکندر جہان(*) بیگم کے پیش کار ہو گئے ۔ ان کی آئندہ ترقیون کا یہ پہلا زینہ تھا ۔ ان کے ایک دوست مومن علی خان، صدرالصدور میرٹھ تھے ۔ شیفتہ نے غالب کو لکھا کہ اگر مومن علی خان کے نام بھوپال سے سفارشی خط آ جائے تو ان کی مشکل آسان ہو سکتی ھے ۔ غالب نے صدیق حسن خان کو لکھا اور انھون نے

۱۔ خطوط غالب حصّہ اول، ص ۱۸۹، مرتبہ غلام رسول مہر مولانا

(*) نوٹ: ماثل دھلوی (مضمون : نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ دھلوی)، ص ۳۱ بحوالہ تسنیم ، جلد اول، شمارہ ۱، آگرہ ، جنوری ۱۹۳۱ء، کلب علی خان فائق رامپوری بحوالہ گلشن بے خار (مقدمہ) ص ۳۵ پر شاھجہان بیگم لکھتے ھین، اس لیے " سکندر جہان" درست معلوم نہین ہوتا (مقالہ نگار)

مومن علی خان سے سفارش کی ۔ اس کے بعد جائداد کی واگزاری کے لیے مرافعہ کیا گیا تو نواب صدیق حسن خان کو مکرّر سفارش کے لیے لکھا گیا ۔ چنانچہ انھوں نے دوبارہ خط لکھا اور اس طرح علاقہ بھی چھوڑ دیا گیا ۔"[1]

نواب صدیق حسن خان سے شیفتہ کے ذاتی تعلقات (بھی) تھے ۔ چنانچہ محمد ایوب قادری لکھتے ہین :

" نواب صدیق حسن خان قنوجی ثم بھوپالی جس زمانے مین تحصیل علم فرماتے تھے ، اسی زمانے مین وہ تقریباً دو سال شیفتہ کے یہان مقیم رہے تھے ۔"[2]

۳۔ بریّت کے بعد:

قید و بند سے رہائی کے بعد شیفتہ کا زیادہ تر وقت جہانگیرآباد ھی مین گزرنے لگا اور اب وہ زیادہ تر اذکار و عبادات مین مشغول رہنے لگے تھے ۔ نظامی بدایونی فرماتے ھین :

" غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے نواب صاحب کے رہنے کا اتفاق زیادہ تر

۱۔ غالب ، ص ۲۸۶-۲۸۷ ، غلام رسول مہر مولانا

۲۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)ص ۳۹۳ ،

جہانگیرآباد میں ہوتا تھا جہاں نہ دہلی کے سے علمی چرچے تھے نہ اہل کمال کا وہ علمی جھمگٹا۔ اس لیے شعر و شاعری کا شغل بہت کم ہو گیا تھا اور دراصل جب سے زیارت حرمین شریفین سے واپس آئے آپ کسی دوسرے ہی حال میں تھے۔"[1]

کلب علی خاں فائق رامپوری کا کہنا ہے کہ اس قید و بند سے رہائی کے بعد شیفتہ نے مستقل قیام جہانگیرآباد میں اختیار کیا اور خاموشی سے اپنی زندگی کے باقی دن گزار دیئے۔[2] یہاں تک کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست بھی جہانگیرآباد ہی میں کیا۔ کلب علی خاں فائق رامپوری ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:

"شیفتہ کے لیے یہ قیدو بند سخت آزمائش تھی لیکن انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا اور پھر گزشتہ وقار بحال ہوگیا۔ ۱۸۵۹ء میں انھیں رہائی مل چکی تھی۔ اب انھوں نے زیادہ تر جہانگیرآباد ہی میں رہنا شروع کیا۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام بھی وہیں کیا۔"[3]

(د) وفات ۔ مزاجی خصوصیات

۱۔ علالت، صبر و استقامت اور وفات:

شیفتہ کو مرض ذیابیطس لاحق ہو گیا تھا اور آخر میں ہاتھ پر ایک کالا

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)، ص ۳۵، مرتبہ نظامی بدایونی

۲۔ کلیات شیفتہ (مقدمہ) ص ۲۳، مرتبہ کلب علی خاں فائق رامپوری

۳۔ گلشن بے خار (مقدمہ)، ص ۳۵، مرتبہ کلب علی خاں فائق رامپوری

دانہ بھی نکل آیا تھا جو بڑھتے بڑھتے مہلک ثابت ہوا۔ نظامی بدایونی فرماتے ہیں :

" ذیابیطس کا مرض پہلے سے تھا ۔ وقت آخر ہاتھ میں ایک کالا دانہ نکلا تھا ۔ وہی موت کا بہانہ ہوا۔،، [1]

غالب کے ایک خط بنام شیفتہ مورخہ ۱۲/ اکتوبر ۱۸۶۳ء سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شیفتہ علاج کی غرض سے دلّی آئے ہوئے ہیں اور حکیم احسن اللہ خان کے زیر علاج ہیں :

" --- پرسوں سے نواب مصطفیٰ خان صاحب آئے ہوئے ہیں ۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے ۔ ابھی یہین رہیں گے ۔ بیمار ہیں ۔ حکیم احسن اللہ خان معالج ہیں ۔ فصد ہو چکی ہے ۔ جونکیں لگ چکی ہیں ۔ اب مسہل کی فکر ہے ۔ سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔،، [2]

بشیرالدین دھلوی ، شیفتہ کی علالت کے دوران کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ شیفتہ کتنے صابر، قانع اور راضی برضائے الٰہی تھے:

" --- شمس العلماءؒ مولوی ذکاء اللہ ناقل تھے کہ دھلی میں نواب صاحب کو مرض سرطان عارض ہوا۔ ڈاکٹر آپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص حصّہ گوشت کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی اور اوپر والوں

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۵۷، مرتبہ نظامی بدایونی

۲۔ خطوط غالب حصّہ اول ، ص ۲۰۷ ، مرتبہ غلام رسول مولانا مہر

سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک روز صاحبزادے محمد علی خان بے اختیار رونے لگے ۔ نواب صاحب کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آتا تھا۔ صاحبزادے سے کہا : میاں اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہے ۔ انسان کو اپنی مصیبت پر رونا نہ چاہیئے ۔"[1]

اسی طرح نظامی بدایونی ، شیفتہ کا وفات کے دن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے ان کے صبر و استقامت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے :

" وفات کے دن جس روز سفر آخرت درپیش تھا ، اعزا علاج میں مصروف تھے ۔ ڈاکٹر نے ایک نسخہ تجویز کیا جس میں پورٹ وائن شامل تھی ۔ جس وقت یہ نسخہ لکھا جا رہا تھا نواب صاحب نے فوراً ہی آنکھ کھولی اور حاضرین سے کہا کہ میری روح کو اس وقت بڑا صدمہ ہو رہا ہے ۔ سچ بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر صاحبزادہ محمد علی خان نے عرض کیا کہ حضرت ہم سے گستاخی ہوئی ہے یعنی ایک نسخہ لکھوایا گیا ہے جس میں پورٹ وائن شامل ہے ۔ فرمایا کہ " الحمدللہ " وقت پر اطلاع ہو گئی اور موقعہ نہ ملا کہ اس نسخے کا استعمال کیا جائے ۔ اور یہ بھی فرمایا کہ تم اللہ کا شکر کرنا کہ اس نے آخری وقت میں تمہارے باپ کو گمراہی سے

۱۔ واقعات دارالحکومت ، ص ۲۳۲

۲۳/ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۹/ ستمبر ۱۸۶۹ء نوٹ کی تھی، جو حالات و واقعات کے پیش نظر قابل قبول نھین ھے، کیونکہ "کلیات نثر حالی"، جلد اول مین انھوں نے شیفتہ کا سن وفات صرف ۱۸۶۹ء درج کیا ھے -[1] اگر وہ تحقیق کی رو سے درست سمجھتے تو شیفتہ کی تاریخ وفات وھی لکھتے جو مقالہ نگار نے ان کی ڈائری سے نوٹ کی تھی - نیز یہ کہ مذکرہ تاریخ وفات کسی حوالے پر بھی مبنی نھین ھے - لھذا شیفتہ کی تاریخ وفات "تقویم تاریخی" کے مطابق ۱۱/ جولائی ۱۸۶۹ء ھی درست تسلیم کرنا پڑتی ھے (یکشنبہ یکم ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ) -

نظامی بدایونی فرماتے ھین کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اپنا کفن بیت اللہ سے لے کر آئے تھے اور اسی مین کفنائے گئے -[2]

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی مین یہ بات بھی واضح ھو جاتی ھے کہ شیفتہ نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی ، تریسٹھ سال کی نھین جیساکہ عام کتابوں مین درج ھے -

۲- عادات و اخلاق :

شیفتہ کی کچھ عادات و اخلاق تو گزشتہ صفحات مین بیان ھو ھی چکے ھین لیکن مزید روشنی ڈالنے کے لیے نظامی بدایونی کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جا

۱- کلیات نثر حالی، جلد اول، ص ۳۲۷، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی شیخ
۲- کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)، ص ۵۷، مرتبہ نظامی بدایونی

بچا لیا کہ اسے اپنی صحت کے لیے احکام شرعی کی خلاف ورزی کا موقعہ نہ ملا۔[1]،،

شیفتہ بیماری کے دنوں میں اپنی حویلی (کوچہ چیلان واقع دھلی) میں مقیم تھے ۔ یہیں ان کا انتقال ہوا اور سلطان جی (مزار نظام الدین اولیا) میں اپنی خاندانی ھڑواڑ میں دفن ہوئے ۔ کلب علی خان فائق رامپوری کے الفاظ میں :

" شیفتہ بیماری کے دنوں میں دھلی میں اپنی حویلی (کوچہ چیلان) میں مقیم تھے ۔ یہیں انتقال ہوا اور سلطان جی (مزار نظام الدین اولیاء) میں اپنی خاندانی ھڑواڑ میں دفن ہوئے ۔ مولانا حالی نے آیۂ کریمہ ،، و حلّوسا ورامن فضہ ،، (سورۂ دھر) سے تاریخ وفات نکالی۔[2]،،

حالی نے جو تاریخ وفات نکالی ھے وہ ان کی تصریح کے ساتھ درج ذیل ھے جو " تاریخی جملہ مقتبس از قرآن مجید ،، کے عنوان کے تحت دی گئی ھے :

" تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خان مرحوم، رئیس جہانگیرآباد متخلص بہ حسرتی و شیفتہ :جزاھم بما صبر واجنات و حریرا" ۔ اس آیۂ قرآنی میں " بما صبر و اجنۃ و حریرا ،، ھے۔ چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رھتی تھی اس لیے " جنۃ ،،

---

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۵۷-۵۸، نظامی بدایونی

۲ ۔ کلیّات شیفتہ (مقدمہ)ص ۲۳ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

کی جگہ " جنات ،، کر دیا گیا ھے جیساکہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے " فروح و ریحان و جنت نعیم ،، کے " ھھنا روح و ریحان و جنات النعیم ،، کر دیا ھے ۔ چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام، بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے، اس لیے اس آیت کا مضمون ان کے وفات کے نہایت مناسب تصوّر کیا گیا ۔ یعنی جناب باری نے بعوض ان کے صبر کے بہشت کا لباس ان کو عنایت کیا ۔،،[1]

نظامی بدایونی کے مطابق :

" یہ مادۂ تاریخ مولانا حالی مرحوم و مغفور نے اسی زمانے میں (جب شیفتہ کا انتقال ھوا) نکالا تھا جو آپ کے مزار پر کندہ ھے ۔،،[2]

حالی کے نکالے ھوئے مادۂ تاریخ کے بارے میں کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ھیں :

" ۱ ۔ جزاھم بما صبر و اجنات و حریرا " کتبۂ قبر پر یہی عبارت ھے، لیکن اس سے تاریخ برآمد نہیں ھوتی ۔ آیت یہ ھے : و جزاھم بما صبر و اجنۃ و حریرا " جس کا مجموعہ " ۱۲۸۲ ،، ھوتا ھے — (حصّہ دوم واقعات دارالحکومت دھلی ، ص ۸۰۱، ۸۰۲ از مولوی

---

۱ ۔ کلیات نظم حالی، جلد دوم، ص ۳۳۲، مرتبہ افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر

۲ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۵۸، مرتبہ نظامی بدایونی

(*)
بشیر احمد) ۔

۲۔ بقول مولانا حالی " جنۃ ،، کو بہ اضافۂ الف " جنّات ،، لکھ کر کمی پوری کی گئی ہے ۔ لیکن اعداد کے مجموعے سے " ۱۲۷۷ " بلا واو برآمد ہوتے ہیں ۔ بغیر " الف ،، " ۱۲۷۶ " ہیں ۔ دس عدد کی کمی رہتی ہے ۔ (کلیات نظم حالی جلد دوم ، ص ۳۲۲ ، ناشر مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور) ۔،،[۱]

بہرحال نظامی بدایونی نے مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجدّدی پانی پتی کے حوالے سے شیفتہ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں دو قطعات کا ذکر کیا ہے، جو درج ذیل ہیں :

" (از جناب خواجہ کرامت علی صاحب مرحوم انصاری پانی پتی)

چوں رفت از جہان مصطفیٰ خان امیر — کہ بود اصل پاکیزہ و پاک فرع

خداوند تقویٰ ، خداوند زھـــد — فقیر آشنا سالک راہ شرع

شد آن فوت آن بے سروپا تمام — وفاؔ ، کرم، بذل و ، تقوی و، ورع

۸۰ ۲۰۰ ۷۰۰ ۱۰۶ ۲۰۰ (۱۲۸۶ھ

(از جناب خواجہ امداد حسین صاحب مرحوم متخلص بہ مظہر پانی پتی)

۱۔ کلیات شیفتہ (مقدمہ) ص ۵۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

چون رئیس ابن رئیس نامدار   کرد رحلت زین جہان بے بقا

سال تاریخ وفاتش فی‌البدیہہ   ملہم غیبی بمن کردہ عطا

کز سر رازی بباید گفت این   " رحمت حق بر محمد مصطفٰی " (۱۱۸۶ھ) "[1]

صفا بدایونی لکھتے ہیں :

" ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا ـــــ سال وفات کا مادہ " ماتم شیفتہ "

یادگار مشتاق ہے ـ "[2]

کلب علی خان فائق رامپوری ، شیفتہ کی وفات کے سلسلے میں ایک اور قطعہ تاریخ کی نشاندہی کرتے ہیں جو درج ذیل ہے :

" (تاریخ وفات نواب مصطفٰی خان شیفتہ شاعر بے عدیل دہلی)

شیفتہ شاعر متین ناگہ   جان بہ جان آفرین سپرد افسوس

بہر تاریخ از فلک جویا   گفت ہاتف " بلیغ مرد " افسوس

(ص ۳۶ ، ۳۷ سرود غیبی مسمی بہ خیابان التواریخ از جویا) " ـ[3]

عبدالقدوس ہاشمی ، شیفتہ کی تاریخ وفات " یکشنبہ یکم ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۱/ جولائی ۱۸۶۹ء " نکالتے ہیں ـ[4] لیکن شیخ محمد اسمعیل پانی پتی کی ایک پرانی ڈائری سے مقالہ نگار نے ان کی نشاندہی پر ۱۹۷۲ء میں شیفتہ کی تاریخ وفات

۱ـ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ۵۸ ، مرتبہ نظامی بدایونی

۲ـ تذکرۂ شمیم سخن بحوالہ کلیات شیفتہ ، ص ۳۰ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۳ـ کلیات شیفتہ (مقدمہ) ، ص ۲۴ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۴ـ تقویم تاریخی ، ص ۳۲۲

۲۲/ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۹/ ستمبر ۱۸۶۹ء نوٹ کی تھی، جو حالات و واقعات کے پیش نظر قابل قبول نہین ہے، کیونکہ " کلیات نثر حالی " جلد اول مین انھون نے شیفتہ کا سن وفات صرف ۱۸۶۹ء درج کیا ہے[1] ۔ اگر وہ تحقیق کی رو سے درست سمجھتے تو شیفتہ کی تاریخ وفات وہی لکھتے جو مقالہ نگار نے ان کی ڈائری سے نوٹ کی تھی ۔ نیز یہ کہ متذکرہ تاریخ وفات کسی حوالے پر بھی مبنی نہین ہے ۔ لہذا شیفتہ کی تاریخ وفات " تقویم تاریخی " کے مطابق ۱۱/ جولائی ۱۸۶۹ء ہی درست تسلیم کرنا پڑتی ہے (یکشنبہ یکم ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ) ۔

نظامی بدایونی فرماتے ہین کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اپنا کفن بیت اللہ سے لے کر آئے تھے اور اسی مین کفنائے گئے[2] ۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی مین یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شیفتہ نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی ، تریسٹھ سال کی نہین جیساکہ عام کتابون مین درج ہے ۔

۲۔ عادات و اخلاق :

شیفتہ کی کچھ عادات و اخلاق تو گزشتہ صفحات مین بیان ہو ہی چکے ہین لیکن مزید روشنی ڈالنے کے لیے نظامی بدایونی کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جا

۱۔ کلیات نثر حالی، جلد اول، ص ۳۳۷، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی شیخ
۲۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۵۷، مرتبہ نظامی بدایونی

رہا ہے :

" نواب مرحوم اس قدر کم گو تھے کہ ابتداء ملاقات میں نئے
آدمی کو خودداری کا گمان ہوتا تھا ، لیکن ان کے جلسے میں کسی
ادنیٰ یا اعلیٰ کی غیبت کا گزر نہ تھا ۔ ان کی صحبت متین
اور مہذب ظرافت اور لطیفوں سے خالی نہ تھی یعنی زھد خشک
سے جو ریا کے درجے تک پہنچتا ہے بری تھی ۔ دینی و دنیوی
جو بات تھی بناوٹ اور تصنّع سے کوسوں دور تھی ۔[1]"

اسی طرح ماشل دھلوی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں :

" نواب صاحب پابند وضع ، خوش اخلاق اور مذھبیت و اتقا کے
دلدادہ ، نہایت صابر و مستقل مزاج بزرگ تھے ۔ تسلیم و رضا کی
دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی ۔ ہر حال میں خوش رہنا ان کی
زندگی کا نمایاں ترین وصف ہے ۔ طبیعت میں استغنا بہت تھا ۔
حرص و طمع نام کو نہ رکھتے تھے ۔ مہمان نوازی و فیاضی میں
بہت مشہور تھے ۔ شریعت کے اتنے پابند تھے کہ بھول کر بھی کسی
ناجائز یا غیر مشروع امر کے ارتکاب پر آمادہ نہ ہوتے تھے ۔
مجدّدی نقشبندی خاندان کی بیعت اور اپنے فطری مقتضائے طبیعت
سے اس باب میں بہت سخت تھے ۔ ایک شعر میں نہایت حکیمانہ انداز

---

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ص ٦ ، مرتبہ نظامی بدایونی

سے اس جانب اشارہ کیا ہے :۔

ڈر ہے کہ ہو نہ شوق مزامیر شیفتہ   ورنہ کبھی سماع مجرّد سنا کروں[۱]،،

شیفتہ صرف صوفیٔ باصفا ہی نہ تھے بلکہ عالم باعمل بھی تھے ۔ آپ نے اپنی ذات کے فائدے کے لیے کبھی کسی شرعی مسئلے میں تاویل و توجیہہ کو پسند نہیں فرمایا۔ نظامی بدایونی فرماتے ہیں کہ حالی مرحوم نے " حیات جاوید ،، میں جو سرسید احمد خان صاحب کے بار ے میں ہے، شیفتہ کے بار ے میں بھی مندرجہ ذیل حقائق سے پردہ اٹھایا ہے :

" ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب مصطفیٰ خان مرحوم رئیس جہانگیرآباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گرو تھا۔ بہت مدّت کے بعد مالک نے اس کو چھڑانا چاہا۔ ہرچندکہ رہن نامہ میں تمام منافع مرہونہ کامرتھن کو صا معاف و صباح کر دیا گیا تھا اور فک رہن کے وقت مالک بخوشی‌کل زر رہن ادا کرنا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتویٰ دیدیا تھا ، لیکن اس مرحو م و مغفور نے یہ حدیث پڑھی کہ استفت قلبک ولو افتاک المفتون اور جس قدر محاصل اس موضع سے وصول ہوا تھا زر رہن میں سے سب مجرا دیکر باقی روپیہ رہن سے لے لیا۔ یہ بات دھلی میں آج تک مشہور ہے کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہ اس احتیاط کے سبب کہ آموں کی فصل قبل پھل آنے کے عموماً فروخت ہو جاتی ہے جو

۱۔ تسنیم ، ص ۳۲ ، جلد اوّل ، شمارہ ۱ ، آگرہ ، جنوری ۱۹۳۱ء

شرعاً* ناجائز ھے کبھی آم نہین کھاتے تھے ۔ نواب صاحب نے اپنے علاقہ مین سختی سے اس شرعی احتیاط کو قائم رکھا تھا کہ جب تک پورے طور پر پھل نہ آ جائے اس وقت تک فصل فروخت نہ کی جائے ۔ چنانچہ اب تک وہ قاعدہ جاری ھے ۔ اسی وجہ سے شاہ صاحب ھمیشہ جہانگیرآباد کا آم بغیر کسی عذر کے کھایا کرتے تھے۔[1]"

۳۔ حلیہ و جامہ زیبی :

شیفتہ کا جسم بھاری تھا اور آثار بلادت ان کے چہرے سے ظاہر تھے ۔ انھین دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ایک عالم و فاضل شخص ھین ۔ نواب صدیق حسن خان کے الفاظ مین :

" از اتفاق عجیبہ این است کہ بہ سبب فربہی جسم و آثار بلادت کہ بر صورت ایشان ظاھر است ھیچ کس بعد طاقات مگوید کہ ایشان صاحب علم و فہم خواھند بود ۔[2]"

فرحت اللہ بیگ نے بھی زبانی روایت کی بناء پر شیفتہ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ھے :

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۱۱-۱۲ ، مرتبہ نظامی بدایونی

۲۔ تاریخ قنوج (قلمی) ، ص ۱۰۲ ، نواب صدیق حسن خان (مخزونہ حبیب الرحمن شروانی کلیکشن ، جہلم یونیورسٹی علی گڑھ) بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء(واقعات و شخصیات) ، ص ۳۸۹

" جامہ زیبی مین حکیم مومن خان کے بعد دھلی مین نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ھی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نچی گول، سیاہ داڑھی بہت ھی بھلی معلوم ھوتی تھی ۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس مین بھی زیادہ تکلف نہین تھا۔ تنگ مہری کا سفید پجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پچ گوشیہ ٹوپی پہنے ھوتے تھے۔"[۱]

فرحت اللہ بیگ نے " دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ (دھلی کی آخری شمع) " مین جہان شیفتہ کی ایک مشاعرے مین شرکت کا حال لکھا ھے وھان ان کے غزل پڑھنے کا انداز اور رکھ رکھاؤ پر بھی روشنی ڈالی ھے :

" جب ذرا سکون ھوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے سامنے آئی ۔ ان کا کیا کہنا۔ استادان فن مین شمار کیے جاتے ھین ۔ مومن کے شاگرد ھین مگر خود استاد ھین ۔ انھون نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی ۔ یہ سن کر ذرا خاموش ھوئے اور شعر دوسرون کی نظرون سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کی ترتیب دینا ایسے ھی لوگون کا کام ھے ۔ پڑھتے بھی ھین تو ایک ایک لفظ سمجھا کر، آواز ایسی اونچی ھے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی

۱۔ دلی کی آخری شمع (دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ) ، ص ۲۹ ، (طبع چہارم، اپریل ۱۹۳۰ء ، دلی پرنٹنگ ورکس، دھلی)

دے ـ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا ـ ذرا انگرکھا درست کیا ، ٹوپی درست کی ، انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی ـــ غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے ـ مگر تعریف بھی سنبھل سنبھل کر کی گئی ـــ[1]"

۲ـ رواداری و احباب نوازی :

شیفتہ کے بہت ہی قریبی دوستوں مثلاً غالب، مومن، حالی وغیرہ سے روابط کی تفاصیل پانچویں باب میں پیش کی گئی ہیں ـ یہاں اختصار کے ساتھ ان کے عام اور روزمرّہ کے انداز رواداری اور احباب نوازی کا ذکر کیا جا رہا ہے ـ نظامی بدایونی فرماتے ہیں :

" نواب صاحب کی ذات گوناں گوں صفات کی جامع تھی ـ اہل امارت میں امیر تھے تو ارباب فقر میں فقیر ـ طبقۂ علماء میں عالم تھے تو زمرۂ شعراء میں شاعر اور اہل ادب میں ادیب ـ اس طرح آپ کا دائرۂ احباب بھی بہت وسیع تھا ـ بعض احباب فنّی لحاظ سے آپ کی ملاقات و دوستی کو موجب فخر سمجھتے تھے ـ بعض حضرات جو علم و فضل کے جوہر شناس تھے آپ سے رسم مودت پیدا کرتے تھے ـ ارباب

۱ـ دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ (دلّی کی آخری شمع) ، ص ۹۹ ، مطبوعہ تاج بک ڈپو ، لاہور

طریقت بتقریب هم مشربی آپ سے ملتے تھے ۔ بعض کے مراسم امارت و ثروت کے تعلقات سے وابستہ تھے ۔ ان مین بعض احباب کا ذکر جمیل موقعہ بہ موقعہ ان حالات کے ضمن مین آیا ھے (جو بیان کیے جا چکے ھین) ۔ ان کے علاوہ خاندان کمبوھان سے بزرگان میرٹھ مین آپ کے احباب نواب احمد اللہ خان و منشی ممتاز علی خان (اس نام کے دو بزرگ تھے) اور حافظ عبدالکریم صاحب رئیس لال کرتی اور شیخ محمد صاحب تھانوی تھے۔[۱]"

مسلمان تو مسلمان ھندو بھی آپ کے حسن اخلاق سے بہت متاثر تھے اور آپ سے نہایت خلوص سے ملتے تھے:

" ھندو روسا٫ دھلی آپ سے نہایت خلوص رکھتے تھے اور وہ آپ کو اپنے یہان شادیون مین باصرار بلاتے تھے لیکن جس وقت آپ تشریف لے جاتے تھے تمام ناچ رنگ موقوف ھو جاتا تھا۔[۲]"

شیفتہ کی احباب نوازی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ھے کہ ایک مرتبہ سید ظہیرالدین ظہیر، مہاراجہ شیودان سنگھ کی ملازمت ترک کرکے دلّی آ گئے ۔ یہا ن سے شیفتہ کی سفارش لے کر جے پور گئے ۔ سفارش کا یہ اثر ھوا کہ محکمہ پولیس مین ان کو جگہ مل گئی۔[۳]

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی(حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۳۴-۳۵، مرتبہ نظامی بدایونی

۲۔ ایضاً ، ص ۳۹

۳۔ گل رعنا ، ص ۳۳۸ ، عبدالحیٔ مولانا

شیفتـہ کی رواداری و احباب نـوازی کا ذکر کرتے ہوئے حبیب اشعر فرماتے ہیں :

" ـــ حکیم مـومن خان مـومن ، مرزا اسداللہ خان غالب ، مفتی صدرالدین خان آزردہ ، حکیم احسن اللہ خان ، مـولانا امام بخش صہبائی ، نـواب ضیاء الدین احمد خان نیـر و رخشان ، سید غـلام علی خان وحشت اور میـر حسین تسکین ان کے احباب خاص میں تھے۔[۱] "

شیفتـہ کی رواداری کی ایک مثال یـہ بھی ہے کـہ " گلشن بے خار " میں مشمولہ بہت سے شعراء کے حال میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ ان سے ان کا ملنا جلنا اور راہ و رسم تھی ۔[۲] مثلاً

آشوب (ص ۷) ، آشفتـہ (ص ۱۰) ، احسان (ص ۱۲) ، اصغر (ص ۲۳) ، اکبـر (ص ۲۸) ، امیـر (ص ۲۸) ، امجد (ص ۳۰) ، انیس (ص ۳۲) ، تسکین (ص ۵۱) ، جراح (ص ۵۹) ، خـرد (ص ۸۷) ، دلگیـر (ص ۹۸) ، رضا (ص ۱۱۲) ، رضی (ص ۱۱۲) ، سرور (ص ۱۳۲) ، شورش (۱۵۲) ، شہیدی (ص ۱۵۸) ، عـظمت (ص ۱۹۱) ، فـارغ (ص ۲۰۳) ، کـرم (ص ۲۲۸) ، کوثـر (۲۳۳) ، محزون (ص ۲۳۰) ، محمـود (ص ۲۳۵) ، مسکین (ص ۲۵۰) ، مـضطر (ص ۲۵۷) ، مـضطر (ص ۲۵۷) ، منـصف (ص ۲۷۲) ، مـوج (ص ۲۷۳) ، مـومن (ص ۲۷۵) ، نـامـی (ص ۳۰۷) ، نـصیـر (ص ۳۱۹) ، وحشت (ص ۳۲۵) وغیـرہ ۔

۱ـ دیـوان شیفتـہ (دیباچہ) ، ص ۲۳۸ ، مرتبہ حبیب اشعر

۲ـ گلشن بے خار از شیفتـہ مترجمہ نـفیس اکیڈمی ، کراچی

اسی طرح شیفتہ نے " رقعات فارسی ،، موسوم بہ لحن عراق ،، میں اپنے مختلف دوستوں کے نام خطوط لکھے ھیں جن سے ان کی رواداری ، احباب نوازی ، خلوص اور محبت کا پتہ چلتا ھے ۔ " رہ آورد ،، (ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک) سے بھی ان کی رواداری اور احباب نوازی کا اندازہ ہوتا ھے ۔

تیسرا باب

شیفتہ کی شاعری
==================

(الف) اردو شاعری (شیفتہ)

۱۔ شعرگوئی کا آغاز ۔ مومن سے تلمذ:

نواب مصطفیٰ خان اردو مین شیفتہ تخلص کرتے تھے ۔ انھین شاعری کا شوق بچپن ھی سے تھا ۔ سولہ سال کی عمر تک انھون نے شعرگوئی مین کافی مشق بہم پہنچا لی تھی اور تئیس سال کی عمر مین شاعری مین کمال حاصل کر لیا تھا ۔ اس کے بعد اس شغل مین کمی کر دی تھی ۔ " گلشن بے خار ،، مین اپنے بیان مین وہ خود فرماتے ھین :

" فقیر از آوان صبا بہ این شغل منوط بودہ ۔ اکثرے عمر گرامی را رایگان داد ۔ چون ربط بہ این فن از دیگر اشغال عالیہ و فنون شریفہ باز می دارد ، اکنون دیرگاہ است کہ سروکارم نیست ، مگر بہ تحریک محفلیان گاھے از واردات جدید اتفاق می افتد و آن ھم بعد سالے نہ کہ ماھے ۔،،[۱]

اسی طرح شیفتہ ، " کلیات شیفتہ ،، (اردو) مین رقم طراز ھین :

" در سال شانزدھم ھوئے سخن گوئی دادند ، شہوا بیانی برتر

۱۔ گلشن بے خار ، ص ۲۸۷ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

عادت بخشیدند و در بست و سوم سال امراض کرامت کردند و یک

بارہ دل ازین شغل بر گرفتند ۔۔۔"[1]

مندرجہ بالا بیانات سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ سولہ سال کی عمر میں اچھا خاصا شعر کہنے لگے تھے ۔ اگر اس کے لیے چار پانچ سال کی مشق بھی فرض کر لی جائے تو معلوم ہوا کہ شیفتہ گیارہ برس کی عمر سے شعر کہہ رہے تھے ۔ یہ بات کہ شیفتہ نے نو عمری ہی میں شعرگوئی کا آغاز کر دیا تھا اور اپنے علم و ذہانت ، مطالعہ و مشق اور ارباب کمال کے فیض صحبت سے وہ بہت جلد فن شاعری میں مشاقی و استادی کے درجے پر پہنچ گئے تھے ، ان کے مندرجہ ذیل مقطع سے بھی ظاہر ہوتی ہے

ـہ اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت + گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی[2]

بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیفتہ نے ۱۸۲۰ء یا ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ شاعری کا آغاز کیا ۔ ۱۸۲۵ء تک وہ اچھے خاصے شاعر ہو گئے ۔ ۱۸۳۰ء تک فن شاعری میں کافی ترقی کر لی اور ۱۸۳۲ء تک مشق سخن کو عروج تک پہنچا دینے کے بعد شعرگوئی میں کمی کر دی ۔

ابتداء میں شیفتہ نے مومن خان مومن سے مشورۂ سخن کیا ۔ وہ خود فرماتے ہیں:

" و در مراتب سخن اگرچہ ادائے خاص باسمن است، امّا طبع با ہر روش

چنان مناسب افتادہ کہ بہ ہر شیوہ سخن می کنم کہ ہما نا طرز

۱۔ کلیات شیفتہ (اردو) ، ص ۳۸ ، مرتبۂ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۲۲ ، مرتبۂ کلب علی خان فائق رامپوری

خاص من است ، و این سخن را اگر مجموعۂ نظم و نثر من بمدی مسلّم می داری و هر آن چه در قدسی خمخانہ بخش من داشتہ ، از دست ساقی مصطبۂ سخن مومن خان بہ کاسہ ام ریختند ---"[1]

کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہین کہ دہلی کے شرفا کے لیے شاعر ہونا بھی کمالات علمی مین داخل تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ ، مولوی فضل حق خیرآبادی ایسے علما شعر و سخن کے فدائی تھے ۔ شاہ نصیر، حافظ عبدالرحمان احسان، سرور (مولّف تذکرۂ سرور) ، حکیم قدرت اللہ قاسم (صاحب مجموعہ نغز) ، نظام الدین ممنون ، محمد ابراہیم ذوق ، اسد اللہ خان غالب اور مومن خان مومن وغیرہ بزم ریختہ گوئی کو آراستہ کیے ہوئے تھے ۔ بادشاہ وقت اکبر شاہ ثانی اور ولی عہد بہادر شاہ ظفر، شعراء کی سرپرستی کر رہے تھے ۔ شیفتہ ان شعراء سے کس طرح متاثر نہ ہوتے ۔[2] انھون نے شعر و شاعری مین حصہ لیا اور مشق سخن سے کمال حاصل کیا۔ ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) مین نوجوان شعراء مین غالب اور مومن زیادہ نام آور تھے ۔ لیکن غالب کے طرز بیدل پر بعض ارباب سخن معترض تھے جن مین آزردہ سرفہرست تھے ۔ اسی لیے شیفتہ ، مومن سے مشورۂ سخن کرنے لگے ۔

شیفتہ کے معاصر یا بعد کے تذکرہ نگارون نے متفقہ طور پر مومن خان مومن

۱۔ گلشن بے خار، ص ۲۸۷ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ کلیات شیفتہ ، ص ۱۷ ، ایضاً

سے ان کے تلمذ کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً کریم الدین، ان کو " شاگرد مومن خان کے،، لکھتے[1] ہیں ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کو مومن خان مومن کا نامی شاگرد کہا ہے ۔[2] اسی طرح کلب علی خان فائق رامپوری نے کئی تذکروں سے اقتباسات پیش کیے ہیں ۔ مثلاً

" ۱۔ شیفتہ شاگرد مومن دہلوی	صفا بدایونی (شمیم سخن ص ۳۷)
۲۔ شیفتہ شاگرد رشید مومن خان	صاخ (سخن الشعرا ص ۲۶۷)
۳۔ شیفتہ در ریختہ بہ مومن خان تلمذداشت	صاحب بزم سخن، ص ۷۱-۷۲
۴۔ شیفتہ ـــ از تلامذۂ حکیم مومن خان کسے ہم جاہ او بہر نخاست	مولف تذکرۂ طور کلیم، ص ۶۰-۶۱
۵۔ شیفتہ شاگرد مومن خان صاحب	صفیر بلگرامی (جلوۂ خضر، ص ۲۲۹)
۶۔ شیفتہ شاگرد رشید مومن خان مومن	محسن (تذکرۂ سراپا سخن، ص ۲۸۲) ،،[3]

۲۔ اردو غزل کی روایت اور انیسویں صدی میں شعری دبستانوں کا جائزہ :

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے ۔[4]

۱۔ تذکرہ طبقات الشعرائے ہند، ص ۳۷۰

۲۔ آب حیات ، ص ۲۱۵

۳۔ گلشن بے خار، ص ۳۲، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۴۔ غزل اور مطالعۂ غزل (پیش لفظ)

اسی لیے رشید صاحب نے اس کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے ۔ ان کے خیال میں ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے ۔ غزل اسی لیے ہماری زندگی کے ہر دور میں مقبول خاص و عام رہی ہے ۔ پروفیسر فراق گورکھپوری کہتے ہیں کہ غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے (a series of complexes (کذا) ۔ انہی انتہاؤں کا مترنم خیالات و محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا ہی غزل ہے ۔[1] غزل کا منصب و مقصد تمام نفسیاتی کیفیات و تجربات کا شعور خالص پیدا کر کے ہمیں ایک ناقابل بیان و ناقابل فراموش انبساط و طمانیت عطا کرتا ہے ۔ غزل کو ان لطیف ترین انتہاؤں کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے کم سے کم خارجی اصلیت یا سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر تمام فنون لطیفہ احساس حیات و کائنات کا عطر ہوں تو غزل اس عطر کا عطر ہے ۔ غزل کی ماہیت تہذیب و انسانیت کے مرکزی ، جمالیاتی اور وجدانی تجربات کی اس ماہیت و اصلیت میں پوشیدہ ہے جہاں عقلی ، اخلاقی اور جمالیاتی حقیقتوں کا ایک ماورائی عالم میں یا لامحدود کے مرکز پر سنگم ہوتا ہے ۔ شمیم احمد غزل کو انتہائی مہذب جذبے اور خیال کے بنیادی تاثر کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل کا نام دیتے ہیں ۔[2] غزل کی بنیاد فکر سے زیادہ جذبات پر ہے ۔ اس کے موضوعات انسان کے اطراف اور خارج سے اتنے متعیّن نہیں ہوتے جتنے انسان کی اندرونی کیفیات اور نفس انسانی کی پیچیدگیوں سے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا غزل کو سماجی

۱۔ نگار پاکستان ۔ اصناف شاعری نمبر، ص ۱۱، شمارہ ۱۱، ۱۲

۲۔ ایضاً ، ص ۶۷

رابطہ ، اجتماعی کیفیات اور روحانی وسعتوں کی نقیب و داعی کہتے ہیں [1] ۔ غزل کے دائرۂ عمل میں وسعت اور کشادگی کے عناصر کا وجود اور غزل کا وہ میلان کہ زندگی کو بکھرے ہوئے شکڑوں کی بجائے، غزل کے مخصوص مزاج کی تشکیل میں ممد ثابت ہوتا ہے ۔ غزل انسان کے جن بنیادی احساسات اور خواہشات کو آسودہ کرتی ہے وہ ہزاروں سال سے فرد در فرد ، نسل در نسل، گروہ در گروہ ، قبیلہ در قبیلہ ، قوم در قوم زمانے کی گردشوں سے بے نیاز یکساں چلے آ رہے ہیں ۔ شمیم احمد کے الفاظ میں غزل انسان کے اسی مشترک سرمایۂ حیات کی وہ نغمہ خواں ہے جس میں آج بھی نغمگی اور سرمدی فضا ملتی ہے ۔ جس کو آفاقی کہا جا سکتا ہے ۔ جس پر ایک زمانے، ایک نسل کا ٹھپّہ نظر آنے کے باوجود ایک ایسی قوّت کا اثر بہت نمایاں ہے جو اسے زمانے کی پابندیوں اور خیال کی حدوں سے بالاتر کر دیتی ہے [2] ۔ اس صفت میں غزل کی مقبولیت اور صدیوں تک اس کے اثر و نفوذ کا راز پوشیدہ ہے ۔ پروفیسر حمید احمد خان فرماتے ہیں :

" گزشتہ ایک ہزار برس میں غزل ایک مسلسل ارتقاء کے عمل سے متاثر ہوتی رہی ۔ نئے اسالیب ، نئی عمرانی روایات، نئے مضامین غزل میں جگہ پاتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر زمانے نے غزل کی تشخیص اپنے انداز سے کی ۔" [3]

---

١ ۔ تنقیدی مقالات ، ص ١٣١ ، مرتبہ مرزا ادیب

٢ ۔ نگار پاکستان ۔ اصناف شاعری نمبر، ص ٦٨ ، شمارہ ١١-١٢

٣ ۔ تنقیدی مقالات ، ص ١٠٣ ، مرتبہ مرزا ادیب

غزل عربی لفظ ہے ، مگر عربی صنف نہیں ۔ یہ فارسی زبان کی دین ہے۔ اسے ایرانی تہذیب نے پروان چڑھایا۔ عرب میں صنف قصیدہ بہت مقبول رہی ۔ شاعر تشبیب میں اپنے جوش عشق کا اظہار کرتا۔ ایرانی شعراء نے تشبیب کو غزل کی شکل دی اور صدیاں اس کی نشو ونما میں صرف کر دیں۔ پروفیسر حمید احمد خان نے غزل کے ارتقائی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے یقیناً غزل کا وجود نہ تھا [١] ۔ نویں صدی کے اواخر تک یا اس سے بھی پہلے فارسی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ رودکی جو پہلا صاحب دیوان غزل گو شاعر ہے دسویں صدی کے نصف اوّل میں گزرا ہے ۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں سنائی ، عطار اور رومی نے غزل کی عاشقانہ بات چیت کو تصوف کے نئے کیف سے آشنا کیا۔ پھر سعدی کی سلاست نے اس نئی غزل کو قبول عام تک پہنچایا اور حافظ نے چار دانگ عالم میں ایک گونج پیدا کر دی ۔ دو صدیاں اور گزریں تو صفوی عہد کے شعراء نے فلسفہ و نفسیات کے مضامین بڑی خوبی سے غزل میں بیان کئے ۔ سترھویں صدی میں مرزا عبدالقادر بیدل اور ان کے معاصرین عشق سے روگردانی کر کے علوم عقلیہ کو بڑی شدّو مد سے غزل کا موضوع بنانے لگے ۔ پھر اردو کے متغزلین نے نہ صرف فارسی غزل کے محاسن و نتائج کی تجدید کی بلکہ ہمارے گزشتہ دور معاشرت کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ اس دور کے خاتمے پر غالب غزل کے سلسلے کا بظاہر آخری بڑا شاعر نظر آتا تھا ، لیکن پھر معلوم ہوا کہ غزل کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے ۔ شمیم احمد کے الفاظ میں :

١۔ تنقیدی مقالات ، ص ١٠٥ ، مرتبہ مرزا ادیب

" دنیا بھر کی اصناف شاعری میں صرف غزل ھی ایک ایسی صنف ھے جو ایک طرف حد سے زیادہ محدود ، مقید ، پابند ، متشدّد ھے اور دوسری طرف اتنی ھی وسیع ، گہری اور پیچیدہ معنویت کی حامل ھے ۔ یہ دونوں صفات بظاھر متضاد معلوم ھوتی ھیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوستہ ھیں جس طرح انسان کا ظاھر و باطن ۔[1] "

پروفیسر فراق گورکھپوری غزل کے علائم کا ذکر کرتے ھوئے فرماتے ھیں کہ غزل نے براہ راست باتیں کرنے کے علاوہ کچھ علائم سے بھی کام لیا ھے ۔[2] کچھ روایتوں اور کلیّوں کو بھی وضع کر لیا ھے ۔ ساقی ، میخانہ یا خمریات کے دوسرے لوازمات ، جنوں ، زندان ، زنجیر ، بہار و خزاں ، بلبل و آشیاں ، صیاد و قفس ، کاروان و منزل ، دشت و چمن ، مقتل ، زلف و رخ ، در جاناں ، کوئے جاناں ، محفل و انجمن یا بزم ، شمع و پروانہ ، گردش دوراں ، فسانۂ طور ، لیلیٰ و مجنوں ، شیریں و فرھاد ، یوسف و زلیخا ، کعبہ و بتخانہ ، کفر و ایمان ، واعظ و شیخ ، زاھد ، رند ، عشق ، ھوش و مستی ، حشر و قیامت ، جنت ایسے تمام الفاظ زندگی کے سیکڑوں اھم و مرکزی و معنی خیز پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے علائم کا کام دیتے ھیں ۔ اشعار میں ھمہ گیری انھی علائم کے ذریعے پیدا ھوتی ھے ۔

غزل کے لغوی معنی عورتوں کے حسن و عشق کی باتیں کرنا ھیں ، لیکن پروفیسر مجنوں گورکھپوری کہتے ھیں کہ غزل کا بنیادی یا لغوی مفہوم جو کچھ بھی ھو ، ایک

---

۱ ۔ نگار پاکستان (اصناف شاعری نمبر) ، ص ۷۱ ، شمارہ نمبر ۱۱-۱۲

۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۷

صنف شاعری کی حیثیت سے مضامین اور اسالیب دونوں میں اس سے زیادہ وسعت اور تنوع کا امکان کسی دوسری صنف میں نہیں ۔[1] عشق بھی انسانی فطرت کا ایک مطالبہ ہے اور وہ بھی غزل کا ایک فطری اور صحت مند موضوع ہے ۔ لیکن یہی نہ زندگی میں سب کچھ رہا ہے نہ غزل میں ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق غزل جن لوگوں کی صنف ہے وہ ایک مخصوص انداز میں محسوس کرتے ہیں ۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ بھی مخصوص ہے ۔[2] اس لیے ظاہر ہے اس کا اظہار بھی مخصوص ہونا چاہیے ۔ اور یہ مخصوص اظہار صنف غزل کی صورت میں ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہ اظہار اپنے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ صنف غزل سے تعلق رکھنے والے افراد کو اسی اظہار سے تشفی ہوتی ہے ، کیونکہ غزل کی صنف کا جمالیاتی پہلو، اس کی صورت کا حسن، اس کی ہیئت کی خوبصورتی ہمارے افراد کے جذباتی اور ذہنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے ۔ غزل کی صنف کے ہاتھوں صدیوں سے یہ تقاضے پورے ہوتے آرہے ہیں اور آئندہ بھی پورے ہوتے رہیں گے ۔ کیونکہ غزل کی صنف ہماری تہذیب و معاشرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں :

" غزل کی ترکیب کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کا ہر شعر ایک سالم اور مکمل تصوّر کا اظہار کر سکتا ہے ۔ غزل کے اشعار میں زندگی کے مختلف مسائل و معاملات سے متعلق کبھی سیدھی اور بے تکلف زبان میں اور کبھی اشارے اور تمثیل کے پردے میں ، مختلف اصول و نظریات مرتب کیے

۱۔ نگار پاکستان (اصناف شاعری نمبر ، ص ۳۸ ، شمارہ نمبر ۱۱ ، ۱۲

۲۔ غزل اور مطالعۂ غزل ، ص ۳۸

جاتے ہین جو ایک دوسرے سے پیوستہ نہ ہون ۔ یعنی مضمون
اور اسلوب دونون کے اعتبار سے غزل مین لامحدود تنوّع کا امکان ہے ۔
یہ امتیاز اور یہ شرف دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری مین کسی
صنف کو حاصل نہین ۔"[۱]

اردو غزل کی روایت بیان کرنے کے بعد اب ہم شعری دبستانون کا جائزہ لیتے ہین ۔ خواجہ زکریا کے مطابق اردو شاعری کو عموماً چار دبستانون مین تقسیم کیا جاتا ہے ۔ دبستان دکن، دبستان دلّی، دبستان لکھنؤ اور دبستان پنجاب ۔[۲] کسی دبستان کے وجود مین آنے کا سبب سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات اور گزشتہ شعری روایات ہوتی ہین ۔ دلّی کے دبستان شاعری کا آغاز، ارتقاء اور انجام اورنگ زیب کی وفات سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے درمیانی دور مین ہوا ۔ اس عرصے مین اہل دلّی نے قتل و غارت، لوٹ مار، برادرکشی اور قحط سالی کے لاتعداد اور خوفناک مناظر دیکھے ۔ ڈیڑھ سو سال کا یہ عرصہ انتہائی بدنظمی اور انتشار کا تھا ۔ بے ثباتیٔ دنیا، تقدیرپرستی، تصوّف، گوشہ نشینی اور اسی طرح کے دوسرے خیالات کی طرف ہر کسی کا میلان تھا ۔ شاعری چونکہ اپنے موضوعات اور اسالیب زندگی سے حاصل کرتی ہے اس لئے دبستان دلّی سے اسی قسم کی خصوصیات وابستہ ہو گئین ۔ اردو شاعری پر فارسی شاعری نے بھی گہرے اثرات ثبت کیے ہین اور یہ اثرات جتنے دلّی کے دبستان پر ہوئے کسی اور دبستان پر نہین ہوئے ۔

۱۔ نگار پاکستان (اصناف شاعری نمبر) ، ص ۳۱، نمبر شمارہ ۱۱، ۱۲

۲۔ تنقیدی مقالات ، ص ۱۳۵ ، مرتبہ مرزا ادیب

دبستان دلّی کی سب سے بڑی خصوصیت داخلیت ہے ۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اپنے دل کی دنیا میں جھانک کر اس کی واردات کا اظہار کرتا ہے ۔ اور اگر کبھی باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اسے بھی شدید داخلیت میں ڈبو کر کہتا ہے ۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دبستان دلّی میں خارجیت بالکل ہی مفقود ہے ۔ البتہ داخلیت کا غلبہ نمایاں ہے ۔ میر، درد ، غالب وغیرہ کے یہاں داخلیت ، خارجیت پر غالب ہے ۔ سودا کے یہاں خارجیت ، داخلیت میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ دوسرے درجے کے شعراء مثلاً یقین، اثر، قائم ، تاباں وغیرہ خالصتاً داخلی شاعری کے نمائندے ہیں ۔ گویا واردات قلبیہ اور داخلیت ، دبستان دلّی کے ہر شاعر کے کلام میں موجود ہے ۔ دلّی کی شاعری میں عشق کی واردات، نفسیات ، تصوّف وغیرہ کا ذکر نہایت کثرت اور خوبی سے ملتا ہے ۔ تصوّف کی شاعری سے دبستان دلّی کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس سے عشقیہ شاعری کے لب و لہجہ میں متانت و سنجیدگی پیدا ہوگئی۔ مسائل تصوّف کے بیان سے شاعری کو فکر کی گہرائی ملی ۔ خواجہ زکریا کے الفاظ میں :

" دبستان دلّی کی بنیادی خصوصیت حزن و یاس کے مضامین کا بیان ہے ۔ مضمون عشق مجازی سے متعلق ہو یا عشق حقیقی سے یا کسی اور دنیوی معاملے سے ، غم و آلام کا ذکر ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو اطمینان قلب نصیب نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ دنیا کی ناپائیداری ، عبرت ، گوشہ نشینی ، حیات کے مستعار ہونے اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کے سوا سوچ ہی کیا سکتے تھے ۔ ۔۔ دبستان دلّی

کی ایک بڑی خصوصیت واقعیت اور صداقت بھی ہے ۔ یہاں کے شاعر غیر ضروری مبالغے سے کام نہیں لیتے۔[۱]"

نورالحسن ہاشمی دبستان دلی اور دبستان لکھنو مین زبان و محاورے کے اختلاف کو تسلیم کرتے ہین ۔[۲] لیکن یہ حقیقت ہے کہ صرف یہی اختلاف دو مختلف دبستانون کے قیام کا سبب نہین بن سکتا ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دونون دبستانون کے اسلوب، انداز فکر اور مضامین کے اختلافات بڑے واضح اور روشن ہین ۔ خواجہ زکریا فرماتے ہین :

" زبان سے زیادہ انداز بیان مین دونون دبستان مختلف ہین ۔ دلی کے شاعرون کے یہان عموماً سادگی، روانی، شگفتگی اور صفائی ملتی ہے ۔ فارسی تراکیب ان مین بکثرت موجود ہین ---- لکھنوی دبستان کی شاعری مین فارسی تراکیب کم تر ہین مگر مشکل الفاظ کی کثرت ہے ۔ تراکیب بھی دلی کے دبستان کے مقابلے مین بھاری بھرکم ہین۔[۳]"

دبستان لکھنو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فرماتے ہین :

" لکھنویت سے مراد شعر و ادب مین وہ خاص رنگ ہے جو لکھنو کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے جدا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ متاخرین شعرائے لکھنو

۱۔ تنقیدی مقالات، ص ۱۵۲، مرتبہ مرزا ادیب

۲۔ دلی کا دبستان شاعری، ص ۳۲۳،

۳۔ تنقیدی مقالات، ص ۱۵۱، مرتبہ مرزا ادیب

نے قدیم رنگ میں اصلاح کر کے ایک نیا انداز سخن گوئی کا پیدا کر لیا تھا ، لیکن یہ ردّعمل کے طور پر ہوا تھا ۔ لکھنؤ کے اصلی رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانے پر نظر ڈالیے جب لکھنؤ کا شباب تھا ، دولت کے دریا بہہ رہے تھے ، آسمان سے ہن برس رہا تھا ، دور دور سے باکمال اور اہل فن کھنچے چلے آ رہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک کے لیے اس کی آنکھیں فرش راہ تھیں ۔ رفتہ رفتہ اودھ کی سرزمین فخرالبلاد بن گئی ۔۔۔[1]"

عام طور پر لکھنوی شعراء جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت پر زور نہیں دیتے ۔ ان کی زیادہ تر توجہ خارجی لوازمات شعری پر ہوتی ہے ۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :

" جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شعراء کا طرۂ امتیاز ہے یہاں عنقا ہے ۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی ہے جسے " معاملہ بندی " کا نام دیا گیا ہے ۔۔۔ اس معاملہ بندی کے ساتھ قدرتی طور پر شاعری کی ہر صنف میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے ہیں ۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو اگر انیس و دبیر اور محسن نہ روکتے تو نہ معلوم شعر و شاعری کا کیا انجام ہوتا ۔[2]"

۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ، ص ۴۷ ، ابواللیث صدیقی ڈاکٹر

۲۔ ایضاً ، ص ۵۳

اس لکھنوی فضا کا ایک اہم رخ آزادی تھا۔ نواب وزیر نے دلّی کے دربار سے آزادی کیا حاصل کی لکھنؤ والے ہر شئے میں خود کو آزاد سمجھنے لگے ۔ تہذیب و تمدن اور رہنے سہنے کے نئے اصول وضع کیے گئے ۔ لباس اور وضع قطع میں نئے نئے انداز اختیار کیے گئے ۔ آداب مجلس اور گفتگو میں فرق قائم ہوا۔ چنانچہ ادبا ؔاور شعرا ؔبھی مروّجہ اور مستعملہ اصول اور اسالیب سے انحراف کرنے لگے ۔ دبستان دلّی کی شاعری حقیقی جذبات اور داخلیت پر استوار ہوئی تھی، دبستان لکھنؤ میں لفاظی اور تصنع پر اس کی بنیاد رکھی گئی ۔ خواجہ زکریا کہتے ہیں:

" لکھنؤ سکول میں معنی زیادہ سے زیادہ الفاظ کے معنوی مفہوم تک محدود رہتے ہیں اور الفا سے آگے نہیں بڑھتے۔۔۔۔"[۱]

لکھنوی شعراء نے شعر کے ظاہری خدّو خال پر زیادہ زور دیا۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار زیادہ مرصّع اور آبدار ہیں ۔ اس حیثیت سے ان کی تمام شاعری ایک جمالیاتی نظریے کے تحت ہے ۔ یہ جمالیاتی نظریہ صنعت گری کا ہے ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے الفاظ میں :

" شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعراء نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ ہر رنگ کی نمایاں خصوصیت صنعت ہی کو ٹھہرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذکر کی ایک بدنما شکل تھی اس کے باعث ظہور میں آئی ۔ تشبیہہ

۱۔ تنقیدی مقالات، ص ۱۵۲ ، مرتبہ مرزا ادیب

اور استعارے میں سادہ اور بیچرل تشبیہات کی بجائے تشبیہہ در تشبیہہ یا پھر تشبیہہ کے اجزاء کی تحلیلی ترکیب پر توجہ دی گئی ۔ چونکہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت ناپسند کی جاتی ہے اس لئے ایک نئے انداز میں دو غزلے، سہہ غزلے، چو غزلے لکھنے کا رواج ہوا ۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنو کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی ۔ یہ خیال آفرینی کبھی تو محسوس اشیاء کے سلسلے میں تخیّل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وھمی اور تخیلی مسائل پر صرف ہوتی تھی ـــ جرات کے اس رنگ میں لکھنو کی مہذب سوسائٹی کے نقش و نگار ہیں جن کا نمونہ شعرائے لکھنو کے علاوہ سوائے حکیم مومن

اور استعارے میں سادہ اور میچرل تشبیہات کی بجائے تشبیہہ در تشبیہہ یا پھر تشبیہہ کے اجزاء کی تحلیلی ترکیب پر توجہ دی گئی ۔ چونکہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت ناپسند کی جاتی ہے اس لئے ایک نئے انداز میں دو غزلے، سہہ غزلے، چو غزلے لکھنے کا رواج ہوا ۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنو کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی ۔ یہ خیال آفرینی کبھی تو محسوس اشیاء کے سلسلے میں تخیّل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وہمی اور تخیلی مسائل پر صرف ہوتی تھی ـــ جرات کے اس رنگ میں لکھنو کی مہذب سوسائٹی کے نقش و نگار ہیں جن کا نمونہ شعرائے لکھنو کے علاوہ سوائے حکیم مومن خان مومن کے اور کسی کے کلام میں نہیں ملتا ۔ لیکن مومن کے یہاں بھی یہ رنگ اتنا شوخ اور بیباک نہیں کہ طبع سلیم اور مذاق لطیف پر گراں گزرے۔[1]"

۳۔ اسلوب مومن کی خصوصیات:

مومن خان مومن کی معجز بیانی ، قادر الکلامی، خیال آفرینی، موزونئی طبع اور

۱۔ لکھنو کا دبستان شاعری ، ص ۵۹

شاعرانہ عظمت کا ذکر کرتے ہوئے شیفتہ کہتے ہیں :

" ان کی زبان معجز بیان نے سحر کو معجزہ کر دیا اور سخن دلپذیر نے طول کو ہم مرتبۂ اختصار بنا دیا ۔ طبیعت عیسان بار نے وہ گوہر افشانی کی مظلوں کے جیب و دامن میں جواہرات کی کانیں الٹ دیں ۔ اور ان کے خیال بہار نثار کی گل پاشیوں نے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہوں کے سامنے چمن چمن جنتیں پیش کر دیں ۔ آپ کی شمع فکر کی روشنی سے نامحسوس ذرّے خورشید درخشاں کی طرح نظر آتے ہیں ۔۔۔ فقیر کے خیال میں جو قوّت شاعری میں ان کو حاصل ہے کسی کو کم ہی حاصل ہوگی ۔ ان کا کلام ہر صنف سخن میں وہ درجہ رکھتا ہے کہ جو دوسروں کو کسی ایک صنف میں بھی میسّر نہیں ہے ۔۔۔[1]"

مومن اپنے دور کے ایک عظیم شاعر تھے ۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ، لیکن غزل کی صنف ان کا خاص میدان ہے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کی غزل گوئی کے بارے میں فرماتے ہیں :

" وہ غزل کی فضا میں پیدا ہوئے اور غزل کی روایت ہی میں ان کی نشوونما ہوئی ۔ غزل کی روایت کا رنگ ان کی شخصیت میں اس طرح رچ گیا کہ یہ صنف ان کا مزاج بن گئی ۔ چنانچہ انھوں نے اس کی روایت کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا اور اپنے تجربات سے اس روایت میں بعض ایسے اضافے

---

۱ ۔ گلشن بے خار ، ص ۲۷۵ تا ۲۷۷ (اردو ترجمہ) ، مترجمہ نفیس اکیڈمی ، کراچی

کیے جو انھی کے ساتھ مخصوص ھین ۔ ان تجربات مین ان کی رومانیت کے ساتھ ملی جلی واقعیت پسندی اور اظہار کی پہلودار کیفیت کے مختلف روپ خصوصیت کے ساتھ اھمیت رکھتے ھین ۔"[۱]

اردو غزل کی روایت مین مومن کی آواز بالکل نئی اور اچھوتی ھے ۔ اس مین بانکپن، تہہ داری، رمزیت ، شگفتگی، کشادگی، رنگینی اور رچاوٗ ھے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ھین :

" جہان تک مومن کی غزلون کے موضوع اور مواد کا تعلق ھے ان مین کوئی خاص تنوّع نہین ھے ۔ ان مین تصوّف نہین ملتا ۔ فلسفے سے بھی اس کو کوئی تعلق نہین ۔ عمرانی معاملات کی طرف بھی ان مین کوئی توجہ نظر نہین آتی ۔ ان کا محور تو صرف ایک موضوع ھے ---- حسن و عشق ، اس کے مختلف معاملات و مسائل اور متنوّع واردات وکیفیات مومن اسی کے شاعر ھین ۔ انھون نے خود اس کوچے مین قدم رکھا ھے ۔ وہ اس کے ان گنت پہلوون کا شعور رکھتے ھین ۔ اسی لیے انھون نے عشق و عاشقی کی اس محدود دنیا کی عکاسی اور ترجمانی مین بڑی وسعت پیدا کردی ھے ۔"[۲]

نورالحسن ھاشمی کہتے ھین کہ غالب کی طرح مومن بھی اپنی انفرادیت لیے ھوئے ھین ۔[۳]

---

۱ - حکیم مومن خان مومن ، ص ۲۰۳

۲ - شاعری اور شاعری کی تنقید ، ص ۳۱۳

۳ - دلّی کا دبستان شاعری ، ص ۲۱۱

سنجیدہ معاملہ بندی اور تغزل ان کی غزلوں کا مخصوص جوہر ہے ۔ وہ رعایت لفظی کے بھی بے حد دلدادہ ہیں ، لیکن اس صنعت کو صرف اس کی خاطر کم استعمال کرتے ہیں ، مقصود فن کی خوبیوں کو بڑھانا ہوتا ہے ۔

مومن کی معاملہ بندی کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی کی رائے ہے:

" ان کی عشق مزاجی نے ان کو جرات کے رنگ یعنی معاملہ بندی کی طرف مائل کیا ، لیکن انھوں نے اس میں بھی دہلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت اور تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے۔"[۱]

مومن کی زبان و بیان اور الفاظ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقمطراز ہیں :

" مومن نے زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال کو بھی فن لطیف بنا دیا ہے ، اور ان کی غزل اس اعتبار سے بھی ایک بلند مقام رکھتی ہے ۔ انھوں نے زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے ۔ کسی بڑی شعوری کوشش کا بھی اس میں دخل نظر نہیں آتا ۔ انھوں نے سیدھے سادے انداز میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اس زبان کو انھوں نے ادب اور شاعری کی زبان بنا دیا ہے --- مومن نے اس معاملے میں تکلف اور تصنع سے کام

---

۱ ۔ شعرالہند ، حصہ اول ، ص ۲۳۸

دھین لیا ۔ اسی لیے ان کی زبان مین سادگی کا حسن ھے ۔ ایک فطری روانی ھے، ایک برجستگی اور بے ساختگی ھے --- اور ان کی غزل مین شاعرانہ حسن کا جو رچاوُ ملتا ھے اس مین الفاظ اور زبان و بیان کا بڑا ھاتھ ھے ۔ یہ الفاظ ان کے یہان کہین تو مخصوص آھنگ پیدا کر دیتے ھین جو احساس اور جذبے کے آھنگ کےساتھ مناسبت رکھتا ھے ، کہین ان کی متناسب درو بست سے ایک مخصوص نغمگی پیدا ھوتی ھے ، کہین یہ علامات و اشارات اور تشبیہات و استعارات کا روپ اختیار کر کے ایک شاعرانہ فضا کی تخلیق کرتے ھین ۔[۱]،،

مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کا آئینہ دار ھے ۔ ان کی تشبیہین اور استعارے بالکل اچھوتے ھوتے ھین ۔ ان کے کلام مین بلند پروازی کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری کا جوھر بھی ھے ۔ عاشقانہ رنگ ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف ھے ۔ غزل مومن کا سرمایہٗ کمال ھے ۔ ان کی ھر بات مین جدّت اور نیا پن ھے مگر بڑ ے وقار کے ساتھ ۔ ان کی معاملہ بندی جرات کے انداز سے بہت زیادہ متین اور سنجیدہ ھے ۔ اس مین شاعرانہ کمال جھلکتا ھے ۔ کلب علی خان فائق رامپوری طرز مومن کی خصوصیات گنواتے ھوئے فرماتے ھین کہ ان کے کلام کی واضح خصوصیات تغزل ، نازک خیالی اور مضمون آفرینی ، ندرت اسلوب اور شوخیٗ ادا ، فکر شاعرانہ ، معاملہ بندی ، طنز ھین ۔[۲] ان کے علاوہ علمیت ، مذھبیت ،

۱۔ مومن اور مطالعہٗ مومن ، ص ۲۰۱

۲۔ مومن ، ص ۳۳۲

تراکیب جدیدہ، مقطع مین تخلّص سے کام لینا بھی خصوصیات مومن مین ھین ۔ نیاز فتحپوری کے خیال مین مومن کو جو چیز دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ھے یہ بھی ھے کہ ان کے کلام سے کسی جگہ خوشی گدایانہ کا اظہار نہین ھوتا۔[1]

مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی مومن کا اردو غزل گوئی مین مرتبہ متعیّن کرتے ھوئے فرماتے ھین کہ باوجودیکہ اشعار مین نہ تو اسرار حکیمہ ھین، نہ دقیق مسائل علمیہ ، نہ الفاظ مشکل یا غیر مانوس ، نہ محذوفات نہ مقدرات فرض کرنے کی ضرورت ، پھر بھی اکثر اشعار ایسے ھین جن کا مفہوم سمجھنے مین نہایت کاوش اور دماغ سوزی کی ضرورت ھوتی ھے ۔[2] اس دشواریٔ مطالب کا ایک سبب ایہام بھی ھے ۔ اپنے معاصرین مین غالباً مومن ھی ایسا شاعر ھے جس نے ایہام کا احیاً کیا ورنہ یہ اسلوب متروک ھو چکا تھا ۔

مومن کا معشوق عورت ھے ۔ وہ اظہار عشق کے لیے تصوف کا سہارا نہین لیتے ۔ اگر ھم مومن کے معشوق کا کیرکٹر ان کے کلام سے متعیّن کرین تو کہہ سکتے ھین کہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا ، لیکن اس کے باوجود مومن کا کمال شاعری یہ ھے کہ ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ھتے ھوئے بھی کہ ذرا سی لغزش اسے جرات و انشاء کی صف مین ملا دے، وہ اپنی اعلیٰ ظرفی اور فنکارانہ صلاحیتون کی بناء پر اس میدان مین بھی ایک پروقار اور بلند مقام پر نظر آتا ھے ۔

نظیر صدیقی فرماتے ھین کہ مومن کی غزلون مین عشق کی داستان ، گل اور بلبل،

۱۔ نگار پاکستان (مومن نمبر) ، ص ۶

۲۔ ایضاً ، ص ۶

شمع اور پروانہ، ساقی اور بادہ کی زبان سے بیان نہین کی گئی ۔ ان کی رشک پسند طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ اپنے عشق کی کہانی ان پیامیون کی زبانی دوسرون تک پہنچائین اور اس لیے چند گنے چنے شعرون کو چھوڑ کر جن مین یہ اشارے برائے نام موجود ہین، مومن کی غزل ان روایتی اشارون سے بالکل پاک ہے ۔[1]

۴۔ شیفتہ کے کلام مین رنگ مومن کی جھلک :

شیفتہ کے کلام مین رنگ مومن کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، اساتذہ کا رنگ ان کے تلامذہ اور متبعین کے کلام مین جھلکنے کی وجوہ بتاتے ہوئے کہتے ہین کہ تہذیبی تسلسل کی بدولت انیسوین صدی کے آغاز تک شمالی ہند مین اعلیٰ درجون کے معاشرون کی ایک مخصوص وضع بن چکی تھی جس مین وضعداری، تہذیب اور شائستگی کو خاص مقام حاصل تھا ۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ جن اشخاص سے جو تعلقات ایک بار قائم ہو جائین انہین تمام عمر نباہ دیا جائے ۔ استاد کا احترام بلکہ استادپرستی بھی انہین آداب مین داخل تھی ۔ استاد کے بڑھے ہوئے احترام کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ شاگرد اپنے استاد کی خصوصیات فن کو قائم رکھنے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے ۔ مومن کے شاگردون کو ان کی فنی خصوصیات عزیز تھین اور وہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مومن کے انداز بیان یعنی معاملہ بندی، تہہ داری، حذف و ایجاز اور غزل کے رچاؤ کو قائم رکھین ۔[2] شیفتہ شاعری کے دوش بدوش، رنگین مزاجی اور شاہد بازی مین مومن کے قدم بہ قدم تھے ۔ مختلف فنون

۱۔ نگار پاکستان (مومن نمبر) ، ص ۱۰۹

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھوین جلد ، ص ۲۸۷ ، (تلامذۂ مومن)

مین دلچسپی رکھتے کی وجہ سے مومن اور ان کے تلامذہ مین یک رنگی سی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ استاد اور شاگرد ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے ۔ مومن کے اکثر تلامذہ عربی اور فارسی علوم مین اور مذہبی تحریکون مین ان کے پیرو تھے ۔ مثلاً شیفتہ نے مومن کی نوجوانی مین مذہبی علوم (فقہ ، تفسیر اور حدیث) کی تعلیم پائی تھی ۔ مومن اور ان کے شاگردون کی اس ہم مزاجی اور ہم رنگی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ مومن کے اکثر ممتاز تلامذہ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ مومن کو طبقاتی احساس برتری ضرور تھا۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ بھی رئیس ابن رئیس تھے ۔ غریب طبقے کے افراد یا کم علم اشخاص کو مومن کے حلقۂ شاگردی مین شامل ہونے کا شرف حاصل نہین ہوتا تھا۔ مومن کی خصوصیات فن مین دو چیزین ایسی ہین جو ان کے شاگردون کو بہت عزیز تھین ۔ ایک تو وہ رنگین معاملہ بندی جو عفت و تہذیب کا ایک رنگین نقاب پڑ جانے کی وجہ سے مومن کسی خاص متاع سمجھی جاتی تھی، دوسرے وہ ذاتی آہنگ جو شاعر کو دل کی بات کہنے پر راغب کرتا ہے اور سنے سنائے مفروضات الفت نظم کرنے پر مائل نہین ہونے دیتا۔ مومن کے شاگرد بالعموم ان دونون خصوصیات کو قائم رکھتے ہین ۔ جذبات کا رچاؤ نیز تہہ داری جس سے معانی و مطالب خود بخود پھوٹتے ہین ان پر مستزاد ہے ۔ ان سب کے علاوہ انداز بیان، حذف و ایجاز، جدّت تراکیب ، غرض متعدد شیوے اور بھی ہین جن کا جلوہ دلّی کے شعر فہمون کو مومن کے سوا اور کہین کم نظر آتا ہے ۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کے الفاظ مین :

" شیفتہ کا کلام پڑھتے ہوئے بار بار ذہن پر مومن کی شخصیت کا رنگ پڑتا محسوس ہوتا ہے ---- مومن کے بعض شاگرد مثلاً شیفتہ، آہی ، تسکین ،

وحشت ، شورش ، کرم وغیرہ ان کے محرم راز اور ھمدم و دمساز بھی ھین ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہین کہ مومن ۳۶/۳۵ سال کی عمر تک دھلی کے حسینون کی محبت مین گرفتار رھے ۔ انھون نے اپنی چھ مثنویون مین اپنے مختلف معاشقون کا حال درج کیا ھےجو فرضی داستانین معلوم نہین ھوتین ۔ مومن نے ان کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے معاشقے کیے ھون گے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ کاروبار شوق کے اس مشغلے مین مومن کے یہ شاگرد ان کے ھم خیال و ھمدم تھے ---- ان تمام تعلقات نے استاد اور شاگردون کے درمیان بڑا مستحکم اور دلچسپ رشتہ قائم کر دیا تھا اور اسی لیے مومن کے شاگرد شعر و سخن مین ان کے رنگ کی پیروی کرتے تھے ----"[1]

شیفتہ کے دیوان مین متعدد ایسے اشعار ملین گے جن مین رنگ مومن صاف جھلکتا ھے:

ـہ ھائے اس برق جہان سوز پہ آنا دل کا   سمجھے جو گرمئی ھنگامہ لگانا دل کا

ـہ نہ کیجو غل اے خوشنوایان صبح   یہ ھے وقت ان کے شکر خواب کا

ـہ محبت نہ ھرگز جتائی گئی   رھا ذکر کل اور ھر بات کا

ـہ پڑے صبر آرام کس جان پر   مری جان بے صبر و بے تاب کا

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند ، آٹھوین جلد ، ص ۲۸۸

؎ لب لعل کو کس کے جنبش ہوئی
ہوا میں ہے کچھ رنگ مہتاب کا

؎ نہ کیجو خطا پر نظر شیفتہ
کہ افعال شیوہ ہے احباب کا

؎ وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

؎ یاد میں اس دردمندان کی مرا جاتا ہوں
کار الماس مرے حق میں گہر کرتا ہے

؎ ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دیگا
وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے

؎ دیکھیے آہ ہماری بھی اثر کرتی ہے
سخن درد سدا ہے کہ اثر کرتا ہے

؎ کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

؎ کہتا تھا وقت نزع کے ہر اک سے شیفتہ
دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

؎ آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبت شبانہ کے ظاہر نشان ہنوز

؎ اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز

؎ یا اپنے جوش عشوہ پیہم کو تھامئے
یا کہیے میں بھی نالہ شورش ادا کروں

؎ آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

؎ کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں
اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

؎ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

؎ اک نیم باز بس ہے ہمارے ہلاک کو
کچھ بھی نہ کیجیے دیکھ کے بس مسکرائیے

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کہتے ہیں کہ شیفتہ نے جرات و مومن کا اثر مقابلتاً زیادہ قبول کیا ہے جس کے نتیجے میں ایک تو لذت پسندی، معاملہ بندی اور عدو کا بکثرت تذکرہ ان کے کلام میں ملتا ہے ۔ دوسرے نزاکت تخیل، بات کو پیچیدہ بنا دینے کسی صنعت بھی ان

میں موجود ہے ۔[1] مثلاً

ــہ ظالم کبھی تو داد دل و چشم تر ملے — سینے سے سینہ اور نظر سے نظر ملے

ــہ شرماتے اس قدر رہے کیوں آپ رات کو — مدّت میں گو ملے تھے مگر میں نیا نہ تھا

ــہ دشمن کے فعل کی تمھیں توجیہ کیا ضرور — تم سے مجھے فقط گلۂ دوستانہ تھا

ــہ کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیے — کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

ــہ منع وصل غیر پر ہنس کر کہا — بارے اب تم کو بھی غیرت آ گئی

ــہ بوسہ ہنسی ہنسی میں جوکل لے لیا تو پھر — کہنے لگے بھلا تمھیں کیا منہ لگائیے

نیاز فتح پوری کہتے ہیں کہ شیفتہ نے مومن کے مشکل رنگ کو بھی خوب نباہا ہے[2]:

ــہ یار کو محروم تماشا کیا — مرگ مفاجات نے یہ کیا کیا

ــہ عرض تمنّا سے رہا بے قرار — شب وہ مجھے میں اسے چھیڑا کیا

ــہ غیر ہی کو چاہے ہیں اب شیفتہ — کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا

ــہ کل نغمہ گر جو مطرب جادو ترا نہ تھا — ہوش و حواس ، عقل و خرد کا پتہ نہ تھا

ــہ کل شیفتہ سحر کو عجب حال خوش میں تھے — آنکھوں میں نغمہ اور لبوں پر ترانہ تھا

حبیب اشعر فرماتے ہیں کہ مومن کے انداز خاص میں تو شیفتہ نے ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ اگر انھیں کلام مومن میں شامل کر دیا جائے تو تمیز مشکل ہو جائے ۔[3] چند شعر

۱- تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۲۱۹

۲- استفادیات ، ص ۳۷۰

۳- دیوان شیفتہ ، (دیباچہ) ، ص ۲۹۸ ، مرتبہ حبیب اشعر

بطور تمثیل نقل کیے جاتے ھین :ـــہ

یکتا کسی کو ہم نے نہ دیکھا جہان مین | طول امل جواب ھے زلف دراز کا
آپ جو ھنستے رھے شب بزم مین | جان کو دشمن کی مین رویا کیا
ان سے نازک کو کہان گرمیٔ صحبت کی تاب | بس کلیجہ نہ پکا اے طمع خام ترا
دامن تک اس کے ھائے نہ پہنچا کبھی وہ ھاتھ | جس ھاتھ نے کہ حبیب کو دامن بنا دیا
لگتی نہین پلک سے پلک جو تمام شب | ھے ایک شعبدہ مژہ نیم باز کا
اس سے مین شکوے کی جا شکر ستم کر آیا | کیا کرون؟ تھا مرے دل مین سو زبان پر آیا
میرے آنے سے تم اٹھ جاتے ھو | بزم دشمن مین نہ آؤن کیون کر
کیون کر مجھے خط رقم کرین گے | کیا غیر کا سر قلم کرین گے
ھرچندکہ ھے آپ سے ملنے کی تمنّا | پر آپ سے ملنے کی تمنّا نہ کرین گے

حبیب اشعر، شیفتہ کے مندرجہ ذیل قطعہ بند اشعار کو " اردو تغزل اور معاملہ بندی کی آبرو،، کہتے ھین[۱] :

کہا کل مین نے اے سرمایۂ ناز | تلوّن سے ھے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیون | کبھی بے وجہ غیرون سے وفا کیا
کبھی محفل مین وہ بے باکیان کیون | کبھی خلوت مین یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکین صولت آفرین کیون | کبھی الطاف جراَت آزما کیا

۱ـ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۳۰۲، مرتبہ حبیب اشعر

کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں کبھی یہ غمزہ ہائے جانفزا کیا

کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا

کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا

کبھی اس دشمنی پر پھر تسکین پئے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا

یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلّف جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم

کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

نورالحسن ہاشمی فرماتے ہیں کہ کلام میں بندش الفاظ، ترکیب روش اور رعایت اسی طرح کی ہے جو غالب اور خاص کر مومن میں پائی جاتی ہے[۱]: ـــہ

پاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقع سے کھلی

صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا کرتے ہیں کیا سنتے ہیں کیا دیکھتے ہیں ہائے

اس شوخ کے جب کھولتے ہیں بند قبا ہم

ہائے وہ شیفتہ کسی بے تابی

تھام لینا وہ تیرے محمل کو

سید خضر برنی کا کہنا ہے کہ معاملہ بندی یا تعشّق کی واردات کا بیان شیفتہ

۱ـ دلّی کا دبستان شاعری، ص ۲۲۳

کا خاص رنگ ہے ۔[1] ؎

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے

دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤں گا

وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

جس لب کے غیر ہو سے لیں اس لب سے شیفتہ

کمبخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

عدان صبر کہیں شیفتہ سے تھمتی تھی

کہ ہر کرشمہ ہے چاک اور ہر ادا گستاخ

ابوالولا محمد ذکریا مائل شیفتہ کی معاملہ بندی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

" شاعری کی جس روش خاص کو اہل فارس " واقعہ گوئی ،، سے تعبیر کرتے ہیں ، وہ ہمارے یہاں ، بالخصوص لکھنؤ میں ، " معاملہ بندی ،، کہلاتی ہے اور اس میں وہی مضامین داخل ہیں جو عموماً ہوس پرستانہ جذبات یا شوق عشق بازی کے واقعات سے متعلق ہوتے ہیں ۔ حضرت شیفتہ کی شاعری جس زمانے میں تکمیل کو پہنچی ہے یہ وہی

١- نگار مئی ١٩٦٠ھ ، شمارہ ٥، ص ١٧ (نواب شیفتہ)

زمانہ ہے جس کی زہریلی فضا میں غالب جیسا سنجیدہ نگار شاعر بھی بعض اشعار کی بناء پر بدمذاقی کے الزام سے محفوظ نہ رہ سکا۔ پھر شیفتہ کا دامن سخن گوئی کیونکر اس بدنما داغ سے پاک و صاف رہ سکتا تھا۔ لیکن اگر اس عہد کی خصوصیات اور ماحول پر زیادہ وسیع النظری سے نگاہ ڈال کر دیکھیں تو غالب، مومن اور شیفتہ جیسے شعراء کو معاف رکھنا ہی انصاف نظر آتا ہے ۔ حضرت شیفتہ نے اس ذیل میں جس قسم کے مضامین لکھے ہیں وہ اگرچہ اس ترقی یافتہ دور میں چنداں توجہ کے قابل نہ ہوں گے، لیکن جس عہد کی شاعری پر ہم بحث کر رہے ہیں اس وقت انہیں اشعار کو شاعرانہ دلچسپیوں کا خاص موضوع قرار دیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے اگر کلام شیفتہ میں اس موضوع پر بھی اظہار خیالات میں متانت اور سنجیدگی کا پہلو غنیمت نمایاں نظر آئے تو مدعا حاصل ہے اور ہم ان بزرگوں کو بدنامی سے بچانے کی کوشش میں بجا طور سمجھے جانے کے مستحق ہیں ۔ ذیل کے انتخاب سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوگی۔ ۔۔۔

رقیب بوالہوس کا منھ ہے لطف جور کو دیکھے + وہ اپنی وضع کو دیکھے ہماری طور کو دیکھے

کچھ بات راز کی ہے ذرا پاس آئیے

جی میں ہے آج خوب عدو کو بنائیے

وعدہ عدو کا آپ کی تکرار سے کھلا + میں نے یونہی کہا تھا کہ کیا آئے کیا چلے

میری خوشی کا ان کو نہایت خیال ہے

کچھ ان دنوں میں غیر سے شاید ملال ہے

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر + یہ اہل مروّت ہیں تقاضا نہ کریں گے

عدو کو آگے مرے مسکرا کے ذبح نہ کر

کہ میری مرگ بھی موقوف اسی ادا پہ رہے

مجھ سے کیا کیا شاد ہوگی روح قیس و کوہکن + پھر نظر آتے ہیں کوہ و دشت کچھ آباد سے

ان کو محبت ہی میں شک پڑ گیا

ڈر سے جو شکوہ نہ عدو کا کیا

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے + وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا ،،۔[1]

۵۔ شیفتہ کے کلام پر دیگر اساتذہ کے اثرات:

شیفتہ ، مومن کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی ۔ غالب سے بھی ان کے مراسم کی نوعیت کم و بیش اسی طرح کی تھی ۔ شعر و شاعری کے میدان میں ان دو اساتذہ سے متأثر ہونا تو یقینی امر ہے ۔ لیکن شیفتہ کے کلام کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے چند دیگر اساتذہ کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ اس بات کو انھوں نے خود بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ جس روش پر چاہیں طبع آزمائی

۱۔ تسنیم جلد اوّل ، شمارہ (۳) ، آگرہ ۱۹۳۱ء ، ص ۱۷ (نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی)

کر سکتے ھین اور وہ بھی اس طرح کہ انھی کی روش معلوم ھو ۔ چنانچہ فرماتے ھین :

" در مراتب سخن اگرچہ ادائے خاص بامن است ، امّا طبع ماھر روش چنان مناسب افتادہ کہ بہ ھر شیوہ سخن می کنم کہ ھما نا طرز خاص می است ، و این سخن را اگر مجموعہ نظم و نثر می بیدی مسلّم می داری ۔"[1]

چنانچہ نیاز فتحپوری شیفتہ کے کلام پر روشنی ڈالتے ھوئے فرماتے ھین کہ انھون نے میر سے بھی استفادہ کیا ھے : ۔

اے ستمگر رگ جان مین ھے مری پیوستہ   دم نکل جائیگا سینے سے مرے تیر نہ کھینچ[2]

ابو الولا محمد زکریا مائل ، شیفتہ کے کلام مین میر کے اثرات کا ذکر کرتے ھوئے کہتے ھین کہ میر کے نشتر مشہور ھین کہ سیدھے دل کو برماتے ھین ۔ میر کے بعد بھی اگر کسی کو یہ رتبہ دیا جا سکتا ھے تو غالباً شیفتہ کے یہ شعر نظرانداز کیے جانے کے قابل نہین : ۔

اے موجۂ نسیم ذرا اور ٹھہر جا   ھے خاک پر ھماری وہ دامن فشان ھنوز
بسکہ آغاز محبت مین ھوا کام اپنا   پوچھتے ھین ملک الموت سے انجام اپنا
یاد دے جس کسی بھلایا سب کو   اس کی مین یاد بھلاؤں کیونکر
اتنی بھی بری ھے بیقراری   اب آپ سے انس کم کرین گے

۱۔ گلشن بے خار ، ص ۲۸۶ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ استقادیات ، ص ۳۷۱

مرنے کسی مرے خبر نہ کرنا   قاصد وہ بہت الم کریں گے

کس نے تاراج کیا ملک دل و دین کہیے   آج تم شیفتہ کچھ بے سروسامان سے ہو

کہتا تھا وقت مرگ یہ ہر اک سے شیفتہ   دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

کن حسرتوں سے مرتے ہیں ہم تو کو غم نہیں   اپنی بھی مرگ مرگ تمنا سے کم نہیں [1]

بدرالحسن اختر بدایونی ، شیفتہ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب نمایاں نظر آتی ہے ۔ تلاش الفاظ اور ترکیب کی روش میں غالب اور مومن کا رنگ پایا جاتا ہے ، لیکن وہ اپنے کلام میں میر تقی میر کی پیروی اور سادہ بیانی پر فخر کرتے ہیں :۔

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا   ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہترہم سے

دلی میں تو شیفتہ ہے استاد   ہم قصد سوئے عجم کریں گے

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام   بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا [2]

سید خضر برنی کے الفاظ میں :

" ہمیں باوجود تلاش کے میر کے اثرات زیادہ نہیں ملے (شیفتہ کے کلام میں) ایک دیوان میں اگر چند شعر ایسے شکل آئیں تو کیا ہوا ۔"

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار

شب موم کر لیا ، سحر آہن بنا دیا [3]

۱۔ تسنیم، جلد اول ، شمارہ ۳، ص ۵۱ (نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ دہلوی)

۲۔ مخزن نمبر۳ ، (شیفتہ کی شخصیت اور شاعری پر ایک سرسری نظر)

۳۔ نگار ، مئی ۱۹۶۰ء ، ص ۲۶ (نواب شیفتہ)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، شیفتہ کے کلام میں میر تقی میر کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے میرزا رفیع سودا کے اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ گرمی اور لذت کے علاوہ جو ان کے کلام میں خداداد ہیں، اس میں وہ شکوہ الفاظ اور چستیٔ ترکیب بھی پائی جاتی ہے جو کسی وقت میر اور سودا کا حصہ تھی ۔[1] حبیب اشعر، شیفتہ کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اگر شیفتہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ میر اور ناسخ کی روشوں سے اور غالب و مومن کی روشوں سے ہوتے ہوئے اپنے انفرادی و امتیازی رنگ سخن تک پہنچے ہیں ۔[2] میر خدائے سخن تھے اور ہر بڑا شاعر ان کی تقلید کو اپنے کمال کی سند سمجھتا تھا ۔ شیفتہ نے بھی اس بات کا ایک جگہ اظہار کیا ہے :۔

کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے ۔۔۔ نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن

یہ صرف قول ہی نہیں ، ان کے بعض اشعار میں واقعی میر کی سی خستگی و سرشتگی پائی جاتی ہے ۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے :۔

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ ۔۔۔ یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

دل لگانے کا ارادہ پھر ہے شاید شیفتہ ۔۔۔ ایسی حسرت سے جو ہے گزری ہوئی الفت کی یاد

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں ۔۔۔ اے مرگ میں آپ مر رہا ہوں

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا ۔۔۔ قاصد وہ بہت الم کریں گے

۱۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص ۲۲۳

۲۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۹۵ ، مرتبہ حبیب اشعر

(*)
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ   اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، شیفتہ کے کلام پر مختلف اساتذہ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگرچہ ناسخ، غالب، اور مومن کے انداز اور میر کے انداز میں بڑا فرق ہے اور شیفتہ نے اوّل الذکر شعراء کے اثرات زیادہ قبول کیے ہیں[1]، تاہم میر کا طرز بھی انہیں کبھی کبھی تقلید پر اکساتا ہے، چنانچہ بعض اوقات میر کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے ہیں:

آمد آمد میں اس قدر شورش   دیکھیے کیا کریں بہار میں ہم

وہ تو سو بار اختیار میں آئے   پر نہیں اپنے اختیار میں ہم

نیاز فتحپوری کلام شیفتہ پر مصحفی کے رنگ کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتے ہیں:

(*) نوٹ: شیفتہ کا یہ مشہور شعر بظاہر کسی غزل کا مقطع معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ غزل دیوان کے کسی ایڈیشن میں موجود نہیں ۔ میں نے اس بارے میں نواب محمد اسماعیل خان سے بھی (شیفتہ کے پوتے ہیں) رجوع کیا، لیکن انہوں نے بھی اس غزل کے وجود سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ دیوان کے پہلے ایڈیشنوں میں سوائے حسرت ایڈیشن کے یہ شعر فردیات کے زمرے میں درج ہے ۔ حسرت نے اس شعر کا اپنے دیباچہ میں حوالہ ضرور دیا ہے لیکن فردیات میں درج نہیں کیا اور خود غزل کا سراغ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ (صلاح الدین احمد مرتب دیوان شیفتہ، ص ٣٦) ۔۔ مولانا صلاح الدین احمد نے یہ شعر اس طرح لکھا ہے: (مقالہ نگار)
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ   +   ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

١۔ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھویں جلد، ص ٢٦٠

اس سپہر ساز کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

ایسی رغبت سے کریگا قتل گمان کاہے کو تھا — شیفتہ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں — کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خاروخس آشیاں ہنوز

وہ مجھ سے خفا ہو تو اسے یہ بھی ہے زیبا — پر شیفتہ میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا[۱]

سید خضر برنی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شیفتہ کے کلام پر غالب و مومن سے زیادہ آتش و ناسخ کا اثر ہے ۔ ان کے یہاں رعایت لفظی کی ویسی ہی افراط ہےجیسی آتش کے یہاں(کمتر) اور ناسخ کے یہاں (بیشتر) ملتی ہے ۔ ؎

ہزار مرتبہ فرہاد خوان شیریں دے — یہی ہے حق نمک عشوہ ہائے شیریں کا

دقش تسخیر غیر کو اس نے — خون لیا تو مرے کبوتر کا

کھٹکوں عدو کی آنکھ میں تا بعد مرگ بھی — کانٹے مرے مزار پہ رکھنا بجائے گل

اس رشک گل نے لی ہے جو بلبل تو عندلیب — دیکھے چمن میں شور کوئی عندلیب کا[۲]

(آخری تین شعروں کو ناسخ کے دیوان میں رکھدیجیے امتیاز دشوار ہوگا ۔)

یہ رعایت کہیں کہیں لطیف بھی ہے اور اس ذیل میں آتش کے بہترین اشعار کی یاد دلاتی ہے :؎

رشک خسرو بے تصرف ناز شیریں بے اثر — سجدۂ فرہاد مثل بے ستون سل ہو گیا

۱۔ استفادیات ، ص ۳۷۱

۲۔ نگار ، مئی ۱۹۶۰ء

خاک عرض مدعا اس سے کروں — جس کو باتوں میں کدورت ہو گئی

قدم بھی ہم کو نہ رکھنے دیا گلستان میں — ہزار بار قدم ہم نے باغبان کے لیے

اضطراب جرس ہے کہوں دل کسو — کہیں جنبش ہوئی ہے محمل کو

مت چھیڑ اے رقیب کہ مانند زلف یار — سرتابہ پا شکستہ ہوں پر مضمحل نہیں

رہتے ہیں بہم فن سے مثال ورق و حرف — اب ان کے رہا کرتے ہیں تحریر کے مشتاق

کیا بوالہوسوں سے دل عاشق کا گلہ ہے — غیروں سے بھی کرتا ہے کوئی گھرکی شکایت

سجدے کی کسی در پہ تمنا نہیں رکھتے — گردن پہ سر ناصیہ فرسا نہیں رکھتے

کہوں میں کیا کہ کیا درد نہاں ہے — تمہارے پوچھنے ہی سے عیاں ہے

اجل نے کی ہے کس دم مہربانی — کہ جب پہلو میں وہ نامہرباں ہے

اساتذۂ لکھنؤ کے ساتھ ایک اور مشترک پہلو غزلوں کی افراط کا ہے ۔ مومن و غالب نے اس نوع کی پرگوئی سے احتراز کیا ہے ۔ ایک اور قدر مشترک وہ دشوار اور ویران ردیفیں ہیں جن کے شکنجے میں شیفتہ کی کئی غزلیں جکڑی ہوئی ہیں ۔ مثلاً " زنجیر کے بوسے" ، " اشارات میں نہیں" ، " فسانہ شب وصل" ، " تقدیر کے مشتاق" ، " شمع چراغ" ، " واعظ ربط" ، " بادہ فروش" ۔ حبیب اشعر ، ناسخ کے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس زمانے میں شیفتہ نے شعر کہنا شروع کیا ، ناسخ کی شاعری کا بڑا چرچا تھا ۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا ، غالب و مومن جیسے انفرادیت پرست شاعروں نے بھی ابتداً ناسخ کے رنگ میں مسلسل شعر کہے ہیں ، اس لیے اگر شیفتہ کے اردو کلام میں ایک نہیں کئی غزلیں ناسخ کی تقلید میں ملتی ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ جن غزلوں کے

مطلعے ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں وہ پوری کی پوری ناسخ اسکول کے تتبع میں کہی گئی ہیں :۔ ؎

رات وہ گل کی طرح سے جسے خنداں دیکھا — صبح بلبل کی وش، ہمدم افشاں دیکھا

وہ پری وش عشق کے افسون سے مائل ہو گیا — مفت میں مشہور میں لوگوں میں عامل ہوگیا

صبح ہوتے ہی گیا گھر مہ تاباں میرا — پنجۂ خور نے کیا چاک گریباں میرا

اور الفت بڑھ گئی اب اس ستم ایجاد سے — اک نئی لذت جو پائی دل نے ہر بیداد سے

شب ہم نے لیے خواب میں زنجیر کے بوسے — دیں گے وہ مگر زلف گرہ گیر کے بوسے

کیوں نہ مجھکو مرض یاس کی شدت ہو جائے — ملک الموت بھی جب پھر عیادت ہو جائے

ہے ستم واقف ہو میرے حال کی تغیر سے — بوالہوس کہتے ہو پھر اک آہ بے تاثیر سے [1]

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کہتے ہیں کہ ویسے تو الفاظ سے کھیلنے کا شوق اردو کے سب ہی شعراء کو کم و بیش رہا ہے لیکن اس میں غلو کے ذمہ دار شعرائے لکھنو ہیں اور غالباً انھیں کے اثر سے شیفتہ کو لفظی مناسبات و رعایات اور الٹ پھیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ چنانچہ بیسیوں شعر اسی شوق کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کو کوئی خاص بات کہنی نہیں تھی، صرف الفاظ کے کھیل سے مطلب تھا ۔ مثلاً ؎

تھا کیا ہجوم پھر زیارت ہزار کا — گل ہو گیا چراغ ہمارے مزار کا

۱۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۹۵ ، مرتبہ حبیب اشعر

پانی پانی ہوئے مرقد پہ مرے آ کے وہ جب شمع کو نعش پہ پروانے کی گریاں دیکھا

میں سادگی سے بیان کر رہا ہوں وصف دہن وہ ہونٹ کاٹتے ہیں اپنی نکتہ دانی سے[1]

شعرائے لکھنؤ کے بعض اور اثرات بھی شیفتہ نے قبول کیے، جیسے علمی اصطلاحات اور ثقیل و نامانوس الفاظ کا غزلوں میں بلا تکلف استعمال ، مذہب کلامی ، واسوخت کا سا انداز، لطف زبان پیدا کرنے کے لیے محاورے یا ضرب المثل کا رجحان ۔ جیسے :

صیاد کا دل اس سے پگھلنا متعذّر جو نالہ کہ آتش فگن جام نہ ہوگا

سو خوف کی ہو جائے مگر رند نظر باز دل جلوہ گہ لاتشف وشف نہیں کرتا

پڑے صبر آرام کسی جان پر مری جان ہے صبر و بیتاب کا

اس جنبش ابرو کا گلہ ہو نہیں سکتا دل گوشت ہے ناخن سے جدا ہو نہیں سکتا

سچ تو یہ ہے کہ بول گئے اکثر اہل شوق بلبل نے کی جو نالہ سرائی تمام شب

شیفتہ نے غالب سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے ۔ عاشقانہ جذبات کی تحلیل نفسی، نکتہ آفرینی اور نفسیاتی حقائق جو غالب کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں، اپنا پرتو شیفتہ کے ذہن و فکر پر بھی ڈالتی ہیں اور ان کے اسلوب اظہار کو بھی متاثر کرتی ہیں ۔ کئی شعر تو محض غالب کی آواز بازگشت معلوم ہوتے ہیں :

خلوت میں شیفتہ سے کوئی مل کے کیا کرے وہ شخص انجمن میں بھی اور انجمن میں ہے

اسباب عشق یہ جو مہیّا ہے شیفتہ کیا پردہ تم سے آنے کی ان کے خبر ہے آج

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر یہ اہل مروّت ہیں تقاضا نہ کریں گے

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۲۱۸-۲۱۹

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین دل ہوا رنج سے خالی بھی تو دل بھر آیا

اس کے علاوہ غالب کا اثر ان غزلوں میں بھی ہے جو ان کی زمینوں میں لکھی گئی ہیں ۔ حبیب اشعر ، غالب کے رنگ کا اثر شیفتہ کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی بتاتے ہیں :۔

ما نما ہے نہایت خلاف شیوۂ عشق غلط ہے شوق ہمیں گریہ ہائے رنگیں کا

کب ہمیں حاجت پرہیز ہوشی غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا

آج ہی تیری جگہ کچھ سینہ و دل میں نہیں مثل تیر غمزہ ، ظالم دلنشیں تو کب نہ تھا

بچتے ہیں اس قدر جو ادھر کی ہوا سے ہم واقف ہیں شیوۂ دل شورش ادا سے ہم

فصل گل ہے میکدے کا ساز و سامان چاہیے توبۂ ژولیدہ زیب طاق میان چاہیے

ہمارے ساتھ ہیں وہ موشگافیاں کہ نہ پوچھ یہ نکتہ بس ہے کہ آفت ہے نکتہ دان کیلئے

اثر اگرچہ بنا بھر ساز دلکش دوست مگر کچھ اپنی بھی آہ جگر فشان کیلئے

شیفتہ مختلف اساتذہ کے اسلوب سے متاثر ہوئے اور ان اسالیب کو اپنی شاعری میں بڑے سلیقے سے برتا بھی ۔ یہ ان کی قادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ شیفتہ کا اپنا بھی ایک اسلوب خاص ہے ، جس کی وضاحت مندرجہ ذیل سطور میں کی گئی ہے ۔ مولانا صلاح الدین احمد فرماتے ہیں :

" بعض حضرات کا خیال ہے کہ شیفتہ کا رنگ سخن ایک مرکب ہے جس نے میر، مومن اور غالب تینوں کے رنگ سے ترکیب پائی ہے ۔ ہم یہ تو

١۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ٢٩٧ ، مرتبہ حبیب اشعر

نہیں کہتے کہ یہ قول یکسر غلط ہے ، کیونکہ کلام شیفتہ میں ہمیں جا بجا میر کی جذبات نگاری ، مومن کی معاملہ بندی اور غالب کی حسن آفرینی کے اثرات ملتے ہیں ۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں یہ کیفیت کسی یک طرفہ اثر پذیری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس تاثر و تاثیر کی آئینہ دار ہے جو غالب ، مومن اور شیفتہ کے درمیان پایا جاتا تھا ۔ میر سے البتہ سبھی اثر پذیر تھے لیکن صرف اس حد تک جس حد تک بادۂ صافی کا کوئی جام آمیزش گلاب سے اثر پذیر ہو ۔،،[1]

(ب) شیفتہ کے فنی اسالیب و خصوصیات

۱ ۔ تغزل کا رچاؤ ۔ رنگین بیانی :

معاملہ بندی یا تعشق کی واردات کا بیان شیفتہ کی شاعری کا ایک اہم رنگ ہے ۔ اس کا بیان گزشتہ سطور میں " شیفتہ کے کلام میں رنگ مومن کی جھلک ،، کے تحت بڑی وضاحت سے کیا جا چکا ہے ۔ توارد کی ضرورت نہیں ۔ مختصراً عرض یہ ہے کہ شیفتہ کا بیشتر کلام جوانی کے زمانے کا ہے ۔ عشق مجازی کے دور سے بھی وہ گزر چکے ہیں ۔ نیز مومن اور اساتذۂ لکھنؤ کے رنگ کلام کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں دکھائی جا چکی ہیں ۔ ان تمام

---

۱ ۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۲ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

حقائق کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ تغزل کا رچاوٗ ، رنگین بیانی ان کے کلام کا ایک اہم وصف ہے ۔ بہرحال چند مزید اشعار پیش کیے جا رہے ہیں :۔

ابھی کہوں تو کریں لوگ شرمسار مجھے — کہ کس کے وعدے پہ اتنا ہے اعتبار مجھے

خلاف وعدہ مسلّم وفائے وعدہ غلط — غرض کچھ اور نہیں غیر انتظار مجھے

لیا ہی تھا نگہ پر فسوں نے دل لیکن — کیا ادائے تغافل نے ہوشیار مجھے

مندرجہ بالا تینوں اشعار دلکشی ، بے ساختگی ، حسن بیان اور زور تغزل کا سنجیدہ مرقع ہیں ۔ ۔ہ

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر — دینداریٗ و پارسائی کی

آخرکار مئے پــــرسـت ہوا — شان ہے اس کی کبریائی کی

یہ قطعہ بھی بقائے دوام اور قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے ۔

٢- معنی آفرینی و تہہ داری :

شیفتہ معنی آفرینی و تہہ داری میں غالب و مومن کے پہلو بہ پہلو تو نہیں ہیں ، لیکن ان کے اشعار میں یہ وصف بھی خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ ذیل میں ایسے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جو معنی آفرینی و تہہ داری کی عمدہ مثال ہونے کے علاوہ غالب و مومن کے طرز کلام سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں :۔

تمام علّت درماندگی ہے قلّت شوق — تپش ہوئی پر پرواز مرغ جان کے لیے

پہلے مصرعے میں بتایا گیا ہے کہ اگر شوق ناقص نہ ہو تو منزل عشق کا طے کر

لینا چنداں دشوار نہیں ۔ دوسرے مصرعے میں شوق کو تپش سے تعبیر کرتے ہوئے مرغ جاں کی تپش کو پر پرواز سے مثال دی ہے کہ وہی اس کے لیے منزل تک رسائی کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔ ؎

قفس میں کرتی ہے تحریک بال جنبانی نوائے دلکش مرغان شاخسار مجھے

اس شعر میں زمانے کی موجودہ حالت پر قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاست دوراں کا صحیح احساس رکھنے والے دل سے نکلا ہے ۔ جو لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ مصیبت و مجبوری کے عالم میں ہم نواؤں کی راحت یا آزادی کا علم، اپنی آزادی کا احساس تیز تر کر دیتا ہے ، وہ اس شعر سے لطف اٹھا سکتے ہیں ۔ " تحریک بال جنبانی" سے شاعر کی نفسیاتی قوت احساس کا پتہ چلتا ہے ۔ ؎

ایام ہجر میں جو اجل کا خیال ہے بیشک دماغ میں اثر اختلال ہے

مصیبت کا زمانہ جلد ختم نہیں ہوتا اور جب مصیبت کے راحت سے بدلنے کی توقع نہیں رہتی تو اس کے استیصال کے لیے موت کی خواہش کی جاتی ہے ۔ لیکن تمنا بن کر موت کی آرزو بھی پوری نہیں ہوتی ۔ ان دو مصرعوں میں ایک وسیع خیال کو پیش کیا گیا ہے۔

ان کے خلاف وعدہ سے میں شرمسار ہوں کیونکر کہوں کہ مجھ سے انہیں انفعال ہے

یہ بات کہ محبوب کو اپنی وعدہ خلافی سے جو ندامت ہوئی اس کا اظہار بھی عاشق پسند نہیں کرتا بلکہ خود پشیمان ہوتا ہے کہ اس سے اس کا اثر محبت بدنام اور ظن عاشقی مجروح ہوتا ہے ۔

کیا کیا پھنسا رہی ہے ہمیں دام رشک میں آشفتگی کہ زلف شکن در شکن میں ہے

زلف کی آشفتگی سے رشک پیدا ہونا ایسا نازک خیال ہے جس کا جواب مشکل ہے ۔ " شکن در شکن ،، کی ترکیب نے لطف شعر دوبالا کر دیا ہے ۔

؎ ایک حالت پر نہیں رہتا کوئی

اب وفا ہو بے وفائی ہو چکی

حسن طلب کا انوکھا انداز ہے ۔ پہلے ایک کلیّہ بیان کر دیا ۔ پھر اسی کے تحت اپنا مدعا بیان کر دیا گیا کہ اب تم بھی وفا کرو ورنہ اس اصول کا بطلان لازم آتا ہے ۔

؎ برق ہے روزگار خندۂ گل

نازیہ ، فرصت اس قدر کچھ ہے

راحت و عیش کا زمانہ کس قدر ناپائیدار ہے اور اس پر کہاں تک فخر و پندار زیبا ہے، اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی ہوتا ہے ۔ خندۂ گل کی بقا ، تابش برق کے برابر بتانا اور فخر و نازش کو " فرصت اس قدر کچھ ہے،، کہہ کر حقیر دکھانا اپنی طرز کا اچھوتا خیال ہے ۔ تشبیہہ و استعارے کی نزاکتیں اپنی جگہ قابل ستائش ہیں ۔

؎ اب ہے انہیں تلاش ہماری تو فائدہ

وہ وقت بھی گیا کہ ہمارا اثر ملے

وفا کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے اور وفادار لوگ رہ رہ کر یاد آتے ہیں ۔ اس خیال کو اور بہت سے لوگوں نے باندھا ہے ، لیکن شیفتہ نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کی مثال کمیاب ہے ۔

؎ جان کھوتی ہو جسے مدّنظر مثل حباب

وہی مشتاق فنا چشم کو تر کرتا ہے

نہایت ہی خوبصورت انداز میں جانبازی کو لازمۂ محبت بتایا ہے اور کوچۂ عشق میں قدم رکھنے کی کیا خوب تعبیر ہے " چشم کو تر کرنا ،، ۔

؎ کھیل نہیں کچھ کہ رکھا دوں تمہیں

فرض کیا آہ میں تاثیر ہے

لطف زبان اور حسن بیان کے علاوہ اس شعر میں معنی آفرینی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے ۔

۳۔ جذبات کا خلوص ۔ حقیقت نگاری :

جذبات کے خلوص ، حقیقت نگاری ، تاثیر ، سوز و گداز کے اعتبار سے شیفتہ اپنے زمانے کے بیشتر شاعروں میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں ۔ ان کے کلام سے مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جا رہی ہیں :

؎ شیفتہ ضبط کرو ایسی ہے کیا بے تابی

جو کوئی ہو تمہیں احوال سنانا دل کا

جذب و کیفیت میں ڈوبا ہوا شعر ہے ۔ اس وقت کی حالت بتاتی ہے جب غلبۂ محبت سے ایک قسم کی دیوانگی سی پیدا ہو جاتی ہے اور آدمی بے اختیار ہو کر ہر شخص کو اپنا ہمدرد بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔

ـــہ تپش دل کے سبب سے ہے مجھے خواہش مرگ
کون ہے جس کو نہ منظور ہو آرام اپنا

" خواہش مرگ،، اس لیے ہے کہ " تپش دل ،، سے نجات مل جائے، لیکن زندگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں ـ مر کر ہی چین ملے تو ملے ـ " خواہش مرگ،، کے جملے سے خلوص جذبات اور حقیقت نگاری کا حق ادا ہو گیا ـ

ـــہ کیا حال تمھارا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ
بے وجہ کوئی شیفتہ اف اف نہیں کرتا

نہایت سادہ اور سہل ممتنع کے انداز میں ایک ایسی حقیقت واضح کر دی ہے جسے ہر درد آشنا دل سمجھتا اور محسوس کرتا ہے ـ

شیفتہ کے مقطعے اکثر سوز و گداز سے لبریز اور کسی نہ کسی خاص کیفیت میں ڈوبے ہوتے ہیں جن میں ان کے اصل مذاق تپش کی جھلک نظر آتی ہے ـ مثالیں :

۱- اس نوبہار حسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

۲- اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

۳- شب ہجران نے کہا قصۂ گیسوئے دراز
شیفتہ تو بھی دل زار نے سونے نہ دیا

۴- ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی

تھام لینا وہ تیرے محمل کو

۵- سودا زدہ کہتے ہیں ہوا شیفتہ افسوس

تھا دوست ہمارا بھی سنبھل جائے تو اچھا

پہلے شعر میں الفاظ کی قوت تاثیر ظاہر ہوتی ہے ۔ دوسرے شعر میں جذبات کا زور اور قلبی کیفیت کا اچھوتا اظہار ہے ۔ تیسرے شعر میں شب ہجران میں اپنی بے چینی و بیتابی کا اظہار ہے اور نہایت ہی پرخلوص اور موثر انداز اختیار کیا گیا ہے ۔

چوتھے اور پانچوں شعر میں اپنی بے تابیٔ دل اور سودائے عشق محبوب کا ذکر نہایت پرخلوص انداز میں کیا گیا ہے ۔

؎ جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں مگر

رہ جائیں آپ وہ مجھے ناچار دیکھ کر

یہ شعر حسرت و یاس کے جذبات اور واردات قلب کا آئینہ ہے ۔ اس مضمون کے دو پہلو ہیں ۔ ایک تو یہ کہ فراق کے وقت شیفتگان محبت بے حواس ہو جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وصال دوست بھی انتہائی مصائب ہجر اور آلام فراق برداشت کرنے کے بعد ممکن ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ دونوں حالتیں " جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں ،، سے سمجھ میں آتی ہیں ۔ اس کے بعد لفظ " مگر ،، پر دوسرے مصرعے کی بنیاد رکھ کر اس وقت کی حسرت و بیچارگی کی پوری کیفیت آئینہ کر دی ہے ۔

ـــہ اے ستمگر رگ جان میں ہے مری پیوستہ

دم نکل جائے گا سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

شعر کے انداز سے مفہوم ہوتا ہے کہ تیر کھینچنے سے باز رکھنے کا مدعا اپنی جان بچانا ہی نہیں ہے بلکہ اپنی ایذا طلبی اور لذت اندوزیٔ خلش کی رعایت بھی مدّنظر ہے ۔ پھر روح کی تیر سے وابستگی جو ضمناً بیان ہوئی ہے ایسی بات ہے جس نے شعر کو سحر بنا دیا ہے ۔

ـــہ میں نے کیا جانیے کس ذوق سے دی جان دم قتل

کہ بہت اس سے ستم گر کو پشیمان دیکھا

یہ ندرت ادا ہے کہ پشیمانئی ستمگر کے نامعلوم سبب کو اپنے ذوق جان دہی پر منحصر کر دیا ہے ۔

ـــہ میں لہو روتا ہوں ناحق ان کا دامن دیکھ کر

ان کا دامن بھر گیا ہے میرے ہی خون ناب سے

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ان کا دامن خوں آلود دیکھ کر رشک ہوتا ہے کہ میرے سوا بھی کوئی دوسرا اپنے اشک خونیں ان کے دامن سے پونچھنے کا حق رکھتا ہے ۔ پھر یہی رشک میرے لیے سبب گریہ بن جاتا ہے ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میرا ہی خوناب تھا جس سے آلودہ ہونے کا خیال میری خودفراموشی نے نہ ہونے دیا ۔ یہ بلاغت کلام کی ایک عمدہ مثال ہے ۔

؎ چشم سے اشک رواں لب پہ ہے آہ سوزاں

شیفتہ کس کے لیے آپ کی یہ حالت ہے

عشق محبوب میں عاشق کی حالت زار کیسا مبنی بر حقیقت نقشہ پیش کیا ہے ۔ مہر کی دلسوزی و جانگدازی صاف جھلکتی ہے ۔

؎ روز غم میں کیا قیامت ہے شب عشرت کسی یاد

اشک خوں سے آ گئیں رنگینیاں صحبت کی یاد

بقول شیخ سعدی " قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید ،، ۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے جس کی صداقت سے کسی کو انکار نہیں ۔ شیفتہ کے اس شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کمال صرف ایک شاعر حقیقی ہی کا حصہ ہے ۔ اور یہ کمال شیفتہ کو حاصل ہے ۔ شعر کے اجزاء پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ " کیا قیامت ہے،، کا ٹکڑا کتنا اثر میں ڈوبا ہوا ہے ۔ " اشک خوں ،، سے " صحبت کی رنگینیاں ،، یاد آنا شیفتہ کے اجتہاد فکر کی بیّن مثال ہے ۔ الفاظ کا ترنم الگ قابل ستائش ہے ۔

؎ غالباً ایّام حرماں بے خودی میں کٹ گئے

آتی ہے پھر آرزو بھولی ہوئی مدّت کی یاد

یہ شعر داد سے مستغنی ہے ۔ مدت کی بھولی ہوئی آرزو کے یاد آنے سے اس نتیجے پر پہنچنا کہ " غالباً ایّام حرماں بے خودی میں کٹ گئے،، وہ معنی آفرینی اور زور تخیّل ہے کہ بیان سے باہر ہے ۔ یہ ہے دریا کو کوزے میں بند کرنا ۔ ایک وسیع مضمون کو چند لفظوں میں ادا کر دیا گیا ہے ۔ ایک طرف فطرت محبت بیان کی جاتی ہے کہ وہ مدت

کی برباد رفتہ آرزو کو بھی یاد دلا ہی دیتی ہے۔ دوسری طرف آرزو کا نتیجہ لازم بتایا جاتا ہے کہ " بجز حرمان کچھ اور نہیں "۔ یہیں سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ " غالباً ایّام حرمان بے خودی میں کٹ گئے " ، ورنہ پھر آرزو کو دل میں مہمان کرنے کا خیال کیوں آتا۔ بیخودی کی یہ تعریف قابل صد تحسین ہے کہ اس نے حرمان کو نتیجۂ آرزو سمجھنے ہی نہیں دیا ۔

؎ طاقت جنبش نہیں اس حال پر قصد عدم

مر گئے پر بھی رہے گی اپنی اس ہمت کی یاد

اس غزل کا ہر شعر پیکر تاثیر ہے اور خیالات کی ندرت ،جذبات کی بلندی، ترکیب کی خوش ادائیوں کے اعتبار سے شیفتہ کی استادانہ روش اجتہاد کا شاہد ہے ۔

؎ بزم دنیا میں ہے دو شخص کو کب عیش نصیب

سو تجھی کو سہی مجکو تو یہ غم بھی بس ہے

دنیا دو دلوں کو بیک وقت عیش و آرام میں زندگی گزارتے نہیں دیکھ سکتی ۔ دنیا میں دو شخصوں کا عیش سے بہرہ پانا تو گویا مان لیا گیا۔ اب عیش نصیب ہو سکتا ہے تو صرف ایک کو ۔ وہ معشوق ہو یا عاشق ۔ مگر عیش اور عشق میں بعد بعید ہے تو ظاہر ہے کہ عاشق اپنے دامن کو عیش کے بدنما داغ سے کیوں آلودہ کرنے لگا۔ اور اگر عشق کے ساتھ عیش ممکن بھی ہو تو ایثار نفس اور تقاضائے محبت کب اجازت دیتا ہے کہ معشوق کے مقابلے میں اپنے کو مستحق عیش قرار دے ۔ ان حقائق کو شاعر نے صرف دو مصرعوں میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کر دیا ہے ۔

۲- زبان و بیان کی خوبیان :

زبان و بیان کے اعتبار سے شیفتہ کا کلام کسی سے کم نہین ہے - شیفتہ کے کلام مین محاکات کے عمدہ نمونے موجود ہین - کسی خیال یا جذبے کو اس طرح بیان کرنا کہ اصل واقعے کی طرح معلوم ہونے لگے اور آنکھون مین اس کی تصویر پھر جائے، محاکات کہلاتا ہے - چند مثالین ملاحظہ ہون :

ے سب باتین انھی کی ہین یہ ، سچ بولیو قاصد

کچھ اپنی طرف سے تو تصرّف نہین کرتا

کوچۂ محبوب سے قاصد آیا ہے اور محبوب نے جو پیغام بھیجے ہین ایک ایک کر کے سنا رہا ہے - پیام توقع کے خلاف ہین - اس لیے تعجب سے قاصد سے پوچھا جا رہا ہے کہ سچ کہنا یہ سب باتین انھی کی ہین - شعر کے الفاظ سے اس موقع کی تصویر آنکھون کے سامنے آ جاتی ہے -

ے وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زھد کی

مین کیا کہون کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

یہ شعر شاعرانہ شوخی کی بھی بہترین مثال ہے اور نہایت ہی پرلطف انداز مین صرف لفظون کی مدد سے اصل واقعے کا نقشہ بھی نگاہون کے سامنے آ گیا- شعر کے طرز سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت شیفتہ رات ایسے شخص کے گھر ملے جہان ان کا ہونا ان کی شہرت زھد کی قلعی کھول دیتا ہے ، اگرچہ الفاظ مین کہین اس کا ذکر نہین -

ع یاس سے آنکھ جو جھپکی تو توقع سے کھلی

رات بھر وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

یہ شعر انتظار کی کیفیت کی واقعی تصویر ہے ۔ انتظار میں جو متضاد کیفیات طاری ہوتی ہیں ان کا بیان صرف چند لفظوں میں ایک دلنشین انداز میں کیا گیا ہے ۔ امید و بیم کی حالت کا اندازہ کم و بیش ہر شخص کو ہے ، اس لیے جزئیات سے قطع نظر کر کے صرف شعر مذکور کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں ۔ مایوسی کی حالت میں محض آنکھ جھپکنا ظاہر کیا ہے تاکہ تحریک امید کا چونکا دینا بعید از قیاس نہ سمجھا جائے ۔

ع ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی

تھام لینا وہ تیری محمل کو

اس شعر کی طرز ادا اس قدر سادہ اور دلپسند ہے کہ بیتابیٔ شوق کا منظر بے ساختہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔

ع گل شیفتہ سحر کو عجب حال خوش میں تھے

آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

شعر کے اجزاء حالت واقعہ سے اتنے متناسب اور الفاظ اس قدر ترنم خیز واقع ہوئے ہیں کہ شعر سن کر بغیر کسی تامل کے حالت سکروستی کی تصویر ذہن میں کھنچ جاتی ہے ۔ اور اسی کا نام قدرت کلام اور واردات و روحانیت کی تصویر نگاری ہے ۔

شیفتہ کے کلام میں صفائی اور روانی کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ اس خصوصیت میں بہت اہم نظر آتے ہیں ۔ پورا دیوان دیکھ جائیے مشکل سے ایک آدھ شعر ایسا ملے گا جس میں تعقید لفظی پائی جائے یا کلام اپنی اصل ترتیب کے خلاف نظم ہوا ہو ۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں کہا ہے جس کا ذکر وہ اپنے مندرجہ ذیل شعر میں کرتے ہیں :۔

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ

معنی شگفتہ ، لفظ خوش ، اندازصاف ہو

اب تک جو اشعار مختلف محاسن شعر یہ کے تحت بیان کیے گئے ہیں اگرچہ وہ بھی اس زیور خوبی سے آراستہ ہیں تاہم ذیل میں کچھ ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو دیگر خوبیوں سے قطع نظر کر کے صرف صفائی و بے تکلفی کا نمونہ ہوں گے :

۔ جفاؤ جور کا اس سے گلہ کیا — جو پوچھے مہربانی کیا وفا کیا

فنائے عاشقاں عین بقا ہے — دیت رندوں کی کیسی خون بہا کیا

ہمیں تھا آپ قصد عرض احوال — جو وہ خود پوچھتے ہیں پوچھنا کیا

نہایت سادہ زبان میں سلاست کے ساتھ مندرجہ بالا اشعار میں تغزل کا رنگ دیا گیا ہے ۔ چند اور اشعار ملاحظہ ہوں :

۔ یار کو محروم تماشا کیا — مرگ مفاجات نے یہ کیا کیا

غیر ہی کو چاہیں گے اب شیفتہ — کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا

ایسی تنگ بحر میں فصیح و بلیغ مضامین کا اس روانی سے سمو دینا ، شیفتہ

کا کمال فن ہے ؎

نہ ہمارا کوئی دشمن نہ ہمارا کوئی دوست — وہ نظر اور ہے جو اہل نظر رکھتے ہیں

شیفتہ ہم سے ہو جس شخص کو ملنا مل لے — صبح اس شہر سے ہم قصد سفر رکھتے ہیں

یہ اشعار بھی سلاست و روانی کی بہترین مثالیں ہیں ۔

؎ اٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستان بادہ فروش

طلسم ہوشربا ہے دوکان بادہ فروش

" طلسم ہوشربا " کی مقبولیت کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ شیفتہ جیسے ذی ہوش شاعر اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔ مصرعے میں " طلسم ہوشربا " کی خصوصیت کی طرف نہایت شستہ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے ۔

؎ آخر جہاں میں شب تاریک بھی تو ہے

اچھا نہ آئیں آپ شب ماہتاب میں

نہایت صاف اور دلکش معنی خیز شعر ہے ۔ ذیل کے اشعار میں لطف زبان کے علاوہ متانت خیالات اور علو جذبات کا رنگ بھی قابل دید ہے :؎

اے جان بیقرار ذرا صبر چاہیے — بیشک ادھر بھی آئیگا جھونکا نسیم کا

اب کی ارادہ ملک عدم کا ہے شیفتہ — گھبرا گئے کہ ایک جگہ کیا بسر کریں

اس غیرت گل سے ربط معلوم — ہرچند میں ہمدم صبا ہوں

ہمدم نہ سہی محبت اس کو — اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

هزار شکر کہ اس کی گلی میں چھوڑ گئی — نسیم جان کے اک ناتوان غبار مجھے

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے — صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی

سب فسادے کا نہیں ہے جو دماغ — ایک چھوٹی سی حکایت ہی سہی

زبان دانی کی بڑی سے بڑی تعریف یہ ہے کہ محاورات پر عبور ہو اور ان کا برمحل استعمال کیا جائے، لیکن جب محاورات کے استعمال سے مضامین بھی پیدا کر دیئے جائیں اور ان سے دوسرے شاعرانہ فوائد بھی حاصل کیے جائیں تو اس قدرت شاعری کو سکۂ زنی ہی کہا جا سکتا ہے ۔ شیفتہ کی شاعری میں محاورہ بندی کی مثالیں ہر رنگ کی موجود ہیں جو انتخاب ذیل سے نمایاں ہوں گی :

کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں — اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

زاریٔ شب کے زور تو دیکھے — تجھ میں بھی دم دم سحر کچھ ہے

کیوں روکتا ہے اس میں ضرر کیا ہے پاسبان — دیوانہ ایک گھر میں محمل لگا چلے

یہ کس کس سے اس میں بگڑے گی کچھ یہ بھی دھیان تھا

باتیں تو آپ شیفتہ ان سے بنا چلے

ڈوب مرنے کی جگہ ہے غسل صحت ہجر میں — روئے دیتا ہوں احبا کی مبارکباد سے

منھ بنائے ہوئے اس کو سے گزر کرتا ہے — اب تو لو غیر بھی دل میں مرے گھر کرتا ہے

میں کہیں توبہ میں ہوں آپ، لیکن کیا کروں — منھ میں بھر آتا ہے پانی جام و مینا دیکھ کر

ہے شمع انجمن وہ یہ آتشیں عذار — گھی کے جلیں گے آج تو دشمن کے گھر چراغ

بوسۂ لب نہ مانگنا اے دل — منھ لگاتا ہے کون سائل کو

صنائع بدائع کے تکلّف آمیز التزام سے شیفتہ کا کلام خالی ہے ۔ کہیں کہیں کچھ شعر اگر ہیں بھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زور طبع سے خود بخود نظم ہو گئے ہیں ۔ ان میں خصوصیت سے صنعت گری کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے یہ اشعار بہت پرلطف ہو گئے ہیں :

ـہ تمھاری بات میں کیا آ گیا ہے شیفتہ فرق
کہ مدعی بھی کچھ اب مدعا بتاتے ہیں — تجنیس لفظی

ـہ پھر وہی بیقراریٔ تسکین
وہی تسکین بیقراری ہے — " "

ـہ جلوۂ معنی نظر آنے لگا
پھٹتے پھٹتے میٔ یہ صورت ہو گئی — " "

ـہ آپ مرتے تو ہیں پر جیتے ہی بن آئے گی
شیفتہ ضد پہ جوانی وہ ستمگر آیا — صنعت تضاد

ـہ آتی ہیں یاد کاکل و گل کی حکایتیں
روتا ہوں دام و مرغ گرفتار دیکھ کر — لف و نشر مرتّب

شیفتہ کے کلام میں حسن ترکیب و بندش الفاظ کا ذکر کرتے ہوئے ابوالولا محمد ذکریا مائل فرماتے ہیں :

" فارسی شاعری کے متعلق یہ فیصلہ مسلّمہ ہے کہ اس میں مفردات کی نسبت الفاظ کی ترکیب سے بہت کام لیا جاتا ہے اور اکثر بڑے بڑے

خیالات کی جان صرف ایک ترکیب مین مضمر نظر آتی ھے ۔ اس خصوص مین شعرائے متقدّمین جن پر اردو شاعری کا اساس ھے قابل ستائش ھین کہ انھون نے فارسی تراکیب کو اردو مین شامل کر کے اس کی وسعت مین بہت کچھ اضافہ کر لیا ھے ـــ غالباً یہی فائدہ تھا جسے پیش نظر رکھتے ھوئے متاخرین مین غالب اور مومن نے اس طرف خاص توجہ کی ۔ ان دونون بزرگون کی کوششون اور ان کی تقلید کے اثرات سے اب ترکیب سے کام لینا گویا رواج عام ھو گیا جو یقیناً ترقیٔ اردو کا بڑا راز ھے۔ ـــ شیفتہ جنھون نے ان بزرگون کی صحبت اور تلمذ سے باقاعدہ استفادہ کیا تھا ، اس رحجان کو کیون نہ قبول کرتے ـــ،،[1]

ذیل مین شیفتہ کے کلام سے بندش الفاظ اور چستیٔ ترکیب کی چند منتخب مثالین پیش کی جاتی ھین :

ے کب ھوئین گستاخیان آداب دان عشق سے
دیجیے تعزیر تمکین ھوس انگیز کو

مفہوم یہ ھے کہ گستاخیون کا الزام " آداب دان عشق ،، پر درست نہین ھے ، بلکہ آپ کی تمکنت اور وقار حسن اس کا ذمہ دار ھے ، کیونکہ اسی نے ھوا و ھوس کے غیر متناھی جذبات کو بھڑکا دیا ورنہ ظاھر ھے " آداب دان عشق ،، سے کوئی امر خلاف آداب سرزد ھو ھو نہین سکتا ۔

١ـ تسنیم ، جلد اوّل ، شمارہ ٣، ص ٢٧

ـــہ ملک الموت کے گھر کا تھا ارادہ اپنا

لے گیا شوق غلط کار تیرے کوچے مین

" شوق غلط کار،، کی ترکیب قابل تعریف ہے ۔ پہلے مصرعے مین جو ارادہ ظاہر کیا ہے دوسرے مصرعے مین صرف " شوق غلط کار،، اس کے وقوع پذیر نہ ہونے کی وجہ بیان کر دی ہے ۔

ـــہ یا اپنے جوش عشوۂ پیہم کو تھا مے

یا کہیے مین بھی نالۂ شورش فزا کرون

" جوش عشوۂ پیہم،، ایک بلیغ ترکیب ہے، جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ محبوب کی عشوہ زائیان غیر محدود ہین ۔ دوسری طرف " نالۂ شورش فزا ،، کی ترکیب بھی کتنے ہی آثار کو اپنے دامن مین لیے ہوئے ہے ۔

ـــہ اثر آہ دل زار کی افواہین ہین

یعنی مجھپر کرم یار کی افواہین ہین

" کرم یار،، کو " اثر آہ دل زار،، کا مرادف بنا لینا صرف ترکیب کی سحرکاری ہے ۔

ـــہ بچتے ہین اس قدر جو ادھر کی ہوا سے ہم

واقف ہین شیوۂ دل شورش ادا سے ہم

یہ " شیوۂ دل شورش ادا ،، کی برکت ہے جس نے ثابت کر دیا کہ ادھر کی ہوا دل کے لیے وجہ شوریدہ سری ہو جاتی ہے ۔

ے لطف قاتل میں تامل نہیں پر کیا کیجیے

سر شوریدہ مرا قابل فتراک نہیں

" لطف قاتل "، " سر شوریدہ " اور " قابل فتراک " ترکیبوں کی مدد سے ایک وسیع مفہوم ادا کر دیا گیا ہے ۔

ے شکوہ آئین محبت میں ہے ایجاد لطیف

نسخۂ اصل میں ہرچند کہ یہ باب نہیں

" ایجاد لطیف " کی ترکیب نے ایک معمولی خیال کو بلند کر دیا ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ گلہ و شکایت اگرچہ عناصر محبت میں شامل نہیں، لیکن ان کے پرلطف ہونے میں بھی کلام نہیں ۔

ے تھی لحظہ لحظہ ہجر میں اک مرگ نو نصیب

ہر دم خیال لب سے ترے ہم جیا کیے

اصل شعر تو اسی حد تک ہے کہ فراق کا ایک ایک لمحہ موت ہے ۔ مگر تیرے لب جان بخش کا خیال، مسیحا کا حکم رکھتا ہے، اس لیے جیتے رہتے ہیں ۔ لیکن حقیقت میں جو بات جاذب توجہ ہے وہ " مرگ نو " کی نادر ترکیب ہے جس میں ذوق سلیم کے لیے بہت سامان کیف و مسرّت پنہاں ہے ۔

ے کس نے سنا دیا دل حیرت زدہ کا حال

یہ کیا ہوا کہ آئینہ اب رو برو نہیں

مومن کا شعر ہے ے

" مرے تغیّر حال کو مت دیکھ

تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے "

شیفتہ انھی کے شاگرد ھین اور شاگرد پر استاد کا پرتو ضرور پڑتا ھے ۔ انھوں نے بھی وھی مضمون باندھا ھے ۔ اپنے انداز مین کمال کر دیا ھے ۔ " دل حیرت زدہ " کی ترکیب نے شعر کا حسن دوبالا کر دیا ۔

ـہ دیکھ کر آئینہ دیکھین ھم ھمین گے یا نہین

اپنے غم کا لین گے سیر زعفران سے امتحان

اپنے غم کا امتحان آئینہ دیکھنے پر ھوگا اور اس طرح ھم " سیر زعفران " یعنی اپنے چہرے کی پیلاھٹ کا اندازہ خود کر لین گے ۔

ـہ ھم ھین ایسے فراخ رو درویش

محفل پادشاہ سے عار نہین

" فراخ روئی " سے اپنی وسعت ظرف کا معیار نمایان کر دیا ھے ۔

ـہ غمزہ نادر طلب اور عشوہ ھے نایاب پسند

جنس یان دل ھے سو نادر نہین نایاب نہین

غمزہ کی " نادر طلبی " اور عشوہ کی " نایاب پسندی " خوبصورت تراکیب ھین جن سے حسن معنی مین نکھار آ گیا ھے ۔

ـہ کس لطف سے وہ لطف سے فارغ ھین کہ عشّاق

تاب نگہ حوصلہ فرسا نہین رکھتے

" تاب نگہ حوصلہ فرسا ،، کی ترکیب اس شعر کی روح ہے -

ع تنہا ملا ہے یار زمان دراز میں

اے فرط جوش شوق بس اب تو مخل نہ ہو

ع زنجیر آدھی رات کو کھڑکائے اور کون

اے جذب اشتیاق وہ پیمان گسل نہ ہو

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں " فرط جوش شوق ،، ، " جذب اشتیاق،، اور " پیمان گسل ،، کی تراکیب سے اشعار کی معنویت بہت بڑھ گئی ہے -

اسی طرح شیفتہ کے کلام میں بے شمار ترکیبیں اور بندشیں ملیں گی جو ان کی شاعرانہ عظمت اور فنکارانہ صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں - ہم طوالت کے خوف سے انھی پر اکتفا کرتے ہیں -

۵- تصوّف ـ اخلاق و حکمت :

بدرالحسن اختر بدایونی ، شیفتہ کے کلام میں تصوّف ، اخلاق و حکمت کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" مضامین کے اعتبار سے شیفتہ کا کلام تصوّف ، پند و حکمت سے مالا مال ہے - ان مضامین کو انھوں نے قطعات ذیل میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے - مثلاً اس خیال کو کہ دنیا میں ہر شخص اپنے خیال میں مستغرق ہے مگر اپنی ماہیت سے بے خبر، ایک مشہور

قطعہ میں اس طرح نظم فرمایا ہے :۔

ساقی کو میکدے میں سر ناؤ نوش ہے
صوفی کو خانقہ میں سر وجد و حال ہے

عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز میں
معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شئے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے
ہر بات منطقی کی مراد جدال ہے

ارباب حکمت نظری کو عمل نہیں
اہل کلام کو ہوس قیل و قال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فن نجوم میں
عمر ان کی صرف زائچہ ماہ و سال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے [۱]

اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ دنیائے اردو میں تصوّف کو عموماً مقبولیت حاصل نہیں ۔ اس کا بڑا سبب یقیناً یہ ہے کہ موضوع عام دسترس مذاق سے باہر ہے، لیکن پھر بھی خواص اس سے نابلد نہیں ۔ شیفتہ کے حالات میں ان کا چند صاحب باطن لوگوں سے مستفید ہونا بیان کیا جا چکا ہے ۔ شیفتہ کی روحانی اور متصوّفانہ قابلیتیں ان بزرگوں کے تعلق سے نکھر گئیں ۔ اسی لیے شیفتہ کے کلام میں اس قسم کے مضامین بھی ملتے ہیں :۔

کل نغمہ گر جو مطرب جادو ترا نہ تھا
ہوش و حواس، عقل و خرد کا پتہ نہ تھا

بظاہر شعر میں کوئی بات سلوک یا روحانیت کے مسلک سے مخصوص طور پر متعلق نہیں معلوم ہوتی ۔ مگر اک ذرا تامّل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نزول تجلّیات کے وقت جو کھو دینے

۱۔ مخزن نمبر۳، جلد ۳، لاہور اپریل ۱۹۵۰ء ، ص ۳۱

والی محویت طاری ہو جاتی ہے اس کی طرف اشارہ ہے اور کمال شاعری یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ مفہوم ایک حد تک مقصود تغزل سے جدا ہے پھر بھی اس لطف سے خالی نہیں ۔

؎ کہاں پھر وہ نایاب پایا جسے
غلط شوق ہے جنس نایاب کا

ہستیٔ الٰہی کا انسانی وہم و خیال سے باہر ہونا کیسے سہل اور حکیمانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے ۔ لفظوں سے معانی پر استدلال اور مجاز سے حقیقت کا اثبات اس سے بہتر شاید ہی ملے ۔

؎ پیر مغاں کے فیض توجہ سے شیفتہ
اکثر شراب پیتے ہیں روحانیوں میں ہم

خواجہ حافظ کی شراب تصوّف تو بعض لوگوں کو اصل شراب کے دھوکے میں بھی ڈال دیتی ہے ۔ غالباً شیفتہ کی شراب نوشی اس بدگمانی سے پاک ہے ۔ ذیل کے شعر میں اپنے مسلک کو اور زیادہ صاف کر دیا ہے ۔

؎ قدح سے دل ہے مراد اور مئے سے عشق غرض
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبان بادہ فروش

ایک جگہ اور بھی اس مضمون کو ادا کرتے ہیں :؎

جلوۂ معنی نظر آنے لگا پیتے پیتے مئے یہ صورت ہو گئی

جام مئے دے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھکو کہ جہاں دخل صبا کو بھی سفارت میں نہیں

جب کوئی نامہ بر نہیں ملتا حرمان نصیب عشاق دل بہلانے کے لیے صبا ہی کو

بارگاہ محبوب کا پیامبر ٹھہرا لیتے ہین ۔ لیکن معشوق حقیقی کی خلوت گاہ خاص مین تو رسائی صبا کی بھی توقع معلوم ۔ اب بجز اس کے کہ بیہوشی سے کام لیا جائے اور کیا صورت ہو سکتی ہے ۔

ـــہ عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملیگا بادہ کشون سے نشان بادہ فروش

باعتبار مقصود اس شعر کا مفہوم بھی اوپر والے شعر سے ملتا ہے ۔ تاہم عشق حقیقی مین والہانہ بے خودی کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے ۔

ـــہ کب اہل خرابات کوئی بات کہین گے
جب تک کہ نہ ہم سے ہمین بیگانہ کرین گے

منزل محبت تک رسائی اور راز عشق سے آگاہی صرف بیخودی اور بیہوشی سے ممکن ہے اور پہلے مصرعے مین اس کا ثبوت موجود ہے یعنی یہ کہ خراباتی واقف راز ہین ۔

ـــہ یہی ہے شکر کہ دل کی نظر تو روشن ہے
نظر تو خیرہ ہوئی برق لن ترانی سے

بصارت اور بصیرت کی اثر پذیریون کے فرق پر اس عنوان سے تبصرہ کرنا شیفتہ ہی کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کا حصہ ہے ۔

ـــہ دھوکا مجھی کو صرف نہین میل یار کا
دیکھا بڑے بڑون کو اسی اشتباہ مین

اس شعر مین اس حالت کی طرف اشارہ ہے جب سالک اپنی استعداد طریقت رو بہ ترقی

دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اب مجھے قرب حاصل ہو گیا اور یہ خیال ترقی سے مانع آتا ہے ۔ اس لیے اپنے آپ کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ میل یار پر نازان نہ ہو ، یہ دھوکا ہے اور بڑے بڑے اس دھوکے میں مبتلا ہیں ۔

ے وہ تشخیص شخصی بھی جاتی رہی
کنارہ الشتے ہی جلباب کا

اس شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے غالب کا یہ شعر سنیے :ے

ے پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یعنی ان کی ہستی ایک سایہ تھی جو آفتاب میں جذب ہو گئی جیساکہ خود بھی شیفتہ نے ایک موقع پر کہا ہے ے

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

اسی طرح مندرجہ ذیل منتخب اشعار (ایک ہی غزل کے) شیفتہ کے یہاں تصوّف کی عمدہ مثالیں ہیں :ے

پائی ہے بوئے دوست عنادل نے باغ میں — پروانوں پر ہوئی ہے تجلّی چراغ میں
اس کا پتہ ملے تو ہمارا پتہ ملے — کھویا ہے ہم نے آپ کو جس کے سراغ میں
عارف نہیں وہ حفظ مراتب نہ ہو جسے — جو جلوہ باغ میں ہے کہاں ہے وہ راغ میں
ہرچند ایک نور سے روشن ہے بزم دھر — جو نور مہر میں ہے کہاں ہے چراغ میں

اک قطرہ جس کا مست کرے کائنات کو ۔۔۔ اے بے خبر وہ مئے ہے ہمارے ایاغ مین

ذیل مین چند مزید منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہین جو شیفتہ کی عام روش تصوف کو سمجھنے مین ممد ہون گے ۔ یہان سے اور بھی واضح ہو جائے گا کہ انھون نے اکثر تصوف کی اہم اصطلاحات اور خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر نہایت عمدہ اور صاف شعر کہے ہین :

ذات و صفات مین بھی یہی ربط چاہیے ۔۔۔ جو آفتاب و روشنیٔ آفتاب مین

آ نغمہ گر ہو چرخ مین لا آسمان کو ۔۔۔ آ رقص کر زمین کو ڈال اضطراب مین

فیض حق عام ہے افسردہ دل زار نہ ہو ۔۔۔ دشت کیا جلوہ گہہ لالۂ شاداب نہین

تجھکو نظر نہ آئے تو اپنا علاج کر ۔۔۔ ہے مرغزار جلوہ نما برگ کاہ مین

صیاد دلفریب کا اللہ رے لطف عام ۔۔۔ بے زخم ایک صید نہین صید گاہ مین

اہل طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ ۔۔۔ جتنا زیادہ شغل ، زیادہ فراغ بال

رواج عام اور قبول تام کی بدولت غزل نے ایسی وسعت اختیار کر لی ہے کہ اب عشقیہ مضامین کے علاوہ پندو حکمت ، تصوف ، فلسفہ ، خمریات وغیرہ سب اس کے اجزائے غیر منفک بن گئے ہین ۔ اردو غزل مین حکمت و اخلاق کا عنصر متقدمین شعرائے فارسی کا شامل کیا ہوا ہے اور انھین کی تقلید سے اردو مین داخل ہوا ہے ۔ حکمت و اخلاق ، شیفتہ کے کلام کی صنعت مخصوص نہین ہے لیکن نظرانداز کیے جانے کے قابل بھی نہین ۔ شیفتہ نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے نہایت عمدگی سے لکھا ہے اور ان کی نگاہ نکتہ رس خاص غوامض و اسرار تک پہنچنے مین کامیاب ہے ۔ سطحی خیالات اور معمولی

نصائح سے ان کے یہاں کوئی بحث نہین ۔ انھون نے جس خیال کو مدّ نظر رکھ کر کوئی تعلیم دی ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے ۔

ع نفس سرکش کی کسی ڈھب سے رعونت کم ہو
چاہتا ہون وہ صنم جس مین مروت کم ہو

شیفتہ کہتے ہین کہ ایسے صنم سے دل لگاؤ جس مین مروت کم ہو ۔ اس کمئی مروت سے تمہاری والہانہ شورش و دیوانگی ترقی کر جائے گی اور اس کے نتیجے مین وہ سب کچھ ہو رہے گا جو عشق و محبت کی غایت خاص ہے، یعنی رسوائی، پریشانی، بیخودی وغیرہ ۔ جب یہ باتین پیدا ہو جائین گی تو نفس سرکش کی رعونت لامحالہ کم ہو جائے گی ۔ مقصد یہ ہے کہ رعونت نفس کا انسداد بہت اہم ہے اور اس کے لیے ایسی باتین بھی گوارا کرنے مین کوئی حرج نہین ۔

ع منع کی حرص مین انسان ہوا ہے مجبول
ناصحو دوست اگر ہو تو نصیحت کم ہو

وہ سمجھتے ہین کہ جس طرح ممکن ہو نصیحت ایسے انداز مین ہونی چاہیے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ اثر ہو ۔ بے اثر نصیحتون کا کوئی فائدہ نہین ۔ نصیحت مین اثر اس وقت ہوگا جب ناصح خلوص کے ساتھ کوئی نصیحت کرے گا ۔

ع فعل حکیم عین صلاح و ثواب ہے
ساقی اگر شراب نہ دے سرگران نہ ہو

بظاہر دوسرا مصرعہ مقصود شعر معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل پہلے مصرع سے

تسلیم و رضا کی تعلیم مراد ہے ۔

؎ وجد کو زمزمۂ مرغ سحر کافی ہے
شیفتہ ساز مغنّی و مزا میر نہ کھینچ

وجد اور حال آوری کے لیے مغنّی کی نازکشی ضروری نہین ہے ۔ اگر حساس دل اور صحیح ادراک میسّر ہو تو مرغ سحر کی زمزمہ سنجی اس سے کہین مفید ہے ۔

؎ طلبگار راحت ہین نادردمند
اگر درد ہے فکر درمان عبث

درد نہ ہونا ہی راحت طلبی کا سبب ہے، ورنہ درد خود ایک راحت ہے ۔

؎ واجب کی حکمت آئے گی ممکن کی عقل مین
کتنا دماغ ہے خلل آگین حکیم کا

واجب تعالیٰ کی حدّ معرفت سے باہر ہونے کا اعتراف کم و بیش سب نے کیا ہے ۔ اور اس کے مختلف طریقے اختیار کیے ہین ۔ شیفتہ بھی اسی زمرے مین ہین مگر ان کا اسلوب بیان نرالا ہے ۔ وہ صرف اسی شعر پر تمام بحث ختم کر دینا چاہتے ہین ۔

؎ اس شوخ کج ادا سے نہ آئی موافقت
کیونکر گلہ نہ ہو مجھے طبع سلیم کا

شیفتہ ناموافقت کے معاملے مین اپنی ہی طبع سلیم کو مستحق شکایت قرار دیتے ہین ۔

؎ مشہور روزگار ہے محسود روزگار
بے التفاتیون سے ہمارا زیان نہین

شیفتہ کے نزدیک شہرت پسندی معیوب ہے ۔ اس لیے کہ جو لوگ مشہور ہوتے ہین ابنائے زمانہ ان سے حسد کرنے لگتے ہین ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کی بے التفاتیون کی ایک معقول توجیہہ ہے اور اصل مقصود اس حقیقت شہرت کی چہرہ کشائی ہے ۔

صلح کل اپنی تو داعست مین بے معنی ہے ؎
وہ ہوئے صاف تو ہے غیر مکدّر ہم سے

شیفتہ کے نزدیک ایک عام اور ہمہ گیر ہردلعزیزی کا خبط ایک سعی لاحاصل ہے ۔ شیفتہ کا کمال فن یہ ہے کہ تغزّل کی رعایت کہین ہاتھ سے جانے نہین دیتے ۔ اسی مضمون کو مندرجہ ذیل شعر مین بھی پیش کیا گیا ہے ؎

عشق سے اور بڑھی ہائے قساوت دل مین
غیر کو رنج ہوا ہے تو ہمین راحت ہے

فرحت نفس جو وہ ہے تو یہ ہے راحت روح ؎
کیا بزرگی مین مزہ ہے کہ حقارت مین نہین

شیفتہ بزرگی اور حقارت مین یہ فرق دکھاتے ہین کہ پہلی فرحت نفس ہے اور دوسری راحت روح ۔

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب مین کوشش ؎
ورنہ کچھ غیر سو اہم سے جسارت مین نہین

مسلک عشق مین ہر شخص اپنے حریف کے مقابلے مین خود کو لائق ترجیح سمجھتا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہین بیان کرتا ۔ شیفتہ کو یہان بھی امتیاز حاصل ہے ۔

ع
واعظ کے قول خوب ہیں رندوں کے فعل خوب
وہ ان سے سیکھ لیجے یہ ان کو سکھائیے

شیفتہ راہ سلوک میں کسی خاص گروہ کے پابند نہیں ہیں - ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ضرورت بتاتے ہیں اور اختلاف کو اس طرح وحدت میں تبدیل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں -

حکیمانہ انداز بیان کے اعتبار سے درج ذیل اشعار بھی لائق ستائش ہیں :

ع
کرم کرم نہ سمجھ گر کسی غرض سے ہو
ستم ستم نہ سمجھ گر ہو امتحان کے لیے

ع
اپنا ٹوٹا گھر بہت مرغوب ہے
بارگاہ ثابت و سیّار سے

ع
سجدہ کسی کسی در پہ تمنّا نہیں رکھتے
گردن پہ سر ناصیہ فرسا نہیں رکھتے

۲- سیاسی پہلو :

سید خضر برنی کے خیال میں " شیفتہ کے کلام میں سیاسی پہلو کسی ڈھب سے بھی نظر نہیں آتا،،[1] یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے - اگر شیفتہ کے کلام کا بہ نظر غائر

۱- نگار مئی ۱۹۶۰ء ، ص ۲۷

مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس قسم کے لطیف اشارے ملتے ہیں جن سے شیفتہ کے سیاسی شعور کا پتہ چلتا ہے ۔

مولانا صلاح الدین احمد ، شیفتہ کے کلام میں قومی اور وطنی جذبات اور فطرت کے تاثرات کی بجا طور پر نشاندھی فرماتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

" شیفتہ ہماری زبان کا شاید پہلا شاعر ہے جس کی غزلوں میں قومی اور وطنی جذبات اور فطرت کے تاثرات کی ایک جھلک نظر آتی ہے ۔ وہ اپنی قوم کی زبوں حالی سے بدرجۂ غایت متاثر تھا اور یہ تاثر کبھی کبھی اس قسم کے اشعار میں جھلک اٹھتا ہے:

سہ کیا ڈھونڈتی ہے قوم کہ آنکھوں میں قوم کی
خلد بریں ہے طبقۂ اسفل جحیم کا

سہ بے سخن صحبت مع اللہ ہے اسے
قوم سے جس کو کہ صحبت ہو گئی

یہ شعر غالباً سرسید کی شان میں کہا گیا ہے ۔ پھر اسے اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی جس کا اظہاراس نے اپنی اس غزل میں بھرپور انداز سے کیا ہے ، جس کا مطلع ہے سہ

ہند کی وہ زمین ہے عشرت خیز
کہ نہ زاہد جہاں کریں پرھیز

پھر وہ مظاہر فطرت میں سے صبح کا عاشق زار بھی تھا اور اس کی

بیان سخن اول سے آخر تک انوار سحر سے مستیز ہے - ایک دو شعر ملاحظہ ہوں :-

شیفتہ ذوق سحر اس نے کہاں دیکھا ہے
وہ جو کہتا ہے کہ ہے آخرشب خواب لذیز
خرّم نہاد میکش و زاہد شگفتہ دل
ہے شیفتہ ہر ایک کو وقت سحر سے فیض
چلیے چمن کو نجم سحر جلوہ گر ہوا
پروین نہیں ، نبات نہیں ، کہکشاں نہیں
اٹھ صبح ہوئی مرغ چمن نغمہ سرا دیکھ
نور سحر و حسن گل و لطف ہوا دیکھ ،، -[1]

شیفتہ کے سیاسی شعور اور ان کی شاعری میں سیاسی پہلو پر بات کرتے ہوئے، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی فرماتے ہیں :

" جس زمانے میں شیفتہ کا تصور حیات یہ تھا کہ :-

کافی ہے خوش گزرنے کو دنیا میں اس قدر
معشوق خوش مزاج ہو وجہ کفاف ہو

اس وقت ان سے اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت کے انحطاط اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے دردمندانہ شعور کی توقع نہیں کی جا

۱- دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۳۲ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

سکتی تھی ۔ چنانچہ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلّط کی وجہ سے جو ایک قسم کا امن و سکون پیدا ہو گیا تھا اس کی داد ایک پرجوش قطعہ بند کی شکل میں سرزمین ہند کو ایک عشرت گاہ قرار دے کر دی ہے ۔ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں کہ شیفتہ نے یہ غزل ۱۸۵۷ء سے پہلے کہی ہے ، لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں کہی گئی ۔ اس کا مطلع ہے ؎

ہند کی وہ زمین ہے عشرت خیز
کہ نہ زاہد جہاں کریں پرہیز

یہی غزل لکھنے والے شیفتہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دہلی کے بارے میں اپنا تاثر یوں بیان کرتے ہیں :؎

ویرانے کی مانند ذرا جی نہیں لگتا
ہرچندکہ ہے شیفتہ دلّی وطن اپنا

اور اس سے زیادہ واشگاف الفاظ میں وہ پردرد مرثیہ لکھتے ہیں جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہائے دہلی و زہے دل شدگان دہلی (*)
آپ جنت میں ہیں اور دل نگران دہلی ،،[۱]

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۲۲۳

(*) شیفتہ کا " مرثیۂ دہلی ،، مولانا صلاح الدین احمد کے مرتبہ دیوان شیفتہ میں شامل ہے ۔ اس سے پہلے کے ایڈیشنوں میں ، نہیں ملتا ۔ اسکے بعد دیوان شیفتہ مرتبہ حبیب اشعر اور کلیات شیفتہ (اردو) مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری میں بھی ملتا ہے ۔ (مقالہ نگار)

ابوالخیر کشفی شیفتہ کی غزلوں میں سیاسی پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی کتاب " اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر"، میں فرماتے ہیں :

" شیفتہ کی غزلیات کا سیاسی پہلو بہت نمایاں ہے ۔ سید احمد شہید ، ان کے رفقاء اور دوسرے مجاہدین آزادی نے جس طرح جان دے کر پنجۂ صیاد سے نجات حاصل کی ، غالباً اسی کا شاعرانہ اظہار شیفتہ نے یوں کیا ہے ۔۔ع

رشک آزادی پہ ہے ایسے اسیروں کی مجھے
چھٹ گئے جو جان دیکر پنجۂ صیاد سے

شیفتہ نے محض حالات کی ابتری کے نوحے پیش نہیں کیے بلکہ دعوت عمل بھی دی ہے ۔ ان کے سوانح سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر صاحب ضبط و صبر تھے اور اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قافلے نالۂ و فریاد سے نہیں عمل سے منزل آزادی تک پہنچتے ہیں ۔ ۔ع

بے تکلف جی میں جو آئے کرو
کیا دھرا ہے نالہ و فریاد میں

اس دعوت عمل کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے گردو پیش کے ماحول کو بھی پیش کیا ہے ۔ وہ دور جس میں دانش و دین کے چرچے پر غوغائے غلامی چھا چکا تھا ، ہر قدم پر شہیدان آزادی کے مزار تھے اور کوئی دل بے زخم نہ تھا ۔ ۔ع

نہ اس زمانے میں چرچا ہے دانش و دین کا

نہ شوق شعر تر و بذلہ ہائے رنگین کا

نہ یاں فغاں سے لہو ٹپکتا ہے

میں نوا سنج شاخسار نہیں

نہ دور میں اس کی چشم مژگاں کے

کس جگہ تربت شہید نہیں

نہ کس نے تاراج کیا ملک دل و دین کہیے

آج تم شیفتہ کچھ بے سر و ساماں سے ہو

" ملک و دین " کی ترکیب کو ذہن میں رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ شیفتہ کی بے سروسامانی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی کیفیت کا تاریخی بیان ہے۔"

اس کے علاوہ وطن دوستی اور شیفتہ کے ذاتی تاثرات بھی ان کی شاعری میں جابجا جلوہ گر نظر آتے ہیں :۔ نہ

عجب ہی شہر ہے دلی بھی شیفتہ ہرگز

میں روم و شام نہ لوں اس دیار کے بدلے

نہ اپنا ٹوٹا گھر بہت مرغوب ہے

بارگاہ ثابت و سیّار سے

؎ گاؤں بھی ہم کو غنیمت ہے کہ آبادی تو ہے

آئے ہیں ہم سخت پرآشوب صحرا دیکھ کر ،،[۱]

۷۔ تسلسل مضامین :

یوں تو غزل کا ہر شعر مضمون کے اعتبار سے اپنی جگہ ایک " اکائی ،، ہوتا ہے ، لیکن شیفتہ کے یہاں کبھی کبھی غزلوں میں وحدت تاثر اور تسلسل مضامین کی شکل بھی دکھائی دیتی ہے ۔ یہ چیز شیفتہ کو ان کے بہت سے معاصرین سے ممتاز کر دیتی ہے ۔ ابوالولا محمد ذکریا مائل شیفتہ کی غزلوں میں اس امتیازی وصف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" حضرت شیفتہ کے معاصر شعراء اور غالباً اکثر متقدمین نے بھی غزلیات میں مسلسل مضامین بہت کم لکھے ہیں ۔ مگر ان کے مختصر سے دیوان میں کئی غزلیں مسلسل مضامین سے مزین نظر آتی ہیں ، جس سے ان کی ممتاز روش سخن گوئی کا پتہ چلتا ہے ۔ ذیل کی غزل ہندوستان کی تعریف میں ہے :

ہند کی وہ زمین ہے عشرت خیز   کہ نہ زاہد جہاں کریں پرہیز

وجد کرتے ہیں پی کے مئے صوفی   مست ہوتے ہیں صبح تک شب خیز

۱۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ، ص ۲۲۷

رند کیا یاں تو شاہد و مئے سے　　پارسا کو نہیں گزیر و گریز

---　　---

شیفتہ تمام لو عنان غزل　　یہ زمین گرچہ ہے ہوس انگیز "[1]

اسی طرح درج ذیل غزل مسلسل بھی عاشقانہ جذبات کو نہایت موثر انداز میں پیش کرتی ہے :ـہ

پھر محرک ستم شعاری ہے　　پھر انہیں جستجو ہماری ہے

پھر وہی داغ و دل سے صحبت گرم　　پھر وہی چشم و شعلہ باری ہے

پھر خیال نگاہ کافر ہے　　پھر تمنائے زخم کاری ہے

پھر وہاں طرز دلنوازی ہے　　پھر یہاں رسم جانثاری ہے

پھر وہی بیقراری تسکین　　وہی تسکین بے قراری ہے

مولانا صلاح الدین احمد ، شیفتہ کے دیوان میں ایک موڑ کی غزلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" دیوان شیفتہ کوئی پونے دو سو غزلوں پر مشتمل ہے ۔ ان غزلوں میں سے چند غزلیں مسلسل ہیں اور ایک دو نے قطعات طویل کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ متعدد غزلیں ویسے بھی ایک آہنگ داخلی اور ایک کیفیت طبعی رکھتی ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر جس چیز کو انگریزی میں" مود " کہتے ہیں وہ شیفتہ کی ان غزلوں میں نمایاں طور پر مسلسل موجود ہے

۱ـ تسنیم جلد اوّل ، شمارہ ۳ ، آگرہ ، مارچ ۱۹۳۱ء

اور عام غزلوں کی طرح ہر شعر کے ساتھ مختلف صورت اختیار نہیں کرتا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :۔

میں پریشان گرد اور محفل نشیں تو کب نہ تھا
ہر کہیں کس دن نہ تھا میں، ہر کہیں توکب نہ تھا

آج ہی کچھ سوز ہجران سے نہیں پروانہ وار
شیفتہ بے تاب روئے آتشیں تو کب نہ تھا" [۱]

۸۔ انفرادیت و شخصی آہنگ:

شیفتہ کے کلام کی بیشتر خصوصیات کا ذکر مع امثلہ گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے ۔ یوں تو ہر شاعر کی انفرادیت و شخصی آہنگ اس کے کلام میں کسی نہ کسی انداز میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، لیکن شیفتہ کے کلام کا سرسری مطالعہ ہی ان کی انفرادیت اور شخصی آہنگ کا پتہ دیتا ہے ۔ سید خضر برنی کو شیفتہ کے کلام میں انفرادیت ڈھونڈے کو نہیں ملتی مگر پھر بھی وہ ان کو ایک فن کار ضرور مانتے ہیں ۔ [۲]

۱۔ دیوان شیفتہ (اردو ۔ دیباچہ) ، ص ۲۶، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

۲۔ نگار، مئی ۱۹۶۰ء ، ص ۲۸

نظامی بدایونی نے شیفتہ کے کلام ریختہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کو اپنے وقت کا استاد کہا ہے۔[۱] ابوالولا محمد زکریا مائل فرماتے ہیں کہ شیفتہ نے ان بزرگوں (یعنی غالب و مومن) کی صحبت اور تلمذ سے باقاعدہ استفادہ کیا تھا اور ایک طرز خاص کے مالک تھے۔[۲] مولانا صلاح الدین احمد فرماتے ہیں کہ شیفتہ کا اسلوب سخن اپنی جگہ ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت رکھتا ہے۔[۳] اس کی امتیازی خصوصیت اس کی صفائی، شستگی اور لطافت ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ متانت اور تیکھے پن کا ایک ایسا انوکھا امتزاج اس میں پایا جاتا ہے جو نہ صرف شیفتہ کے اپنے عہد میں کوئی نظیر نہیں رکھتا تھا بلکہ اسلاف و اخلاف کے زمانے میں بھی اس کی مثال کم ہی ملے گی ۔ شیفتہ کے کلام میں غزل کی مناسبت سے حسن و عشق کی کیفیات یا عاشق و محبوب کے معاملات کا بیان تو لازما" سب سے زیادہ ملتا ہے اور رسمی و روایتی باتوں کی بھی کمی نہیں ہے ، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ایک اچھوتے انداز میں کہا۔ ان کے اشعار میں خلوص و صداقت یا ندرت و جدّت ایک خاص انفرادی رویے کو ظاہر کرتے ہیں اور جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کیے بغیر نہیں رہتے ۔ حسن و عشق کے معاملات کے علاوہ بھی شیفتہ کے کلام میں دوسرے تجربات و مشاہدات بھی بڑی کامیابی سے پیش کیے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی فرماتے ہیں :

" حسن و عشق اور خمریات کے موضوعوں کے علاوہ شیفتہ کی شاعری

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۳۲ ، مرتبہ نظامی بدایونی
۲۔ تسنیم ، جلد اول ، شمارہ ۳ ، ص ۲۶
۳۔ دیوان شیفتہ (حضرت شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۲۷[illegible] ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

مین زندگی کے دوسرے تجربات و مشاہدات کی آئینہ داری بھی ہے اور مخصوص اخلاقی اقدار کی شاعرانہ انداز مین تلقین بھی ہے ۔ شخصیات عامہ کی عکاسی بھی ہے اور عقل سلیم و فہم عامہ کے نکات کا دلکش بیان بھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھین مضامین و موضوعات مین شیفتہ کی انفرادیت زیادہ جھلکتی ہے ۔۔ شیفتہ نے اپنے رنگ مختلف رنگون کو ملا کر اور اس آمیزے مین خود اپنی شخصیت اور اپنے طرز فکر و احساس کا عنصر داخل کر کے ترتیب دیے ہین ۔ شیفتہ کے نظریۂ شاعری کو سمجھنے اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ خود اپنی شاعری کے کون سے پہلوؤن کو اہم سمجھتے ہین ذیل کے اشعار ممد و معاون ثابت ہون گے :۔

۱۔ معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سر آب مین

۲۔ وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ ، لفظ خوش ، انداز صاف ہو

۳۔ شیفتہ کیسے ہی معنی ہون مگر نا مقبول
اگر اسلوب عبارت مین متانت کم ہو

۴۔ شیفتہ سادہ بیانی نے ہمین چمکایا
ورنہ صنعت مین بہت لوگ ہین بہتر ہم سے

۵ـ   شیفتہ اور ستائش کے نہیں ہم خواہان

بس یہی ہے کہ کہیں ہے یہ زبان دھلی "[۱]

شیفتہ کے کلام میں انفرادیت اور شخصی آہنگ کی نشاندھی کے سلسلے میں انھیں کا ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے جو ان کے کلام کی خصوصیات کا نچوڑ اور ان کی انفرادیت و شخصی آہنگ کا آئینہ ہے ـ

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوان شیفتہ

ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال

لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم

ہاں ذکر خدّو خال اگر ہے تو خال خال [۲]

۹ـ غزل میں مقام:

شیفتہ اردو غزل گوئی میں صف اوّل کے شعراء میں تو شمار نہیں ہوتے، لیکن صف دوم کے شعرا میں انھیں ایک امتیازی مقام حاصل ہے ـ مولانا صلاح الدین‌احمد فرماتے ہیں:

" شیفتہ نے غزل کے سوا دیگر اصناف سخن میں مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ کسی پر توجہ نہیں دی ـ قصیدہ گوئی سے تو وہ طبعاً گریزان

۱ـ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۲۲۳

۲ـ دیوان شیفتہ ، ص ۱۲۳ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

تھے ۔ اور خداوند تعالیٰ نے انھیں اس کی ضرورت سے بھی بے نیاز کر رکھا تھا ۔ پھر شاعری کو انھوں نے فن کے طور پر حاصل نہ کیا ۔ نہ جزو زندگی بنایا اور نہ ذریعۂ فروغ سمجھا ۔ بس ایک فکر سلیم و طبع رواں مبداء فیاض سے پائی تھی، جس کے تقاضے کبھی کبھی شعر کا قالب اختیار کر لیتے تھے ۔ ورنہ اگر وہ شعرگوئی کو فن کے طور پر اختیار کرتے تو گمان غالب ہے کہ وہ ہمارے اوّل درجے کے شعراء میں بھی ایک درجۂ امتیاز حاصل کر لیتے۔[۱]،،

اسی طرح جناب سید خضر سردی بھی انھیں غزل گوئی کے میدان میں دوسری صف کے شعراء میں شمار کرتے ہیں اور ایک ممتاز مقام کا حامل قرار دیتے ہیں :

" ۔۔۔ الغرض شیفتہ ہمارے یہاں دوسری صف کے شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ ان کی غیرمعمولی شہرت کا باعث کچھ تو ان کی قوّت نقد تھی جو " گلشن بے خار،، میں پھل پھول لائی، کچھ ایک طرف غالب و مومن جیسے اساتذہ سے ان کے روابط اور دوسری طرف حالی جیسے اہم شاعر اور نثر نگار کی ان سے وابستگی اور کچھ ان کی تاریخی اہمیت ۔[۲]،،

نیاز فتحپوری ظفر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے شیفتہ کا ذکر ان الفاظ میں

۱۔ دیوان شیفتہ ، ص ۱۲۳ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

۲۔ نگار، مئی ۱۹۲۰ء ، ص ۲۷

کرتے ہیں :

" اس میں کلام نہیں کہ زبان کی صفائی ، ترکیبوں کی حلاوت ، فارسی الفاظ کی دلکش آمیزش ، بندش کی روانی ، قدیم الفاظ سے احتراز ، اس عہد کی خصوصیت رہی ہے اور شاہ نصیر نے بھی کافی حصہ اس اصلاح و تہذیب میں لیا ہے ، لیکن جہاں تک حقیقی شاعری کا تعلق ہے ، سب سے پہلے مومن ، غالب اور ذوق پر ہی نگاہ پڑے گی اور اس کے بعد ممنون ، تسکین اور شیفتہ پر۔ "[1]

اسی طرح خواجہ زکریا بھی شیفتہ کو دوسرے درجے کے شعراء میں شمار کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

" ۔۔۔ دوسرے درجے کے شاعروں میں شیفتہ ، نسیم دہلوی ، تسکین ، مضمون ، ظہیر وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ "[2]

شیفتہ کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو طرز اظہار کی صفائی ، شستگی ، برجستگی اور بے ساختگی کی وجہ سے ان کی انفرادیت اور شخصی آہنگ کی نشاندہی کرتے ہوئے زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں اور جو شاعری کی دنیا میں ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں ۔ ان کے اکثر اشعار ضرب المثل بن جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں ۔ ان میں جذبات و خیالات کی ہمہ گیری اور مذاق سلیم کی کارفرمائی کے علاوہ اسلوب بیان کی

۱۔ انتقادیات (ظفر کی شاعری) ، ص ۱۵۲ ،

۲۔ تنقیدی مقالات ، ص ۱۲۰ ، مرتبہ مرزا ادیب

ایسی سادگی اور لطافت ہے کہ سنتے ہی زبان پر چڑھ جائیں اور کسی مناسب حال موقع پر یاد آ جائیں ۔ مثلاً

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستان کے لیے

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اتنی نہ بڑھا پاکئی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

پانی وضو کو لاؤ رخ شمع زرد ہے
مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

کیا ہو سکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ
اس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

ہم آجتک چھپاتے ہیں یاروں سے راز عشق
حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں

جو بیگانہ جانے تجھے خلق کیا غم
اگر آشنا آشنا جانتا ہے

کرتے ہیں جو رو جفا ناز و ادا کہتے ہیں
یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

۱۰۔ کلیات ــ ترتیب و اشاعت :

دیوان اردو کے دیباچے میں شیفتہ فرماتے ہیں :

" یکے از قدر شناسان منت مرا سعادت ازلی در اضطراب افگند ۔

تا لخلتے بار از دوش انداخت سال نظم و ترتیب از اعداد حروف

" نظم عالم پسند " بر آورد و خود را میان عالم به پسندیدگی

و ... خجستگی نامور ساخت ۔"[1]

" نظم عالم پسند " کے " ۱۲۴۷ " اعداد بنتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

شیفتہ کا دیوان اردو ۱۲۴۷ھ (مطابق ۳۲-۱۸۳۱ء) میں مرتب ہوا۔ کلب علی خان

فائق رامپوری فرماتے ہیں کہ اس میں ۱۲۸ غزلیں تھیں اور چند مثنویاں ۔ بعد میں

(*) ۱۸۵۵ء میں ۳۶ غزلیں مزید شامل کر کے شیفتہ نے یہ دیوان مطبع آئینۂ سکندری میرٹھ

میں چھپوایا ۔[2]

مولانا صلاح الدین احمد فرماتے ہیں کہ دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۶ء میں مطبع رضوی

دہلی سے شائع ہوا۔[3] اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے احسن المطابع،

علی گڑھ سے چھپوا کر ایک جدید ایڈیشن شائع کیا اور اس میں اپنا ایک مختصر دیباچہ بھی

شامل کیا ۔ پھر ایک چوتھا ایڈیشن غالباً مطبع مجتبائی سے شائع ہوا ۔

۱۔ کلیات شیفتہ (دیباچہ از شیفتہ) ، ص ۲۷، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ ایضاً ، ص ۲۶

۳۔ دیوان شیفتہ (حضرت شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۳۲

(*) نوٹ ۔ مولانا صلاح الدین احمد (دیوان شیفتہ ، ص ۳۲) اور حبیب اشعر (دیوان شیفتہ ، ص ۲۹۲) ، ۱۸۵۵ء کی جگہ ۱۸۵۳ء اور مطبع آئینۂ سکندری کی جگہ مطبع دبدبۂ سکندری لکھتے ہیں ۔ صورت حال یہ نہیں ہے کیونکہ دیوان کے آخر میں " نثر خاتمہ " کی آخری سطور میں لکھا ہے: " صفحہ ۹۸۔ دیوان شیفتہ ، طبع اول مطبع آئینۂ سکندری میرٹھ " ۔ یہی درست ہے ۔ (مقالہ نگار)

مکتبۂ مجتبائی والے ایڈیشن کے بارے میں حبیب اشعر فرماتے ہیں :

" یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا ۔ نہ میں نے اس کا کہیں اور ذکر پڑھا ۔"[1]

مولانا صلاح الدین احمد کے مطابق اس کے بعد کوئی ۳۵ برس ہوئے نواب محمد اسحق خان کی فرمائش پر مطبع نظامی بدایونی نے ایک محشیٰ ایڈیشن شائع کیا تھا ۔ لیکن یہ بھی نایاب ہے ۔[2](*) یہ ایڈیشن " کلیات شیفتہ و حسرتی " کے نام سے ہے اور ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا ہے ۔ اس میں دیوان ریختہ ، دیوان فارسی و رقعات فارسی (لحن عراق) شامل ہیں ۔ اس کے آغاز میں پہلے تو ۹۰ (نوّے) صفحات پر مشتمل " حضرت شیفتہ کے مختصر حالات " اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے اور بعد میں ۲ (دو) صفحات پر صحت نامہ ہے ۔ اس میں ۱۶۸ غزلیں اور ۱۲ مفرد اشعار درج ہیں ۔

مولانا صلاح الدین احمد نے جون ۱۹۵۳ء میں ایک ایڈیشن نکالا ۔ اس میں ایک مبسوط مضمون بعنوان " شیفتہ کے ساتھ چند لمحے " شروع میں درج ہے ۔ اس میں ۱۶۷ غزلیں ، ۱۲ مفردات اور ایک " مرثیۂ دھلی " جو کسی سابقہ ایڈیشن میں نہیں ہے ، شامل ہیں ۔ یہ اکادمی پنجاب سے شائع ہوا ۔

۱۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۹۳ ، مرتبہ حبیب اشعر

۲۔ دیوان شیفتہ (حضرت شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۳۵ ، صلاح الدین احمد مولانا

(*) نوٹ : مجھے یہ نسخہ علامہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ذاتی کتب خانے سے عنایت فرمایا ۔ (مقالہ نگار)

اس کے بعد مجلس ترقی ادب ، لاہور نے ایک ایڈیشن (طبع اول ستمبر ۱۹۶۵ء) مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری ، شائع کیا ۔ اس میں ۱۶۹ غزلیں ، ۱۲ مفرد اشعار اور شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام (از نسخۂ دیوان شیفتہ مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری ، رامپور ، مکتوبہ ۱۲۳۷ھ ۔ مرتب) شامل ہیں ۔ آغاز میں مرتب نے ایک گراں قدر دیباچہ بھی شامل کیا ہے ۔ اسی سال یعنی ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جدید ، لاہور نے ایک ایڈیشن بعنوان " دیوان شیفتہ " ، شائع کیا ، جس کو حبیب اشعر دہلوی نے مرتب کیا ۔ اس میں ۱۷۱ غزلیں ، ۱۲ مفرد اشعار اور باقیات کے عنوان کے تحت وہ کلام جو سابقہ ایڈیشنوں میں نہیں ملتا ، شامل ہیں ۔ آخیر میں ایک تفصیلی دیباچہ بھی درج ہے جو مرتب کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی بناء پر قارئین کے لیے بہت مفید ہے ۔ اپنے دیباچے میں مرتب (حبیب اشعر) نے مندرجہ ذیل وضاحت بھی کر دی ہے ۔

" میں نے زیر نظر نسخے کی ترتیب و تصحیح میں جہاں دیوان شیفتہ کے متذکرہ ایڈیشنوں سے استفادہ کیا ہے وہاں " رسالۂ معارف " ، اعظم گڑھ (بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۳ء) سے شیفتہ کا وہ غیر مطبوعہ کلام بھی اس میں شامل کر لیا ہے جو مولوی کلب علی خان فائق رامپوری نے شیفتہ کے قلمی دیوان مملوکہ رضا لائبریری ، رام پور سے نقل کر کے اپنے مفید مقالے کے ساتھ شائع فرمایا تھا ۔[1] "

اب شیفتہ کی ایک ایسی غزل ذیل میں درج کی جا رہی ہے جو آج تک کسی ایڈیشن

۱۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۹۳ ، مرتبہ حبیب اشعر

میں شامل نہیں پائی گئی اور جو ماہنامہ عالمگیر بابت ماہ فروری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی ۔

* (حضرت شیفتہ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام مرسلہ جناب صمیم سندیلوی)

کس گل کو نہیں حسرت دیدار تمہاری — نرگس بھی گلستان میں ہے بیمار تمہاری
یاں تک تو ہوئی گرمئ گفتار تمہاری — اب ساری خدائی ہے خریدار تمہاری
ہم قبر میں اٹھ بیٹھے قیامت کے گماں سے — یاد آئی ہیں مرگ جو رفتار تمہاری
عیسیٰ نے بہت کی لب جاں بخش کی تقلید — باتیں جو سنی تھیں کہیں دوچار تمہاری
تم قتل کرو شوق سے اس کا نہیں غم ہے — خوں سے کہیں بھر جائے نہ تلوار تمہاری
سو جان سے ہے صدقے لب جان بخش پہ آکر — سن لے جو مسیحا کہیں گفتار تمہاری
جبتک رہے ہم زندہ کبھی آپ نہ آئے — مرنے پہ عنایت نہیں درکار تمہاری
تنہا ہی وہ جاتا ہے جو کوچہ میں تمہارے — کیا قہقہہ دیوار ہے دیوار تمہاری
اس حال کو چھوڑو نہ کرو تم ہمیں پامال — آفت ہے قیامت ہے یہ رفتار تمہاری
آنکھوں کی جو تعریف میں اشعار سنائے — کہنے لگے ہے طبع گفتار تمہاری

بوسے لیے میں نے جو مکرّر تو وہ بولے
بھاتی نہیں یہ شیفتہ تکرار تمہاری [1]

۱- ماہنامہ عالمگیر بابت ماہ فروری ۱۹۳۳ء ، ص ۳۹ ، مملوکہ جناب خلیل الرحمن داوڈی

(ج) فارسی شاعری (حسرتی)

۱- غالب سے مشورۂ سخن :

بیشتر تذکروں اور ادبیات کی تاریخوں میں یہی لکھا ہے کہ نواب محمد مصطفیٰ خاں اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے - نیز یہ کہ انھوں نے میدان شاعری میں مومن سے بھی مشورہ کیا اور غالب سے بھی - یہ بات تو واضح ہے کہ مومن کی وفات کے بعد یعنی ۱۲۶۸ھ (مطابق ۱۸۵۲ء) کے بعد وہ اپنا اردو اور فارسی کلام غالب ہی کو دکھاتے رہے - اس سے پہلے وہ مومن ہی کے شاگرد مشہور تھے - مومن کی شاگردی کا تو انھوں نے خود واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے ، جو گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے- حالی کے بیانات سے غالب سے شیفتہ (حسرتی) کے تلمذ کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے- وہ " یادگار غالب " میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بیان میں فرماتے ہیں :

" نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے ، اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے ، بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے- لیکن خاں موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے- "[1]

۱- یادگار غالب ، ص ۱۵۰ ، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی

ایک اور جگہ " یادگار غالب " ہی میں حالی کا بیان ہے:

" اہل دہلی و نواح دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیض صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے ان کے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے ، جیسے مہر و رخشاں، عارف ، سالک ، مجروح ، علائی ، شیفتہ وغیرہم ۔ ان کے سوا خاص اہل دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً" مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے ، لیکن درحقیقت ان کے شاگرد معنوی تھے، جیسے نواب مصطفیٰ خان مرحوم جنھوں نے مومن مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دکھایا ۔ یا جیسے سید غلام علی خان مرحوم متخلص بہ وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے ۔ مرزا نے انھی دونوں صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے ۔ ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید

مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں [1]

حالی ہی ایک اور جگہ اپنے خودنوشت حالات میں جو انھوں نے نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر ۱۹۰۱ء میں لکھے تھے بیان کرتے ہیں :

" انھوں نے (نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ و حسرتی) ابتدا میں

۱۔ یادگار غالب ، ص ۱۳۵ ، مرتبہ خلیل الرحمن داودی

اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے ۔ میرے وہاں (حسرتی کے پاس جہانگیر آباد میں) جانے سے ان کا پرادا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا ـــ اسی زمانے میں اردو فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔،،[1]

حالی کے مندرجہ بالا بیانات کے بعد یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حسرتی (شیفتہ) نے غالب سے بھی مشورۂ سخن کیا اور مومن سے بھی ۔ ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو حبیب اشعر صاحب کے اس مضمون سے ماخوذ ہے جس میں انھوں نے شیفتہ (حسرتی) کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور جس سے شیفتہ (حسرتی) کے مومن اور غالب سے تلمذ کی ضرورت کی اہمیت و نوعیت پر روشنی پڑتی ہے:

" مومن سے شیفتہ کے تعلقات دوستانہ ہی نہ تھے بلکہ برادرانہ تھے ۔ دونوں ایک دوسرے کو عزیز رکھتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے ۔ مومن عمر میں شیفتہ سے بڑے تھے ۔ زیادہ نہیں ، یہی کوئی دو چار برس ۔ علم و فضل میں بھی انیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ البتہ ذہانت و طباعی اور قدرت کلام میں مومن کو شیفتہ پر فوقیت حاصل تھی۔ غالباً اسی لیے شعر و سخن کی راہ میں شیفتہ نے مومن کو اپنا رہبر بنایا

۱۔ داستان تاریخ اردو ، ص ۲۰۹-۲۱۵ ، حامد حسن قادری

اور اگرچہ اکیس برس کی عمر میں وہ فن شاعری کے " پیر طریقت،، ہو گئے تھے، اس کے باوجود رہ نمائی سے بے نیاز نہ ہوئے ۔ بلکہ مومن کے انتقال کے بعد ، غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے ۔ یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ شیفتہ ، جن کی سخن فہمی و سخن سنجی کا اعتراف اس زمانے کے تقریباً تمام اکابر شعر و ادب نے کیا ہے اور جن کا اردو فارسی کلام ان کی کہنہ مشقی بلکہ استادی کا بیّن ثبوت ہے ، زندگی بھر مشورۂ سخن کی ضرورت محسوس کرتے رہے اور جب مومن دنیا سے اٹھ گئے تو انھوں نے غالب کی انگلی پکڑ لی ۔ لیکن اگر اس زمانے کی معاشرت اور اہل کمال کی زندگی کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت آئینہ ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اگر شعرگوئی میں مہارت حاصل ہو جانے کے بعد بھی، شیفتہ مومن کو اپنا کلام دکھاتے رہے یا اگر مومن کے انتقال کے بعد انھوں نے غالب سے رشتۂ تلمذ قائم کرنے کی ضرورت سمجھی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ سچ مچ اصلاح کے محتاج تھے، بلکہ اس سے ان کا مقصود اقلیم سخن کے ان دو تاجداروں کے کمال فن کا عملی طور پر اعتراف و اعلان تھا ۔،،[1]

---

۱ ۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ ، ص ۲۶۸) ، مرتبہ حبیب اشعر

۲- مجموعی جائزہ :

حسرتی نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق ریختہ کے ساتھ ساتھ فارسی مین بھی طبع آزمائی کی اور بڑا نام پیدا کیا بلکہ استادانہ مقام حاصل کیا۔ ان کے فارسی کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ھے کہ وہ فارسی گو اساتذۂ متقدمین مین سے عرفی ، حافظ، نظیری اور غالب سے مقابلتاً زیادہ متاثر تھے ۔ شیفتہ ، حافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ھین :

ؔ حسرتی نیز همان گفت کہ حافظ گفتی
مدعی گر نہ کند فہم سخن گوسروخشت

اسی طرح نظیری کی طرف اشارہ ھے ۔ ؔ

جز حسرتی بہ پایۂ او کس نمی رسد
در حیرتم کہ کار نظیری کجا رسید

ؔ حسرتی گر روش خواجہ نظیری داری
معنیٔ دور طلب کن سخن دور بیار

ؔ حسرتی را شیوۂ صحو است و نظیری اهل سکر
روی بنما عاقل و دیوانہ را یکرنگ ساز

ؔ گفتم اگر نظیر نظیری ترا مرنج
اے حسرتی کسے بجہان بیمثال کو

؎ گو شعر و گو سخن کہ نظیری کہ حسرتی
صحبت بہ پیر میکدہ ام خوش برآمدہ

؎ حسرتی چون غزلے خواجہ نظیری خواندہ
از من اندیشہٴ معنی و عبارت بردہ

اور غالب سے خوش اعتقادی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

؎ اے حسرتی مپرس ز غالب کہ از غزل
آن کار میکند کہ بہ افسون نہ کردہ کس

؎ اے حسرتی شنیدم در بزم نکتہ سنجان
خوشتر ز طرز غالب طرز دگر نہ باشد

؎ غالب آن رنگین نوا بلبل کہ ذوق نغمہ اش
عندلیبان گلستان را بفریاد آورد

ذیل مین نمونے کے طور پر حسرتی کی چند منتخب غزلین پیش کی جا رہی ہین جو حافظ، نظیری اور غالب کی زمینون مین کہی گئی ہین ۔ موازنہ کے لیے ان اساتذہ کی غزلین بھی نقل کر دی گئی ہین :

حسرتی :

تہدید پیرہا کرد دے شیخ شہر مارا — امروز ساغر مئے خوردیم آشکارا
از راز عشق ساقی امشب ترانہ خواند — بشری لکم و طوبیٰ یا ایہاالسکارا
در عشق نوجوانی از دین و دل گزشتیم — از ما سلام گوئید پیران پارسا را

نشگفت گر سخنور هرجا عزیز باشد   هکو نگا دارند مرغان خوش نوا را

ایقوم عشق اخفا شرط مئی و سماع است   لا تشربو جهارا* لا تسمعو دها را

در بیت حزن تا کی از خویش دور باشم   بر روی باد بکشا گیسوئے مشک سا را

امشب کم از قیامت هنگامهٔ ندیدم   فردا مگر به بینم دیدار آشنا را

بے مستی* شبانه لطف صبوح نبود   پیر مغان سحر گه این نکته گفت مارا

درد هر جز خرابات جائے دگر نیابی   آنجا که خنده آید بر پادشه گدارا

آه از تغافل او آخر ضرورت افتاد   کز راز هائے پنهان محرم کنم صبا را

خوش طرفه آتشے هست در سینه حسرتی را

یا لیتنا وجدنا من برقه شرارا

خواجه نظیری :

در پرده ره ندانند وقت سخن صبا را   من نیک می شناسم پیغام آشنا را

عیش دیار غربت چون برق در گذاراست   نتوان بقید کردن ذوق گریز پارا

وجد و سماع صوفی خالی ازین مقام ست   چینی بسیار ماند آن آهوی ختا را

از خورده ای که دارد گل در قبا نگنجد   جای که هست ذوقی می گردد آشکارا

با فقر و تنگ دستی شوم ست عجب و مستی   در کشور غیوران نخوت کشد گدا را

بر قدر قابلیت دادند هرچه دادند   حق راست بر تو حجت تهمت منه قضا را

از مرغزار عقبیٰ با سبزه زار دنیا   تا دانم از کجائی مرضی بزن خدارا

انصاف و مهربانی عهد از جهان برانداخت   شد راستی خوش آمد شد دوستی مدا را

باشاه عشق بازان آخر کسی بگوید
بی آب و دانه کشتی مرغان خوشنوارا

از کاهش محبّان بر قدر خود فزاید
باین خسیس مردم یاری مگیر یارا

خوش فطرتی نظیری حل دقیق خود کن
حاصل بکام مردم بانگشت آسیـــارا

حسرتی :

صبا پیام رسان آن نگار رعنا را
که بهر تست اقامت درین جهان مارا

بروز حشر ندانم چه عذر خواهد گفت
کسی که دوست ندارد جمال زیبا را

رسم بکوی تو اما بساعتی که دهند
بشاخسار چمن آشیان عنقا را

مجوز مدعیان از عتاب ترک هوا
که آتشی بهزد خامشی تمنّا را

بجز امید که ایمان عشق کیشان ست
کسی نداد تسلّی دل زلیخا را

بگوش رغبت از خود گزشته راهی هست
چه ترهات ندیدیم و چه پند دانا را

هلاک معجزهٔ شیوهٔ جمال تو ام
که هم مزاج نمود است پیر و برنا را

ز خاک کوتیو انجم بسر آورد دانم
فلک که گل به چمن داد و لاله صحرا را

مرید پیر مغان شو که از اطاعت او
گریز هست جوانان باده پیما را

رواست منع من از ناله ارشوان بستن
بحکم شاه زبان عندلیب شیدا را

عجب ز نرگس مخمور اوست خود داری
حجاب و شرم کجا ست بیمحابا را

هزار شیوهٔ تلخ مرا فرو بردی
بگو بگو ز که آموختی مدارا را

معانی از در و دیوار حسرتی میر یخت
دمی که خامه گرفتم بدست انشا را

خواجه نظیری :

زبان پیام هوس داشت بستم اشیا را
درون سینه بر بهدم سر تمنّا را

چگونه عرض تمنّا کنم که حسن غیور
نداده راه درین پرده رمز و ایما را

دران نظاره که بر تیغ و کف شعور نبود
ز رشک سوختنه بود آگهی زلیخا را

ذخیره ی ز جنون بهار تنها دهیم
کم است سود تنک مایگان سودا را

گر از ورع بگدا زاهدان قدم ننهند
چه مانع است حریفان بادة پیمارا

گذشت شوق ز اندازه گوشهٔ نظیری
که می خموش کند مست بی محابا را

بکینه ی دل بی رحم کافرت نازم
که کرده است بمن دوست گبر و ترسارا

بدیهه سنج نظیری اگر تو خواهی بود
شکر فروش کندی طوطی شکر خارا

حسرتی :

بران سرم که زهر ننگ و پند کناره کنم
خورم شراب و رخ نیکوان نظاره کنم

برائی حیله برم نام فصل گل ورنه
به دی ز بادهٔ گلرنگ کی کناره کنم

بت هوائی مرا شیخ صومعه شکست
بها که خدمت رند شراب خواره کنم

بچنگ و ربط و نی می خورم و رقص کنی
اگر سرائر مکتومه آشکاره کنم

رسیده کار فغان شبم بآن غایت
که رخنه ها بدل غیر و سنگ خاره کنم

فتد بخاک و شود خاک و گل ازان روید
نگه ز رویتو گر جانب ستاره کنم

جلای آئینهٔ خود کنم مگر باشد
که عکس پردگیان فلک نظاره کنم

بغیر بادہ نبود است چارۂ غم ہیچ   شراب اگر بگذارم دگرچہ چارہ کنم

اخیر مصرعہ این بیت حسرتی برخواند

(*)
بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم

(*) نوٹ :۔ "آخیر مصرعہ این بیت اینست "بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم" بحوالہ دیوان و رقعات فارسی (حسرتی) مطبوعہ ۱۸۸۷ء ص ۲۹۔ یہ تصحیح لنسخۂ ۱۹۱۵ء میں نہیں ہے۔ (مقالہ نگار) ۔

حافظ :

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم   بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم

سخن درست بگویم نمی توانم دید   کہ می خورند حریفان من نظارہ کنم

چو غنچہ با لب خندان بیاد مجلس شاہ   پیالہ گیرم و از شوق جامہ پارہ کنم

بدور لالہ دماغ مرا علاج کنید   گر از میانۂ بزم طرب کنارہ کنم

زروی دوست مرا چون گل مراد شگفت   حوالۂ سر دشمن بسنگ خارہ کنم

گدای میکدہ ام لیک وقت مستی بین   کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم

مرا کہ نیست رہ و رسم لقمہ پرہیزی   چرا ملامت رند شراب خوارہ کنم

بتخت گل بنشانم بتی چو سلطانی   بہ سنبل دسمنش ساز طوق و یارہ کنم

زبادہ خوردن پنہان ملول شد حافظ

ببانگ بر بط و نی رازش آشکارہ کنم

حسرتی :

حذر ز انجمن عشرتش ازین دارم   نگاہ شوقم و رازی در آستین دارم

زرخ نقاب کشا خود کشادہ میگردد   ہزار عقدۂ مشکل کہ بر جبین دارم

چو عندلیب نہادم سرشتہ اند بدرد   کہ ہم ببزم طرب نالۂ حزین دارم

تو کرده وعده فراموش و من ز ساده دلی　　بروز وعده بیاران و یاد کین دارم

خبر ز ردّ و قبولش بدل رسد نه بچشم　　عبث نگه بفلک روی بر زمین دارم

صف نعال گزیدم باین همه اکرام　　دل مآل نگر چشم دور بین دارم

ز غنچه پرس که بستن پئے کشاده بود　　دلم شگفته سازی چراغ مین دارم

جواب طعنهٔ حرمان و طنز ناکامی　　همین بس است که معشوق نازنین دارم

سزد طیور چمن را اگر بیاموزی

که حسرتی سخن شورش آفرین دارم

غالب:

ز من حذر نه کنی گر لباس دین دارم　　نهفته کافرم و بت در آستین دارم

زمرّدین نبود خاتم گدا دریاب　　که خود چه زهر بود کان نه نگین دارم

اگر به طالع من سوخت خرمنم چه عجب　　عجب ز قسمت یک شهر خوشه چین دارم

نشسته ام بگدائی بشاهراه و هنوز　　هزار دزد بهر گوشه در کمین دارم

ز وعده دوزخیان را فزون نیازارند　　توقعی عجب از آه آتشین دارم

ترا نه گفتم اگر جان و عمر معذورم　　که من وفای تو باخویشتن یقین دارم

بمطلعم بود آهنگ زله بخدی مدح　　ز قحط ذوق غزل خویش را برین دارم

طلوع قافیه در مطلع از جبین دارم　　بذکر سجده ای شه حرف دلنشین دارم

علی عالی اعلیٰ که در طواف درش　　خرام بر فلک و پای بر زمین دارم

ازانچه بر لب او رفته در شفاعت من　　ضمانهٔ بلب جوی انگبین دارم

بدشمنان ز خلاف و بدوستان ز حسد   بحکم مهر تو با روزگار کین دارم

بگوشر از تو کرا ظرف بیش قسمت بیش   بیادہ خوی کنم عقل دوربین دارم

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب

خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

سید خضر بردی ، شیفتہ کی فارسی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں :

" دیوان حسرتی کا آغاز دیوان حافظ کی پہلی غزل کی زمین سے ہوتا ہے - یہ تتبع صرف زمینوں ہی میں نہیں ہے ، حسرتی میں حافظ کا رنگ بہت گہرا ہے - مزاجوں کی مواصت اس اشتراک کا مخزن ہے - شیفتہ (حسرتی) کی شخصیت میں بھی تصوّف و مئے پرستی کا وہ امتزاج ملتا ہے جو حافظ کا سرمایۂ امتیاز اور ان کی شاعری کا سرچشمہ ہے - ان کے دیوان میں " لسان الغیب" کی آواز سنائی دیتی ہے - وہی زور وہی جوش وہی اسلوب:

ـــہ جزای آنکہ شب ہجر خون دل کردم

بیا بساغر مہتاب ، آفتاب انداز

ـــہ هرچند ز خود بی خبراند و لیکن

بااهل خرابات زهر جا خبری هست

ـــہ مرید پیر مغانم کہ پادشاہ و گدا

مراد خویش ازین آستانہ می خواهند

" مرید پیر مغان " ، " خوش آن زمان کہ " کی قسم کے فقرے بھی خواجہ حافظ کی بازگشت ہیں ۔ معاملہ بندی میں وہی متاخرین کا انداز ہے ۔ البتہ فارسی غزلوں میں معاملہ بندی کا رنگ نسبتاً ہلکا اور خمریات کے نقوش گہرے ہیں ۔ ؎

با حسرتی شیفتہ ارباب خرابات
گفتند کہ عشقے است بدیوان تو مارا "[1]

حسرتی کے دیوان کا ہر صفحہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو فارسی زبان پر غیرمعمولی قدرت حاصل تھی اور فن شاعری کے اعتبار سے بھی وہ کسی استاد سے کم نہ تھے ۔ انھیں زبان پر وہی قدرت حاصل ہے جو کسی فارسی اہل زبان کو ہو سکتی تھی ۔ وہ بڑے اعتماد اور بے تکلفی کے ساتھ فارسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی ایرانی عالم اظہارخیال کر سکتا ہے ۔ ان کے کلام کی ایرانیت ملاحظہ کیجیے : ؎

نہ چو عشق سازگارم بہ مزاج دردمندان
نہ چو حسن اعتبارم بہ نگاہ خودپسندان
برخ چو آفتابت نگہ قمر عذاران
بکند عبربیت سر عنبرین کمندان

۱۔ نگار ، مئی ۱۹۶۰ء ، ص ۲۷

شب وصل غیر رفتم پیٔ اکتساب نفرت
چو ہجوم عیش دیدم شدہ شوق من دوچندان
زچہ حسرتی ننالم ز جفائے طالع بد
بمذاق یاد تلخم چو فغان دردمندان

غزل حسرتی

اگر عشق است بیباکانہ میرقص — بشوق کعبہ در بتخانہ میرقص
بسے بر دانش خود و جند کردی — یکسے بیہودہ ای فرزانہ میرقص
بصجد رقص شایان نیست صوفی — بیا در گلشن و میخانہ میرقص
سعندر نیستی تمکین میاور — بہزم دوست چون پروانہ میرقص
بہنگام ترنم وجد می کن — بگاہ رقص باجانانہ میرقص
بمستی نیز خودداری ضرور است — بمحفل نیست گر بیگانہ میرقص
نہ با ہر لب برنگ بادہ میجوش — نہ در ہر بزم چون پیمانہ میرقص

ز عشق حسرتی چون ذکر رانند
تو از شادی براین افسانہ میرقص

نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ حسرتی نے فارسی قصائد بھی لکھے ہیں اور اس رنگ کے جن پر عرفی کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ اور فارسی رقعات میں تو بالکل غالب نظر آتے ہیں اور ایسے ایسے پاکیزہ اشعار صرف کیے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حسرتی کے ذوق سخن پر ایمان لے آنا پڑتا ہے ۔

۱۔ انتقادیات ، ص ۲۷۳

حبیب اشعر، حسرتی کی فارسی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے قصائد میں عرفی اور غزلوں میں نظیری کی پیروی کی ہے۔[1] مولانا حالی مرحوم فرماتے تھے کہ اواخر عمر میں نواب صاحب (حسرتی) کو فکر سخن کا اشتیاق ہوتا تو خواجہ حافظ کی روش پر کہتے تھے ۔ بالفاظ دیگر زندگی کے آخری حصے میں تغزل پر تصوف غالب آ گیا تھا۔ شیفتہ (حسرتی) کے فارسی کلام میں سلاست و روانی، متانت و سنجیدگی اور لطافت شیرینی پائی جاتی ہے ۔ معنی کی دلکشی اور اسلوب بیان کی تازگی اس پر مستزاد ہے ۔ حسرتی کے دیوان فارسی میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان کو یک نظر دیکھنا ہو تو حسرتی کے اپنے ایک مقطع کی جامعیت ملاحظہ فرمائیے:[2]

ع دیوان تو حسرتی بیاضی ست
از منتخب انتخاب تا کے

۳۔ غزل میں مقام:

فارسی غزل گوئی میں حسرتی کا مقام غالب و مومن کے بعد سب سے بلند نظر آتا ہے ۔ غالب و مومن کے تلامذہ میں بھی فارسی گو شعراء موجود تھے لیکن جو امتیاز

۱۔ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۸۹ ، مرتبہ حبیب اشعر

۲۔ دیوان حسرتی ، ص ۱۱۲ ، حسرتی (شیفتہ)

اپنے زمانے میں حسرتی (شیفتہ) کو غزل گوئی میں حاصل رہا کسی اور کو نصیب نہ ہوا ۔ وہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ فن شاعری میں بھی دستگاہ رکھتے تھے ۔ حسرتی کے متعلق مومن کی درج ذیل رباعی ان کی شاعرانہ عظمت کو ظاہر کرتی ہے :۔

آن شیفتہ کنز سخن گرامی باشد　　سرخیل سخنوران نامی باشد

اکنون کہ جسد نماند الا بعدم　　محمود ثنائی و نظامی باشد [1]

اسی طرح ایک اور جگہ مومن ، حسرتی کے بارے میں کہتے ہیں :۔

ز تحسین او حسن معنی نیاز　　هزار آفرین بر چنین امتیاز [2]

مرزا غالب ، حسرتی کو ایک غزل کی داد دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

" سخن سرودن حق شما است ، اگر آبروئے ستودن داشتہ باشم

بسرخود ناز می توانم کرد ، زیادہ زیادہ ۔ [3] "

ایک اور غزل کے بارے میں غالب ہی کا بیان :

" بمشاهدۂ غزلے کہ امروز بمن رسید ، هم از دل رفت دهم از

نظر افتاد ، زهے غزل و خو شا غزل اگرچہ نارسا بیان و کج

مج زبانم ۔ [4] "

۱۔ گلشن بے خار ، ص ۲۶۱ (از شیفتہ و حسرتی) مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ ایضاً ، ص ۲۶۳

۳۔ تحقیق ، جلد اول ، شمارہ ۳ ، ص ۳۲ (نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ دهلوی ۔ از ابوالولا محمد زکریا مائل) ۔

۴۔ ایضاً ، ص ۳۳

مولانا حالی " یادگار غالب "، مین رقم طراز ہین :

" اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین مین کسی کی فارسی غزل ان کی (حسرتی و شیفتہ) غزل سے لگا نہین کھاتی ۔ اور شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت مین پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت کم دیکھنے مین آیا ہے ۔[۱] "

ابو الولا محمد زکریا مائل ایک جگہ فرماتے ہین :

" شیفتہ (حسرتی) کا اردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلے مین بالکل وہی حیثیت رکھتا ہے جو غالب کی اردو شاعری کی ان کسی فارسی شاعری کے مقابلے مین ۔ بلکہ بعض خوش اعتقادون کی رائےمین شیفتہ (حسرتی) کی فارسی شاعری غالب کی فارسی شاعری سے زیادہ ممتاز ہے ۔[۲] "

۳۔ کلیات ۔ ترتیب و اشاعت :

کلیات کی ترتیب و اشاعت کے بارے مین کلب علی خان فائق رامپوری، حبیب اشعر، اور محمد ایوب قادری بالترتیب اس طرح رقم طراز ہین :

۱۔ " دیوان فارسی اور رقعات فارسی جو کلیات شیفتہ و حسرتی مین شامل ہین، نظامی پریس بدایون مین ۱۹۱۶ء مین شائع ہوئے ۔[۳] "

۱۔ یادگار غالب، ص ۱۵۰ (از الطاف حسین حالی خواجہ) مرتبہ خلیل الرحمن داودی
۲۔ تسنیم، جلد اول، شمارہ ۳، ص ۳۵
۳۔ کلیات شیفتہ، ص ۲۶، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲- " شیفتہ کا فارسی دیوان، سات قصیدوں ، متعدد نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً پہلی اور آخری بار نظامی پریس بدایوں میں چھپا ہے۔"[1]

۳- دیوان و رقعات فارسی: اس میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا فارسی کلام اور رقعات شامل ہیں --- یہ کتاب ان کے فرزند محمد علی خان نے (ف ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء) نے ۱۸۸۷ء میں نیول پریس لاہور سے شائع کرائی۔"[2]

مندرجہ بالا بیانات میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کمی رہ گئی ہے - اصل صورت ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱- حسرتی (شیفتہ) کا دیوان فارسی، جہاںتک اب تک ہمیں معلوم ہو سکا، صرف دوبار شائع ہوا ہے - پہلی بار ۱۸۸۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۱۶ء میں - پہلی بار دیوان فارسی اور رقعات فارسی اکٹھے بعنوان " دیوان و رقعات فارسی جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی متخلص بہ حسرتی در پارسی و شیفتہ در ریختہ رحمت اللہ علیہ حسب فرمائش خلف الصدق حضرت مصنف جناب نواب محمد علی خان بہادر، رئیس جہانگیرآباد ،ضلع بلند شہر دام ظلّہم

۱- دیوان شیفتہ ،ص ۲۸۹، دیباچہ از مرتب: حبیب اشعر

۲- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ،ص ۳۹۰، محمد ایوب قادری

١٨٨٧ء میں در مطبع نیو امپیریل پریس، لاہور ---[1]

٢- دوسری بار حسرتی کا دیوان، رقعات فارسی و کلیات اردو کے ساتھ ١٩١٦ء نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا- سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

" دیوان فارسی جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خان صاحب دہلوی متخلص بہ حسرتی در پارسی و شیفتہ در ریختہ رحمت اللہ علیہ حسب فرمائش خلف الصدق حضرت مصنف جناب نواب حاجی محمد اسحق خان صاحب ، رئیس جہانگیرآباد، ضلع بلند شہر دام ظلّہم ١٩١٥ء مطبوعہ نظامی پریس بدایوں-"[2]

(نوٹ: ١٨٨٧ء میں شائع ہونے والے دیوان فارسی پر مطبع کا نام " نیو امپیریل پریس لاہور ہے جبکہ محمد ایوب قادری نے " نیول پریس لاہور" لکھ دیا ہے جو سراسر سہو ہے - (مقالہ نگار)

نظامی پریس بدایوں میں شائع ہونے والے دیوان فارسی پر سن طباعت ١٩١٥ء درج ہے ، لیکن مکمل جلد جس میں دیوان فارسی، رقعات فارسی اور دیوان اردو شامل ہیں، سن طباعت ١٩١٦ء درج ہے -) (مقالہ نگار)

١- دیوان و رقعات فارسی " سر ورق" - حسرتی ، مطبوعہ ١٨٨٧ء

٢- دیوان فارسی " سر ورق" ، از حسرتی مطبوعہ ١٩١٥ء (مشمولہ کلیات فارسی مطبوعہ ١٩١٦ء) ، نظامی پریس بدایوں -

دونوں ایڈیشنوں کی ترتیب ایک ہی طرح کی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے :

۱- غزلیات --- ۱۷۵

۲- متفرقات --- ۳

۳- مقطعات --- ۲

۴- رباعیات --- ۱۸

(نوٹ: دونوں ایڈیشنوں میں ایک رباعی ایسی ہے جس کا صرف ایک ہی شعر درج ہے - دیوان مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں اس بات کی صراحت حاشیہ میں کر دی گئی ہے کہ اصل نسخہ میں اس رباعی کا صرف ایک ہی شعر تھا وہ بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے - وہ شعر یہ ہے - یہ

زین گونہ سیہ گلیمم و روسیہم

کابلیس کند عار زیاد گنہم)

۷- قصائد --- ۷

۸- در منقبت مرتضوی --- ۱

کتاب کے اختتام پر ایک تقریظ ہے جو کئی صفحات پر مشتمل ہے اور جس کے آغاز میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے :

" تقریظے کہ خاکسار الطاف حسین حالی در زمان حیات مصنف مغفور برین دیوان بلاغت عنوان در سال ہزار و ہشتصد و دو مسیحی نوشتہ بود -،، (ممکن ہے سن تحریر" ہزار و ہشتصد و شصت و دو مسیحی (۱۸۶۲ء) ہو - (مقالہ نگار)

تقریظ سے صحیح سن تحریر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان فارسی حسرتی کی حیات میں مرتب ہو چکا تھا اور حالی نے تقریظ بھی اسی دوران میں لکھ دی تھی ۔ حالی، حسرتی کی مصاحبت میں ۱۸۶۱ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک (تادم حیات حسرتی) رہے، اسی بناء پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دیوان فارسی ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیانی عرصے میں مرتب ہو گیا تھا، اور یہ کہ دیوان حسرتی کی زندگی میں طبع نہ ہو سکا۔ (مقالہ نگار) ۔

چوتھا باب

شیفتہ کی نثر نگاری

(الف) گلشن بے خار (فارسی)

۱- زبان، اسلوب ، ترتیب و اشاعت:

گلشن بے خار مروّجہ فارسی زبان میں لکھا گیا ھے - اسلوب تحریر سادہ، عام فہم، دلکش و دل آویز ھے - محض عبارت آرائی سے کام نہیں لیا گیا - عبارت کو اکثر بلاوجہ طول نہیں دیا گیا - شیفتہ نے اپنی رائے کا اظہار حقیقت پسندانہ انداز میں اختصار کے ساتھ کیا ھے - بیشتر شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب بھی مختصر ھے -

گلشن بے خار کی تاریخ تصنیف کے سلسلے میں شیفتہ نے دیباچے میں خود ھی بیان کر دیا ھے:

" ابتدائے این کارنامہ در ابتدائے سال ھزار و دو صد و چہل و ھشت از ھجرت بودہ و انتہا در انتہائے ھزار و دو صد و پنجاہ،،[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس اہم کام کی ابتدا ۱۲۴۸ھ (م ۱۸۳۲ء) میں ہوئی اور انتہا ۱۲۵۰ھ (م ۱۸۳۴ء) میں[*] - جب شیفتہ نے یہ تذکرہ مکمل کیا تو ان کی عمر چھبیس

۱- گلشن بے خار (دیباچہ ، ص ۹) ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

(*) نوٹ: مالک رام " ذکر غالب،، میں فرماتے ھیں کہ ۱۸۳۵ء میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے اپنا مشہور تذکرہ " گلشن بے خار،، شائع کیا - (یہ بیان درست نہیں ھے - مقالہ نگار)

سال کی تھی ۔ چنانچہ اس بات کی بھی وضاحت دیباچے ہی میں ملتی ہے:

" امروز اشہب تیزگام عمر رواں بست و شش مرحلے طے کرد و از برائے فوز منزل مقصود سرگرم تگ و پو است ۔"[1]

گلشن بے خار میں شعراء کے نام حروف تہجی کی ترتیب میں دیئے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بیان کے مطابق:

"١۔ پہلی بار یہ تذکرہ تالیف کے تین سال بعد ١٢٥٣ھ (١٨٣٧ء) میں مطبع دہلی اردو اخبار مولوی محمد باقر کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے ۔

٢۔ ١٢٥٩ھ (١٨٤٣ء) میں اس کا دوسرا ایڈیشن پنڈت موتی لال کے زیر اہتمام اسی مطبع سے شائع ہوا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اردو سیکشن اور رضا اکیڈمی رامپور میں موجود ہے ۔

٣۔ بعدازاں نولکشور پریس لکھنؤ سے رمضان ١٢٩٣ھ (اکتوبر ١٨٧٤ء) میں گلشن بے خار کا ایک ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں ٢٧٢ صفحات ہیں ۔ اصل تذکرہ ، ٢٤٤ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے ۔ آخری ٢٨ صفحات میں قطعات تاریخ تصنیف اور تقریظیں درج ہیں ۔ یہی عام طور پر کتب خانوں میں ملتا ہے ۔

١۔ گلشن بے خار (دیباچہ ، ص ٩) ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۳- ۱۹۶۲ء میں اس کا اردو ترجمہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سے شائع ہوا ہے - یہ ترجمہ محمد احسان الحق فاروقی نے کیا ہے اور اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا گیا ہے - ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے پیش لفظ کو ملا کر اس میں ۵۳۶ صفحات ہیں اور یہ ہر جگہ دستیاب ہے-[1]"

اس کے بعد بھی گلشن بے خار کا ایک اردو ترجمہ اور ایک فارسی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں - تفصیلات ذیل میں درج ہیں :

۱- دسمبر ۱۹۶۳ء میں گلشن بے خار کا اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا- ابتدائی ۱۶ صفحات دیباچہ اور فہرست عنوانات پر مشتمل ہیں - پھر صفحہ ایک سے لے کر صفحہ ۳۳۹ تک اردو ترجمہ اور انتخاب کلام پھیلا ہوا ہے - اس نسخے میں تقاریظ اور تاریخ ہائے تصانیف شامل نہیں ہیں - ترجمہ آسان اور سلیس ہے -

۲- اکتوبر ۱۹۷۳ء میں گلشن بے خار کا فارسی متن، مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا- کلب علی خان فائق رامپوری اس کے مرتب ہیں - ابتدائی ۲۰ صفحات فہرست عنوانات کی نذر کیے گئے ہیں - صفحات ۲۱ تا ۵۸ پر فاضل مرتب کا نہایت ہی مفید مقدمہ محیط ہے -

---

۱- اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص ۲۹۱

صفحات ۱ تا ۹ شیفتہ کا دیباچہ ہے ۔ پھر صفحات ۱۰ تا ۲۵۴ پر ۶۷۰ شعراء کے کلام پر تبصرہ اور ان کا منتخب کلام درج ہے ۔ اس کے بعد قطعات تاریخ تصنیف اور تقاریظ ہیں ۔ تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ قطعات تاریخ (تین) از مومن خان مومن

۲۔ قطعات تاریخ (دو) از شیخ غلام علی صابر

۳۔ قطعہ تاریخ (ایک) از نواب فخرالدین محمد خان خرد

۴۔ تقریظ از مومن خان مومن

۵۔ ایضاً از مولانا محمد صدرالدین خان آزردہ

۶۔ ایضاً از مرزا اسداللہ خان غالب

۷۔ عبارت از مولوی امام بخش صہبائی

۸۔ عبارت از عبداللہ خان علوی

شیفتہ کے اپنے بیان کے مطابق (جو گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے) انھوں نے گلشن بے خار ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں شروع کرکے ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں مکمل کر لیا تھا ، لیکن غالب کے مطابق ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵-۳۶ء) سال تکمیل بنتا ہے ۔ غالب کی تقریظ کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ مندرج ہے جس سے گلشن بے خار کا سال تکمیل ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵-۳۶ء) نکلتا ہے ۔ غالب کا قطعۂ تاریخ ذیل میں درج ہے :

غالب این رنگین کتاب گلشن بے خار نام — روکش جنّات تجری تحتها الانہار ہست

گر کسے لب تشنۂ تاریخ اتمامش بود — جوئے ہائے آب ہم در گلشن بےخار ہست ۱

+۳۸ — ۱۲۱۳=۱۲۵۱ھ

" یادگار غالب،، میں حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے گلشن بے خار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے ۔ اس کو دیکھ کر مرزا نے نواب صاحب کو خط لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول مسودے میں مفتی صدرالدین خان مرحوم متخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ ۲ مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو نواب صاحب نے ان کا ذکر بھی درج کر دیا۔ غالب کے خط سے اقتباس:

" --- بارے گہر نہ سفتی خامہ و گوہرین نگشتن نامہ در ردیف الف بنگارش اشعار پروین نثار حضرت آزردہ از چہ روست ۔ ہرچند ذکر خدام برجیس مقام در جریدۂ این فن نہ سزاوار شانِ فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضای فرط محبت جراتے بکار می رفت گناہے نہ بود و در تلافیٔ آن بہ پوزش نیاز نمی افتاد ---،، ۳

سید وزیرالحسن عابدی اس خط کا سال تحریر ۱۸۳۵ء بتاتے ہیں ۔ ۴ اسی طرح " پنج آہنگ،، میں غالب کا ایک اور خط ملتا ہے جو شیفتہ کے نام ہے اور جس میں

۱۔ گلشن بے خار (از شیفتہ) ، ص ۲۷۶، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ یادگار غالب (حالی) ، ص ۵۳۱، مرتبہ خلیل الرحمن داودی

۳۔ پنج آہنگ (غالب) ، ص ۲۲۸ ، مرتبہ وزیرالحسن عابدی سید

۴۔ ایضاً ، ص ۲۳۶

مرزا احمد بیگ تپاں کا ذکر بھی گلشن بے خار میں شامل کیے جانے کی سفارش کی گئی ہے۔ تپاں کا ذکر گلشن بے خار میں نہیں ملتا ، لیکن سید وزیرالحسن عابدی کے مطابق یہ خط بھی ۱۸۳۵ء ہی کا لکھا ہوا ہے ۔ خط کی عبارت یہ ہے :

"۔۔۔ اگر التفات طازمان اوراق اشعار مرحومی مرزا بیگ احمد خان که از من بہ سرور رسیدہ است ، از نواب مصطفیٰ خان یا نواب احمد خان ، گرامی فرزندان آن سخن گستر بکف آید و نام احمدبیگ خان درین فرویدہ جریدہ ثابت گردد ، منت بر من خواهد بود ، والسلام ۔" [1]

ذیل میں سید وزیرالحسن عابدی کا ایک اقتباس " باغ دودر" سے پیش کیا جا رہا ہے جس سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی کہ گلشن بے خار مکمل تو ۱۸۳۴ء میں ؟ ہوا ، لیکن بعد میں شیفتہ نے اس میں کچھ اضافے کئے اور اسی لیے غالب نے اپنی تقریظ کے قطعہ میں سال تکمیل ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵-۳۶ء) نکالا ہے ۔ اقتباس:

" گلشن بے خار کی تصنیف کا آغاز ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲-۳۳ء میں ہوا تھا اور تکمیل ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵-۳۶ء میں ۔ غالب کی زندگی میں یہ تذکرہ پہلی مرتبہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷-۳۸ء میں اور دوسری بار ۱۸۴۳ء میں چھپا تھا ۔ تیسری طباعت جو رمضان مبارک ۱۲۹۱ھ

۱۔ پنج آہنگ (غالب) ، ص ۲۳۶ ، مرتبہ وزیرالحسن عابدی سید

مطابق اکتوبر ۱۸۷۳ء مین هوئی ۔ یه قطعه (غالب کی تقریظ کے آخر مین به سلسله گلشن بے خار از شیفته) غالب کی تقریظ کے آخر مین صفحه ۲۵۹ پر درج هے (گلشن بے خار طبع سوم ، مطبع نولکشور، لکھنو) ۔ گلشن بے خار کے اعداد " ۱۲۱۳ " مین " جوبهائی آب " کے اعداد " ۳۸ " تعمیر هے جس سے سال ۱۲۵۱ھ مطابق ۳۶-۱۸۳۵ء حاصل هوتا هے ۔ نظامی بدایونی نے کلیات شیفته و حسرتی (نظامی پریس بدایون ۱۹۱۶ء) کے دیباچے مین سال تکمیل ۱۲۵۰ھ درج کیا هے جو خود شیفته کے بیان کے مطابق هے ۔ شیفته نے کتاب کے دیباچے مین کہا هے " ابتدای این کارنامه در ابتدای سال هزار و دو صد و چهل و هشت بوده و انتهای ان در سال هزار و دو صد و پنجاه ۔ " اس کے علاوه دوسرے شعراء کے قطعات تاریخ بھی طبع اوّل کے آخر مین درج هین جن مین اس تصنیف کی تکمیل کا سال ۱۲۵۰ھ ظاهر کیا گیا هے ۔ ان قطعات مین حکیم مومن کا قطعه بهی هے ۔ لیکن دوسری طرف همین غالب کا قطعه تاریخ خود " انتخاب شیفته " مین ملتا هے جس کا مخطوطه لٹن لائبریری علی گڑھ مین محفوظ هے ۔ اس تباین کا حل یه هے که تذکره ۱۲۵۰ھ مین مکمل هو چکا تھا اور شعراء نے تاریخین بهی کہه کر دے دی تهین لیکن ۱۲۵۱ھ مین شیفته نے تذکرے مین کچھ اضافه کیا جس کی بناء پر غالب نے ۱۲۵۱ھ کو سال تکمیل قرار دے کر قطعه تاریخ

کہا۔ ہمارے اس خیال کی تائید غالب کے ایک فارسی خط سے ہوتی ہے جس کے مکتوب الیہ شیفتہ ہیں ۔ یہ خط " پنج آہنگ" طبع اول میں شامل ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ نے تذکرے کا مسودہ مکمل کر کے تقریظ کی فرمائش کے ساتھ غالب کو بھیجا تھا۔ غالب نے مسودہ واپس کر کے احمد بیگ تپاں کا ذکر تذکرے میں اضافہ کرنے کی درخواست کی تھی ۔ اس وقت تپاں کے انتقال کو جو جناب قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق (مآثر غالب ص ۵۲) کے مطابق ۱۵/ مارچ ۱۸۳۲ء سے چند دن پہلے ہوا تھا، چار سال گزر چکے تھے ، یعنی اب سال ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵-۳۶ء تھا۔ اگرچہ تپاں کا ذکر تذکرے میں نہیں بڑھایا گیا لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس سال کچھ اور اضافہ ضرور ہوا ہوگا یا پھر اپنی تقریظ کے اضافے کی بناء پر غالب نے ۱۲۵۱ھ کو سال تکمیل قرار دیا۔"[1]

ذیل میں ایک اور اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس سے اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ گلشن بے خار کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں :

" گلشن بے خار کے قلمی نسخے بھی پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ ایک قلمی نسخہ جس کی کتابت ۲ شوال ۱۲۵۳ھ میں ہوئی ہے، پنجاب پبلک لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے ۔ فہرست مخطوطات میں

۱۔ باغ دودر (غالب) ، ص ۱۲۵ ، مرتبہ وزیرالحسن عابدی

وضاحت کی گئی ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے مطالعہ میں رہا ہے اور اس کا اصلاح شدہ ہے ۔ مولانا عرشی نے بھی مقدمہ دستور الفصاحت میں ایک قلمی نسخے کی خبر دی ہے لیکن یہ مطبوعہ نسخے کی نقل ہے ۔[1]"

۲۔ اردو شعراء کے قدیم اور معاصر فارسی تذکرے:

مجید یزدانی اردو شعراء کے تذکروں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو میں تذکرہ نگاری کی ابتدا اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوئی ۔ اور تذکرے سے مراد وہ کتاب لی جانے لگی جس میں مختلف شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام درج ہو ۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ فارسی اور اردو دونوں میں ہر وہ کتاب جو شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہو تذکرہ ہی کہلاتی ہے ۔ چاہے یہ لفظ اس کے نام میں شامل ہو یا نہ ہو ۔ چنانچہ فارسی کے پہلے تذکرے (مرقومہ ۱۲۲۱ء / ۶۱۸ھ) کا نام " لباب الالباب " ہے ، البتہ اس سے پورے تین سو برس بعد دولت شاہ سمرقندی نے جو کتاب اس موضوع پر لکھی اس کا نام " تذکرۃ الشعراء " رکھا ۔ لیکن بعد میں پھر پورے دو سو برس تک یہ لفظ کسی ایسی تصنیف کے نام میں شامل

۱۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ، ص ۲۹۱ ، فرمان فتح پوری ڈاکٹر
۲۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند ساتویں جلد ، ص ۳۹۷ - ۳۹۸ ،
(تذکرے از مجید یزدانی)

نہیں آتا ، حالانکہ اس دوران میں جو تذکرے لکھے گئے ان کی تعداد بیس بائیس تک پہنچتی ہے ۔ اردو کے دستیاب تذکروں میں بھی پہلے آٹھ تذکرے ایسے ہیں جن کے ناموں میں لفظ تذکرہ شامل نہیں ہے ۔ پہلی بار یہ لفظ میر حسن نے اپنی تصنیف " تذکرۂ شعرائے اردو " میں استعمال کیا ۔ لیکن ان کے بعد بھی زمانہ زیر بحث میں (یعنی ۱۸۰۳ء تک) سوائے مصحفی ، شورش اور عشقی کے اور کسی تذکرہ نگار نے اس لفظ کو اپنی تصنیف کے نام کا جزو نہیں بنایا بلکہ اس کی جگہ نکات ، گلشن ، مخزن ، ریاض اور طبقات وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ۔ بہرکیف عرف عام میں ایسی ہر تصنیف کو جس میں شاعروں کا ذکر ہو ، تذکرہ ہی کہا جاتا ہے ۔

شمالی ہند میں تذکرہ نگاری کا آغاز اٹھارھویں صدی کے نصف آخر سے اس لیے ہوا کہ یہاں ریختہ گوئی کو قبول عام ہی اس صدی کے آغاز میں ہوا ۔ ظاہر ہے کہ جب تک شعراء کی ایک معقول تعداد کا وجود نہ ہو تذکرے کی ترتیب ممکن نہیں ۔

خواجہ زکریا فرماتے ہیں کہ اردو ادب سے متعلق جو تذکرے ہیں وہ فارسی میں بھی لکھے ہوئے ہیں اور اردو میں بھی ۔[1] انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں تذکرہ نگاری کے لیے زیادہ تر فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا ، لیکن ضخامت اور ارتقائی جائزے کے اعتبار سے اردو تذکروں کو اہمیت حاصل ہے ۔ اس دور میں تذکرہ نویسی کی فارسی روایات بھی قائم رہیں اور ساتھ ساتھ جواب الجواب کے طور پر تذکرے لکھنے کی چپقلشیں بھی چلتی رہیں ۔ ان تذکروں میں " عمدۂ منتخبہ " ، " مجموعۃ الانتخاب " ، " مجموعۂ نغز "

۱۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۳۵۷

" ریاض الفصحاء" ، " تذکرۂ بے جگر" ، " دیوان جہان" ، " گلشن بے خار" ، " خوش معرکۂ زیبا" اور " بہار بے خزان" ایسے تذکرے ہیں جن میں اشعار کے طویل انتخاب درج ہیں ۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جن میں شعراء کے حالات بہت مختصر ہیں ۔ البتہ بعض تذکروں میں ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے شعراء کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کی دھندلی سی تصویر بھی بن سکتی ہے ۔ بعض میں مرتب نے کلام کے حسن و قبح پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن سب کا انداز ایک جیسا ہے یعنی ان سب میں طرز تنقید تاثراتی ہے ۔ " عمدۂ منتخبہ" ، " مجموعۂ نغز" ، " خوش معرکۂ زیبا" اور " گلشن بے خار" میں مولفین نے اکثر ایک آدھ سطر میں اپنی آراء دینے کی کوشش کی ہے۔

ان تذکروں کے علاوہ کچھ ایسے تذکرے بھی ہیں جن کے مولفین نے ابتداء میں دیباچے لکھے ہیں اور شعراء کی تاریخ اور فنّی محاسن پر بحث کی ہے ۔ ان تذکروں کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس تمام مواد میں جو رنگ ، فکر و وجدان کی صناعی سے پیدا ہوتا ہے اس کی نشاندہی ان کے یہاں نہیں ملتی ۔ معاشی اور معاشرتی اقدار اگرچہ کسی دور میں بھی غیر اہم نہیں رہیں، لیکن انہیں شاعری کا پس منظر بنانا جدید دور کا انداز تنقید ہے اور مغربی اثرات کا مرہون منت ہے ۔ ان سب تذکروں میں سے یہ بات کسی قدر " طبقات الشعرائے ہند" میں ہے ۔ وہ بھی اس لیے کہ مولوی کریم الدین کی رہنمائی فیلن نے کی تھی اور اس کی بنیاد گارساں دتاسی کے تذکرے پر رکھی گئی ہے ۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے مضمون " اردو شعراء کے تذکرے" میں فرماتے ہیں کہ

انیسوین صدی مین اشاعت و طباعت اور مواد کی فراھمی مین آسانیون کے سبب تذکرہ نگاری کی رفتار بھی قدرے تیز رھی - چنانچہ انیسوین صدی کے آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ء کے درمیانی عرصے مین دو درجن سے زائد تذکرے لکھے گئے ھین -[۱] یہ تذکرے بہ لحاظ زبان دو گروھون مین تقسیم کیے جا سکتے ھین - ایک وہ جو فارسی زبان مین ھین، دوسرے وہ جو اردو یا کسی اور زبان مین لکھے گئے ھین - پہلے گروہ مین " عمدۂ منتخبہ "، " مجمع الانتخاب"، " ریاض الفصحا "، " مجموعۂ نغز"، " تذکرۂ بے جگر"، " دیوان جہان"، " طبقات سخن"، " تذکرۂ ابن امین طوفان "، " دستور الفصاحت "، " گلشن بے خار"، " مدائح الشعراء"، " تذکرہ بہار بے خزان" اور " گلشن ھمیشہ بہار" کے نام آتے ھین - آپ ان تذکرون کو طرز قدیم کے تذکرے بھی کہہ سکتے ھین - اس لیے کہ ان کی روش ظاھری و معنوی دونون لحاظ سے اٹھارھوین صدی کے تذکرون سے الگ نہین ھے - باقی تذکرے اردو، فرانسیسی یا انگریزی مین لکھے گئے ھین اور یہ اپنے مواد و طریقۂ کار مین پچھلے تذکرون سے اس درجہ مختلف ھین کہ انھین طرز جدید کے تذکرے کہنا زیادہ مناسب ھوگا -

۳- قدیم اور معاصر تذکرون مین " گلشن بے خار" کی امتیازی حیثیت ---- موازنہ :

گلشن بے خار کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ شیفتہ نے جن تذکرہ نگارون کا

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، نوین جلد، ۵۵۷

ذکر کیا ہے ان میں کئی کے تذکرے انھوں نے نہیں دیکھے تھے - صرف سن کر ہی یہ لکھ دیا کہ انھوں نے تذکرے بھی مرتب کیے ہیں - اور جن کے تذکرے دیکھے تھے ان کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ میں نے ان کے تذکرے دیکھے ہیں - اس ضمن میں گلشن بےخار سے کچھ اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

" ص ۱۳۲ - سرور (نواب میر محمد خان): انھوں نے ایک مبسوط تذکرہ بھی لکھا ہے جس میں ابتدائی دور سے لے کر آخر تک کے اردو شعراء کے اشعار جمع کیے ہیں - اس کو میں نے دیکھا ہے - " تذکرہ عمدہ منتخبہ " -

ص ۲۰۷ - فدوی (مکند): بعض تذکرہ نویس ان کو مغل اور نام فدائی بیگ تحریر کرتے ہیں -

ص ۲۱۲ - قائم (قیام الدین): بہت سے قابل لوگوں نے قائم کے متعلق کہا ہے کہ انھوں نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا - " مخزن نکات " -

ص ۲۲۰ - قاسم (قدرت اللہ): انھوں نے ایک تذکرہ اردو شعراء کے حالات میں لکھا ہے - لیکن میری نظر سے نہیں گزرا - " مجموعۂ نغز"

ص ۲۳۵ - لطف (مرزا علی): انھوں نے ریختہ گو شعراء کا ایک تذکرہ ریختہ زبان میں لکھا ہے، جسے میں نے بھی دیکھا ہے - " گلشن ہند "

ص ۲۵۳ - مصحفی (غلام ہمدانی): اردو کے چھ دیوان اور دو تذکرے - ایک فارسی دیوان اور ایک فارسی تذکرہ (تذکرۂ ہندی گویان ، ریاض الفصحا ،

عقد ثریا) ۔

ص ۲۵۹ ۔ مظہر (مرزا جان جاناں): ایک مختصر دیوان اور چھوٹی سی بیاض تیار کی اور " خریطۂ جوہر " دام رکھا ، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ھے کہ ان کا ذوق عام تذکرہ نویسوں جیسا نہیں جو انتخاب اشعار میں رطب و یابس کا امتیاز نہیں رکھتے ۔[1] "

ان مثالوں سے یہ بات ظاھر ہو جاتی ھے کہ جو تذکرے انھوں نے دیکھے ان کی خوبیاں اور خامیاں ان کی نظر میں تھیں اور اس طرح انھوں نے گلشن بے خار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ۔ نیز مظہر (مرزا جان جاناں) کے بیان میں یہ بات بھی واضح ہوگئی ھے کہ شیفتہ اشعار کے انتخاب میں رطب و یابس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے گلشن بے خار میں اشعار کا انتخاب مقابلتاً دوسرے بہت سے تذکروں سے بہتر ھے۔ اشپرنگر کا یہ کہنا کہ " گلشن بے خار " " مجموعہ نغز " سے ماخوذ ھے[2] غلط ھے ۔ شیفتہ کا اپنا بیان اس کے برعکس ھے کیونکہ انھوں نے " مجموعہ نغز " اپنے تذکرے کی تدوین کے وقت دیکھا ھی نہیں تھا۔ یہ بیان گزشتہ صفحے پر دیا جا چکا ھے ۔

گلشن بے خار میں جہاں تک شعراء اور ان کے کلام کے انتخاب کا تعلق ھے شیفتہ نے خود ھی دیباچے میں واضح کر دیا ھے کہ اساتذہ کے دواوین کا بہ دقت نظر مطالعہ کرکے اشعار کا انتخاب کیا گیا ھے ۔ جن کے دیوان نہ مل سکے ان کے منتخب افکار سفینوں

۱۔ گلشن بے خار (شیفتہ) ، ... مترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی

۲۔ یادگار شعراء (تذکرۂ اشپرنگر) ، دیباچہ ص ۸ ، سیریل نمبر۱۵ ، مترجم طفیل بی ۔ اے

سے حاصل کیے گئے ھین ۔ اگر کسی شاعر کا پسندیدہ شعر نہ مل سکا تو اس کو اس مین (گلشن بے خار) شامل نہین کیا گیا [1] ۔ شیفتہ نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ھے کہ غزلیات کے علاوہ کسی اور صنف سخن سے اشعار منتخب نہین کیے گئے ۔ ان کے اپنے الفاظ مین :

" دواوین اساتذہ سلف و خلف بہ دقت و انصاف ملاحظہ و ازان التفات کردم و دیوان کسے کہ بہ نظر نہ رسیدہ و دست بہم نہ داد ، افکارش از تذکرہ ھا و سفائن و مہر آن چہ خاطر بود بہ دستور بہ نقطہ انتخاب موشح و ثبت افتاد ۔۔۔ ازان کہ سامعہ فریب بیتی بہ نظر نہ رسید عام تر از مجاھیل و معارف و احیا و اموات نامش درین سفینہ چون ابیاتش درج نہ گردید ۔۔ غیر از اشعار غزل از دیگر اصناف اعراض رفت ۔ [2] "

گلشن بے خار مین اکثر جچے تلے الفاظ مین ایجاز و اختصار کے ساتھ حقیقت پسندانہ تنقید ملتی ھے ۔ یہ انداز اس دور کی مروجہ روش سے ذرا ھٹ کر ھے ۔ حبیب اشعر فرماتے ھین :

" اس سے (گلشن بے خار) پہلے جو شعرائے اردو کے تذکرے لکھے جاتے تھے، ان کی حیثیت منتخب اشعار کی بیاضون سے زیادہ نہ تھی

---

۱ ۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ۹ ۔ ۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲ ۔ گلشن بے خار (دیباچہ) ، ص ٦ ، مطبع نولکشور ، لکھنئو ، ۱۸۷۴ء

جن مین شعراء کے مختصر حالات یا زیادہ صحیح لفظون مین تعارف اور ان کے متعلق تذکرہ نگارون کے ذاتی تاثرات کا اضافہ کر دیا جاتا تھا ـــ اس اعتبار سے هم گلشن بے خار کو اپنے تنقیدی ادب کی پہلی کتاب کہہ سکتے هین ـ"[۱]

گلشن بے خار مین منتخب قدما اور معاصرین کا ذکر ملتا هے ـ حالات زندگی اگرچہ مختصر هین لیکن قابل اعتماد هین ـ آراء چاهے کسی کو اچھی لگتی هون یا بری غیر جانبدارانہ هین اور هر شاعر کے بارے مین کچھ نہ کچھ کہا گیا هے ـ مولانا صلاح الدین احمد فرماتے هین :

" گلشن بے خار کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح هو جاتی هے کہ یہ تذکرہ حقیقت مین اردو شاعری کا پہلا تنقیدی تذکرہ هے ـ اس سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے هین ا ن مین غیر معیّن اور غیر متناسب تعریفی یا تنقیصی جملون کا استعمال بڑی فراخدلی سے کیا گیا هےاور یہ کیفیت بمراتب کم و بیش سب قدیم تذکرون مین پائی جاتی هے ـ"[۲]

چوهدری محمد اقبال سلیم گاهندری[۳] فرماتے هین کہ قدیم تذکرون مین سے کوئی بھی اصابت رائے، حسن انتخاب اور سنجیدہ تنقید نگاری کے اعتبار سے اس تذکرے کا هم پایہ نہین ـ

۱ـ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۲۸۵ ، مرتبہ حبیب اشعر

۲ـ دیوان شیفتہ (دیباچہ) ، ص ۱۷ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

۳ـ گلشن بے خار، ص ۳، مترجمہ نفیس اکیڈمی ، کراچی

گلشن بے خار کے بعد بہت سے تذکرے منظر عام پر آئے ۔ جن تذکرہ نگاروں کی نظر سے یہ تذکرہ گزرا وہ اس کے انداز تنقید سے متاثر ہوئے ۔ کچھ نے پسند کیا اور کچھ نے ناپسند۔ پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ غرض تنقید ادب کے میدان میں غور و فکر کی راہیں پہلے سے زیادہ روشن ہوگئیں ۔ مولوی نصراللہ خویشگی (مولف گلشن ہمیشہ بہار) ذرا دبے لفظوں میں اور میر قطب الدین باطن (مولف گلستان بے خزاں یا نغمہ عندلیب) ذرا کڑک دار لہجے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگے اور شیفتہ اور ان کے احباب کو برا بھلا کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالنے لگے ۔ خواجہ زکریا فرماتے ہیں :

" گلشن ہمیشہ بہار،، مولوی نصراللہ خویشگی کی تصنیف ہے ۔ اس کا سال تصنیف ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نزدیک ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) اور ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحقیق کے مطابق ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) ہے ۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے اور چار سو بیس شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے ۔ سبب تالیف سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف ، مصطفےٰ خان شیفتہ کے تذکرے گلشن بے خار کے معیار تنقید سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ردّعمل کے طور پر یہ تذکرہ لکھا ۔ باطن کی طرح اگرچہ ان کا لب و لہجہ انتقامی نہیں، لیکن شیفتہ ، ان کے استاد مومن اور دوسرے احباب کے ذکرمیں کہیں کہیں طنز و تعریض سے کام لیاگیا ہے۔،،[1]

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۳۷۲، (تذکرے)

گلستان بے خزان کے نام سے حکیم میر قطب الدین باطن شاگرد نظیر اکبر آبادی نے گلشن بے خار کے جواب میں اردو میں ریختہ گو شعراء کا ایک تذکرہ لکھا جس کا تاریخی نام نغمۂ عندلیب ہے ۔ خواجہ زکریا کے الفاظ میں :

" بظاہر اس تذکرے کی تحریک گلشن بے خار سے ہوئی جس میں باطن کے استاد نظیر اکبرآبادی کے متعلق اختلافی رائے دی گئی ہے ۔ باطن نے جواب میں نہ صرف یہ کہ نظیر کی ازحد تعریف کی بلکہ شیفتہ کے گروہ کے بعض شاعروں کی مذمت میں حدّ اعتدال سے آگے قدم بڑھائے ہیں ۔ اس تذکرے کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا کہ یہ محض شیفتہ کے تذکرے کا متعصبانہ جواب ہے ۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔[1] ،،

گلستان بے خزان کے دیباچے کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ باطن کی نیت بخیر نہیں ہے ۔ وہ شیفتہ ، ان کے دوستوں اور ان کی تصنیف گلشن بے خار کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں :

" گلشن بے خار تصنیف نواب مصطفےٰ خان شیفتہ جو اوّل سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں نوابی پر فریفتہ، سب کو حقارت سے یاد کیا۔ بجز سات شخصوں کے ہر ایک کی نسبت عبارت

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، آٹھویں جلد ، ص ۳۷۲، (تذکرے)

ھجو آمیز ھے اور عبارت تذکرے کی وہ مثل کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ تذکرہ اور عبارت فارسی اون کی اور اون کے استاد کی عقل کا پھیر --- ایسی ایسی بے اعتنائیاں جب نظر آئین تو عاصی حکیم سید قطب الدین متخلص بہ باطن نے --- ایک تذکرہ جواب " گلشن بے خار،، بعبارت اردو جمع کیا جس کا نام رکھا گیا گلستان بے خزان -،،[1]

گلستان بے خزان کے بارے مین ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تجزیہ ملاحظہ کیجیے :

" --- باطن کے تذکرے کے تراجم بحیثیت مجموعی بے جان ھین - عبارت کی صناعی اور بے جا تعریف و تنقیص کے طومار مین سوانحی و تاریخی پہلو یکسر گم ھو گئے ھین - یہ تذکرہ گلشن بے خار کے جواب مین لکھا گیا ھے لیکن اس کی گرد کو بھی نہین پہنچتا -،،[2]

گلستان بے خزان (تذکرۂ باطن) کے بارے مین اشپرنگر کی رائے بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ھے - وہ کہتے ھین :

" حکیم سید غلام قطب الدین باطن قبل از ۱۲۵۹ھ گلشن بے خار کا ناقابل فہم اردو ترجمہ کچھ احمقانہ رایون کے ساتھ -،،[3]

۱- دیباچۂ گلستان بے خزان، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء

۲- تاریخ ادبیات پاکستان و ھند، نوین جلد، ص ۵۷۷

۳- یادگار شعراء (تذکرۂ اشپرنگر) ص ۹، سیریل نمبر۱۵، مترجمہ طفیل بی - اے

اسی طرح حامد حسن قادری فرماتے ہیں :

" تذکرے کے اعتبار سے یعنی انتخاب کلام اور حالات و تنقید میں باطن کا تذکرہ ہیچ و پوچ ہے۔[1]"

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ایک طویل فہرست میں اڑسٹھ تذکروں کی نشان دہی کی ہے جو ۱۷۵۲ء سے ۱۸۸۰ء کے دوران منظرعام پر آئے ۔[2] ان کے علاوہ کچھ اور تذکروں کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے مثلاً مصحفی کا تذکرہ " عقد ثریا "، مرزا مظہر جان جاناں کا تذکرہ " خریطۂ جوہر " وغیرہ ۔[3] مذکورہ فہرست کے مطابق " گلشن بے خار " سے پہلے اکتیس تذکرے موجود تھے اور بعد میں چھتیس تذکرے وجود میں آئے ۔ مؤلف گلشن بے خار کی نظر سے ماقبل کے تمام تذکرے تو نہیں گزرے لیکن جن تذکروں کو انھوں نے دیکھا ان سے کسی نہ کسی حد تک استفادہ تو ضرور کیا لیکن اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو گلشن بے خار اپنے دور کی ایک گران قدر تصنیف ہے ۔ اس سے پہلے کے تذکرے یقیناً اس سے بہتر نہیں ہیں ۔ اس میں ایک نیا پن ہے ۔ اظہار رائے غیر متعصبانہ اور بے لاگ ہے ۔ قصیدہ خوانی کم اور حقیقت بیانی زیادہ ہے ۔ اس کے بعد کے تذکرے تنقیدی ارتقاء کے سفر میں اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ معاصر تذکروں میں بھی اس سے بہتر تذکرہ

۱۔ داستان تاریخ اردو ، ص ۳۸۳

۲۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ، ص ۲۳۲

۳۔ گلشن بے خار از شیفتہ (اردو ترجمہ) ، ص ۲۵۹ ، مترجمہ نفیس اکیڈمی ، کراچی

شاید نہیں ملے گا۔ باطن (صاحب گلستان بے خزاں) نے گلشن بے خار کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ سراسر تعصب پر مبنی ہے، کسی علمی اصول سے انحراف کی بناء پر نہیں ۔ بہرحال گلشن بے خار تنقیدی ادب کے ارتقائی سفر کی ایک اہم کڑی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے ۔ گلشن بے خار میں اکثر شعراء کے حالات زندگی مختصر ہیں ۔ نمونے کے اشعار کی تعداد بھی کم ہے ۔ اور تنقید بھی جچے تلے الفاظ میں کی گئی ہے ۔ پھر بھی اس اختصار اور احتیاط میں ایک پختہ تنقیدی شعور کی جھلک نمایاں ہے ۔ اس طرح رطب و یابس سے اجتناب کیا گیا ہے جو ایک خوش آیند تنقیدی انداز ہے ۔ اس تذکرے میں جن لوگوں کے حالات زندگی قدر تفصیل سے دیئے گئے ہیں اور نمونۂ کلام بھی مقابلتاً مقدار میں زیادہ ہے ان سے صاحب تذکرۂ مذکور کی شیفتگی پہلے ہی سے معلوم ہے، لیکن کلام پر اظہار رائے سے کسی قسم کی رعایت یا جانبداری ظاہر نہیں ہوتی۔ جو کچھ سمجھا گیا ہے وہی کچھ ظاہر کیا گیا ہے ۔ گلشن بے خار پر یہ الزام کہ اس میں مندرج آراء جانبداری پر مبنی ہیں غلط ہے ۔ اس تذکرے میں جان بوجھ کر نہ کسی پر کیچڑ اچھالا گیا ہے نہ کسی کو بے جا طور پر سراہا گیا ہے ۔ اس طرح یہ تذکرہ متوازن انداز کی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور یہی اس کا ایک امتیازی وصف ہے ۔ گلشن بے خار کے تنقیدی انداز کو پسند کرنے والوں کی تعداد ناپسند کرنے والوں کی تعداد سے آج بھی بہت زیادہ ہے اور آئندہ بھی کم ہوتی دکھائی نہیں دیتی ۔ گلشن بے خار بلاشبہ اپنے دور کی ایک اہم تنقیدی دستاویز ہے جو آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی پہلے تھی ۔

۴۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے بارے میں
شیفتہ کی رائے کا تجزیہ :

شیفتہ نے تذکرۂ گلشن بے خار میں مختلف شعراء کی شاعری پر غزل کو سامنے رکھ کر تنقید کی ہے ۔ انھوں نے کسی کی ذات کو ہدف تنقید نہیں بنایا۔ نظیر اکبر آبادی کے ساتھ بھی ان کا یہی رویّہ ہے ۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو نظیر کی شاعری پر شیفتہ کی تنقید بالکل غیر جانبدارانہ اور مبنی برحقیقت ہے ۔ شیفتہ نے اپنے مزاج اور ماحول کے زیر اثر تنقید کے جو معیار قائم کر لیے تھے وہ ان پر دیانت داری سے کاربند ہیں اور "گلشن بے خار" میں ہر شاعر کی شاعری کو انھیں معیاروں پر پرکھتے ہیں ۔ شیفتہ کے تنقیدی نظریات ان کے اپنے اشعار میں جابجا ملتے ہیں ۔ مثلاً

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ ۔۔۔ معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا ۔۔۔ ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں ہم سے بہتر

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول ۔۔۔ اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو

آئیے دیکھیں شیفتہ نظیر کے بارے میں خود کیا کہتے ہیں:[۱]

" نظیر ۔ تخلص ، شیخ ولی محمد اکبرآبادی ۔۔۔ گویند کہ نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است ۔ بہ تعلیم صبیان بسر می برد ۔ کم مدّت است کہ ازیں خاکدان بہ روضۂ

۱۔ گلشن بے خار، ص ۲۳۲ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

رضوان رفت ۔ اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاری ست و نظر بہ آن ابیات در اعداد شعراء شایدش شمرد ، اما بہ رعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد ۔،،

شیفتہ نے نظیر کے حلم، اخلاق اور انکسار کی قدر کی ھے ۔ ان کی غزلوں سے منتخب اشعار کو پیش بھی کیا ھے، لیکن ان کی عام شاعری کے بارے مین یہی کہا ھے کہ جو اشعار بازاری لوگون کی زبان پر ھین ان کے پیش نظر تو زمرۂ شعراء مین ان کا شمار نہ ھونا چاھیے ۔ شیفتہ نے بازاری اشعار کی وضاحت نہین کی، لیکن عوام کی نظر مین جو شعر پسندیدہ تھے وہ فحش اشعار ھی تھے ۔ ان شعرون کو سامنے رکھتے ھوئے اگر شیفتہ نے یہ کہہ دیا کہ ان کے اشعار بازاری لوگون کی زبان پر ھین اور اس وجہ سے ان کو شعراء کی صف مین شامل نہین کیا جانا چاھیے (اس کا مطلب یہ ھوا کہ ان کو ان کے دوسرے منتخبہ اشعار کی بناء پر شعراء کی صف مین شامل کیا جانا چاھیے) تو کوئی بہت بری بات نہین ھے ۔ کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ھین :

" شیفتہ نے نظیر کے بارے مین صحیح رائے دی تھی ـــــ عوام کی نظر مین جو اشعار دل پسند تھے وہ فحش اشعار ھی تھے اور ان شعرون کو سامنے رکھتے ھوئے اردو شعراء مین اس کا کوئی نظیر نہین ۔ موجودہ زمانے کے اھل ذوق اس کلام سے تنہائی مین اب بھی ضرور لطف اندوز ھوتے ھین، لیکن کسی علمی محفل مین ایسا کلام پیش کرنے کی کسی کو جرأت نہین ھوتی ۔ کلیات نظیر کے قدیم ایڈیشنون سے ایسا کلام خارج

کر دیا گیا ہے ۔ اور آج بھی کوئی ناشر قانونی مواخذے کے خوف
سے یہ کلام نہیں چھاپ سکتا ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں شیفتہ
کی رائے تعصب پر مبنی نہیں قرار دی جا سکتی ۔" [1]

اس ضمن میں شمیم احمد کے ایک مضمون سے بھی ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

" ـــ قصہ یہ ہے کہ نظیر اپنی بے نظیر خصوصیات کے باوجود اردو شاعری کے اصل مزاج اور معیار پر ہمیں بہت مبتذل نظر آتا ہے اور کچھ نہیں ۔ خواہ آپ اسے کسی کلیے سے دنیا کا عظیم شاعر ثابت کر دیں (اس لیے مجھے کلیہ بازوں سے سخت ڈر لگتا ہے اور میں فوراً ان سے چوکنا ہو جاتا ہوں) مگر وہ غالب کے سامنے، میر کے سامنے آتش و مصحفی کے سامنے، مومن و سودا کے سامنے مبتذل، سطحی اور چھوٹا شاعر لگتا ہے ۔ تم کیا کرو گے اور ہم کیا کریں ۔" [2]

اس مختصر سے جائزے کا ماحصل یہ نکلا کہ شیفتہ نظیر اکبرآبادی کے حلم، اخلاق اور انکسار کی قدر کرتے ہیں ۔ ان کی مخصوص شاعری کی بھی تعریف کرتے ہیں لیکن ان کے ان اشعار کو جو بازاری لوگوں کی زبان پر ہیں پسند نہیں کرتے ۔ شیفتہ

---

۱ ۔ گلشن بے خار (دیباچہ ص ۳۸) مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲ ۔ نگار، سالنامہ (شاعری نمبر) ، ص ۷۷

نے بازاری اشعار کی نشاندھی نہین کی ۔ بس اسی پر اکتفا کیا ھے کہ ان اشعار کی وجہ سے ان کو زمرۂ شعراء مین شمار نہین کرنا چاھیے ۔ ھماری رائے مین یہ ایک مہذب انداز ھے فحش اور مبتذل اشعار سے ناپسندیدگی کے اظہار کا ۔ نظیر کی کلیّات مین ایسے بہت سے اشعار مل جائین گے جن کو شرفاؑ کی محفلون مین کھلے بندون نہین پڑھا جا سکتا ۔ دراصل شیفتہ کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا ۔ شہر کے ثقہ اور خواص کا انداز ۔ نظیر اکبرآبادی کا مخصوص انداز بالکل عوامی انداز تھا ۔ عام لوگون اور غریب غرباؑ ، کم پڑھے لکھے لوگون کا سا انداز ۔ بھلا شیفتہ اس انداز کو کیسے پسند کرتے؟ ۔ وہ اپنے وضع کردہ اصولون سے کیسے انحراف کرتے؟ ان کا تعلق طبقۂ خواص سے تھا ۔ ان کی معاشرتی اور علمی زندگی کے انداز ایک خاص تہذیبی پس منظر کے غمّاز تھے ۔ ان حالات مین اگر انھون نے نظیر اکبرآبادی کے فحش اور مبتذل اشعار کی وجہ سے ان کو شعراء کی صف مین شامل کیے جانے کے قابل نہین سمجھا تو اس مین تعجب کی کوئی بات نہین ھے ۔ شیفتہ کی مزاجی خصوصیات ھی ایسی تھین کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ کر ھی نہین سکتے تھے ۔ پھر بھی ھمین شیفتہ کی اس بات کی داد دینی چاھیے کہ انھون نے منافقت اور ریاکاری سے کام نہین لیا اور جو کچھ کہہ سکتے تھے صاف صاف کہہ دیا ۔

۵- تذکرہ نگار اور نقاد کی حیثیت
سے شیفتہ کا مقام:

باطن نے شیفتہ اور ان کے حلقۂ احباب پر جو تنقید کی ہے، وہ تنقید نہیں کہلائی جا سکتی - انھوں نے ذاتیات پر حملے کیے ہیں - باطن کا یہ اعتراض بھی کہ شیفتہ نے اپنی اور اپنے احباب کی تعریف اور دوسروں کی مذمّت کی ہے، غلط ہے - کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ہیں:

" آزردہ کی علمی اور ادبی خدمات دھلی والوں اور ملک کے اہل علم کی نظر میں باعث افتخار تھیں - غالب اور مومن آسمان شاعری کے آفتاب و ماھتاب تھے - شیفتہ اور وحشت مومن کے خاص شاگرد اور غالب کے نزدیک قابل ستائش شاعر تھے - صاحب اور نزاکت کسی شاعری مومن اور شیفتہ کی مرھون منت تھی، اور شیفتہ نے ان کے حسن کے بار ے میں مبالغہ کیا ھے نہ کہ شاعری کے بار ے میں - ایسی صورت میں شیفتہ کے تذکر ے کو مردود قرار دینا کج بحثی کی بناء پر ھے نہ کہ علمی اختلاف کے باعث [1]"

تذکرۂ گلشن بے خار کے خلاف ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بہت کچھ لکھا ھے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ھے کہ نہ تو شیفتہ بلندپایہ نقاد تھے نہ ان کا تذکرہ معیاری

۱- گلشن بے خار (دیباچہ) ص ۳۷، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

تنقید کا حامل ہے ۔[1] اسی طرح ڈاکٹر خواجہ زکریا بھی شیفتہ کو نہ تو ایک باشعور نقاد مانتے ہیں اور نہ گلشن بے خار کو ایک معیاری تذکرہ ۔[2]

اس قسم کے اعتراضات کے پیش نظر سید عابد علی عابد مرحوم کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو اصل صورت حال کی نوعیت کی وضاحت میں بہت مفید ثابت ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے اعتراضات محض غلط مفروضات کی بناء پر کیے گئے ہیں :

" میں بہ اجمال ان مضامین سے تعرض کرتا ہوں ۔ انتقادی مسلمات کی چھان پھٹک میں ایک خطرہ مضمر ہے، وہ یہ کہ اگر نقاد اور محقق بعض صورتوں میں بالکل صحیح استشہاد و استدلال سے ایسے نتیجے پر پہنچتا ہے جو مسلمات کے خلاف ہوتا ہے تو بہ امتداد زمان طبعاً وہ تمام انتقادی فیصلوں کو کم و بیش مشتبہ گرداننے لگتا ہے ۔ عندلیب شادانی کو بھی یہ خطرہ پیش آیا ہے ۔ اکثر و بیشتر انہوں نے بہت ٹھنڈے دل سے مسلمات اور مفروضات کا جائزہ لیا ہے لیکن میرے خیال میں شیفتہ کے سلسلے میں کچھ ناانصافی ہوگئی ہے ۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیفتہ کی جو انتقادی تحریریں ہمارے سامنے ہیں ان سے یہ معلوم

۱۔ تحقیق کی روشنی میں، ص ۸۶، عندلیب شادانی ڈاکٹر

۲۔ کریسنٹ (حالی نمبر) صفحہ ۱۹۹، (شیفتہ اور حالی ۔ خواجہ زکریا ڈاکٹر)

نہین ہوتا کہ شیفتہ بہت بڑے نقاد تھے ۔ ان کے خیال مین اس بات کو یون بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جوش کے بعض عالمون اور دانش ورون نے شیفتہ کی انتقادی بصیرت اور سخن فہمی کا ذکر نہین کیا۔ دونون دلیلین بہت قوی ہین لیکن اس کا کیا علاج کہ مین اور میرے معاصر ، ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کی بے پناہ انتقادی بصیرت سے شخصاً آگاہ ہین لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریرون سے ان کی پوری صلاحیتون کا بالکل علم حاصل نہین ہوتا۔ کچھ ایسی ہی صورت شیفتہ کی بھی ہے ۔ اگر ان کی انتقادی تحریرون سے ان کی بصیرت ثابت نہین ہوتی تو لازم نہین آتا کہ وہ سخن فہم اور نقاد نہ تھے ۔ حالی کی بصیرت اور دیانت پر شبہ کرنا ناممکن ہے ۔ شیفتہ کے متعلق حالی کے اعترافات کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے برسون شیفتہ کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا ہے ۔ وہ یہ وجہ احسن بتا سکتے ہین کہ شیفتہ کی گفتگو سے یہ مترشح ہوتا تھا یا نہین کہ وہ سخن فہم بھی ہین اور نقاد بھی ۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ پرانے تذکرون مین ، جن مین ، گلشن بیخار بھی شامل ہے انتقادی فیصلے صادر کرنے کے لیے ایسے کلمات استعمال کیے گئے ہین جن کی اصطلاحی نوعیت بتدریج ہماری نظرون سے اوجھل ہو گئی ہے ۔ میرا ایمان ہے کہ شیفتہ کے وقت تذکرون مین انتقادی

اصطلاحات مستعمل تھیں ، معاصر دانش ور اور شعراء ان کی دلالتوں سے کلیتاً آگاہ تھے ۔ اس سے شیفتہ کی مختصر نویسی پر یہ گمان نہ ہونا چاہیے کہ انتقادی اشارات اور مضمرات سے خالی ہیں ۔ اس مرحلے پر میں شیفتہ کے انتقادی کلمات کا تجزیہ نہیں کر سکتا لیکن جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ، مجھے یقین ہے کہ شیفتہ کے انتقادی کلمات کی دلالتیں اور مضمرات پہچدار ، وسیع اور نازک ہیں ۔[1] "

مولانا حسرت موہانی نے شیفتہ کی تنقید نگاری پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ شعراء کے کلام پر ان کی تنقید ناکافی ہے ، لیکن پھر بھی ان کی تحریر قابل ستائش ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

" خود چوں کہ ذی استعداد و صاحب مذاق صحیح تھے اس وجہ سے " گلشن بے خار " میں دوسرے تذکرہ نویسوں کے برخلاف اکثر شعراء کے کلام پر تنقید منصفانہ سے باز نہیں رہے ۔ اگر زمانۂ موجودہ کے مذاق کے مطابق دیکھیے تو شیفتہ نے جس قدر تنقید کی ہے وہ بھی ناکافی نظر آتی ہے ، لیکن پھر بھی اس بارے میں ان کی تحریر قابل ستائش ہے کیونکہ ان سے قبل اور ان کے معاصرین میں بعض ایسے تذکرہ نویس بھی گزرے ہیں جنھوں نے مرنجاں مرنج کے اصول کے مطابق جتنے شاعروں کا حال لکھا ہے سب کی یکساں

---

۱ ۔ صحیفہ ، ص ۸۸ ، ستائیسواں شمارہ ، اپریل ۱۹۶۴ء

تعریف کی ھے ۔ اور اس لیے ان کے تذکروں کو تذکرہ کہنا ھی ایک معنی کر کے غلط ھے ۔ لوگ چونکہ اس قسم کی نکتہ چینیوں کے عادی نہ تھے اس لیے شیفتہ کی صاف گوئی بہتوں کو ناگوار گزری ۔ مثلاً میر قطب الدین باطن اکبرآبادی کو (کہ نظیر اکبرآبادی کے شاگرد تھے) اپنے استاد کی نسبت شیفتہ کا بیان اس قدر ناگوار گزرا کہ محض اس کے جواب اور رد کے لیے ایک نیا تذکرہ " گلستان بے خزاں " کے نام سے لکھا اور اس میں یہ التزام کیا کہ جن شاعروں کی شیفتہ نے تعریف کی تھی، ان کی ھجو اور جن کی برائی کی تھی ان کی حد سے زیادہ تعریف کی۔

یا مثلاً آزاد نے تذکرہ " آب حیات " میں سید انشا کی مدح بے حد کے جوش میں شیفتہ کے صحیح اور بالکل صحیح اعتراض پر اظہار ناراضی کیا ھے ۔ لیکن انصاف یہ ھے کہ کم از کم انشاء کے معاملے میں شیفتہ کا قول صحت سے نزدیک ھے ۔۔۔ نظیر اکبر آبادی کے ذکر میں البتہ شیفتہ کی نکتہ چینی حد سے بڑھ گئی ھے ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ انھوں نے نظیر کی صرف چند بازاری نظمیں مثلاً " چوھوں کا اچار " وغیرہ سن کر یہ رائے قائم کر لی ھوگی۔ اگر نظیر کی تمام نظمیں ان کی نظر سے گزر جاتیں تو غالباً اس

قدر درشتی کو کام نہ فرماتے ۔

بہرحال گلشن بے خار اگرچہ کمزوریوں سے خالی نہیں ہے لیکن اس زمانے کے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے۔،،[1]

شیفتہ کی تنقید نگاری کے سلسلے میں مظفر علی سید فرماتے ہیں کہ آج کل کئی نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ پرانے لوگوں میں تنقیدی شعور سر ے سے غائب تھا اور یہ صرف ہمار ے ہی حصے میں آیا ہے ۔ ہمارا پرانا تنقیدی سرمایہ شعراء کے تذکر ے ، دیوانوں کے دیباچے، تقاریظ اور اکثر شعراء کے مقطعے ہیں ۔ جو لوگ میر تقی میر یا مصحفی کے تذکروں میں کسی خاص طرح کی تجزیاتی تنقید نہیں پاتے اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ کہاں کی تنقید ہے وہ اگر اپنے اندر اتنی وسعت قلب پیدا کر لیں کہ تنقیدی شعور کے مختلف مراحل کا معروضی مطالعہ کرنے کے قابل ہو جائیں تو انہیں اردو کی قدیم تنقید میں وہ برائیاں نظر نہیں آئیں گی جو ان کے اپنے تعصب کی پیداوار ہیں ۔[2]

تنقید کا پہلا مرحلہ شعر کے حسن و قبح ، پسند ناپسند سے متعلق ہے اور نقاد میں جب تک اپنی زبان کی شاعری کی روایت کا احساس اور ایک استوار ذوق نہ ہوگا وہ ان اشعار سے لذت اندوز نہ ہو سکے گا۔ آئی ۔ اے ۔ رچرڈس نے جو موجودہ زمانے میں نفسیاتی تنقید کے دبستان کے رہنما ہیں، تنقید کو ذوق کا منطقی اظہار کہا ہے ۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ نیک و بد کی شناخت کے بعد اس کے تجزیے کی باری آتی ہے ۔ ہمار ے

١۔ اردوئے معلّی علی گڑھ، جلد ٣، نمبر٣، اکتوبر ١٩٠٣ء

٢۔ ادب لطیف ، لاہور، مارچ ١٩٥٠ء، (شیفتہ کی تنقید نگاری ۔ مظفر علی سید)

پرانے شاعر مثلاً میر، قائم، میر حسن، مصحفی اور شیفتہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صالح ذوق شعر کے مالک بھی تھے جس نے ان سے تذکرے لکھواتے وقت کنارہ کشی نہیں کی ۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ و حسرتی شاعری کے اعتبار سے بھی اپنے وقت کے اتنے ہی بڑے مرکز تھے جتنے میر حسن یا مصحفی اپنے وقتوں میں تھے ۔ وہ ایک ایسے طبقۂ خاص کے نمائندے تھے جس نے اردو اور فارسی شاعری میں اس قدر دستگاہ حاصل کی ہوئی تھی کہ فن شعر میں حسن و قبح کا فیصلہ ہو سکے، مگر شیفتہ کی ذہین و فطین طبیعت یہاں تک آ کر رک نہیں گئی تھی ۔ انھوں نے اپنے مطالعے سے کچھ نتائج اخذ کرنے شروع کیے اور ان کے فراہم ہونے پر ان کے ذوق نے اپنے معاصرین سے ذرا الگ راستہ اختیار کیا اور انھوں نے اپنے قائم کردہ نتائج کو ایک نظام تنقید کے رشتے میں پرونا شروع کر دیا ۔ شیفتہ کے ان نتائج کو نظری تنقید کا نام دینا بےجا نہ ہوگا ۔ شیفتہ کی نظری تنقید کا امتزاج عملی تنقید کے ساتھ اس قدر خوشگوار ہوا کہ دوسرے تذکرہ نویسوں کے مقابلے میں ان کی آراء کے منطقی وجوہ کو دریافت کیا جا سکتا ہے ۔ شیفتہ نے اپنے تنقیدی تصورات کی روشنی میں تمام تر نئی و پرانی اردو شاعری کو کھنگالا اور کھوٹا کھرا الگ کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے یہ نظریے قبول عام سے ہٹ کر قائم کیے اور نئے و پرانے شاعروں پر آزاد رائے قائم کرتے وقت مروّجہ نقطۂ نظر کو اثرانداز نہ ہونے دیا ۔

خواص پسند نظریۂ شعر جس کے رہنما اپنے زمانے میں شیفتہ ہی تھے آہستہ آہستہ قبول عام سے ہٹ کر ایک ایسی باذوق جماعت بنانے میں کامیاب ہوگیا جس نے شاعری کے متعلق

" ان کے بعض خیالات کافی دردمندانہ ، دلپذیر اور دلپسند واقع ہوئے ہیں ۔ ان کی مثنوی بہت مشہور ہے کیونکہ اس کی بنیاد بول چال کے محاورے پر ہے ۔ اس لیے مقبول عام ہے "(اردو ترجمہ)[۱]

اسی طرح جرأت کے حال میں شیفتہ نے لکھا ہے:

" چون از اصول و قواعد این فن بہرہ نداشت ، نغمہائے خارج از آہنگ می سرودہ ۔ آوازہ اش کہ چون طبل دورتر رفتہ، ازاںست کہ پذیرائی خاطر و گوارائی طبع او باش و الواط حرف فی زدہ ۔۔۔"[۲]

شیفتہ کو اوباش و الواط کی خاطر شعر کہنے سے چڑ تھی، تو اس کا باعث بھی تھا کہ وہ ان کے ذوق کو ادبی نہ سمجھتے تھے ۔ شیفتہ نے جرأت پر جو ایک بے نظیر جملہ کہا ہے کہ " نغمہائے خارج از آہنگ سرودہ "، تو اس کے پیچھے بھی فقرہ بازی کے علاوہ ایک نظریہ کام کر رہا تھا۔ اور وہ ہے اردو کی شاعرانہ روایت کا احساس ۔

انشاء کے بارے میں انھوں نے کہا :

" ہیچ صنعت را بہ طریقۂ راسخۂ شعراء نہ گفتہ "[۳]

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شعراء کے " طریقۂ راسخہ " سے واقف تھے اور اسے آہنگ کا نام دیتے تھے ۔ مگر شیفتہ نے اس نظریہ سازی کی دھن میں کسی شاعر کے اچھے

۱۔ گلشن بے خار، ص ۳۲، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲۔ ایضاً ، ص ۱۱۲

۳۔ ایضاً ، ص ۷۰

شعروں کو فراموش نہیں کیا ۔

شیفتہ کا تذکرہ " گلشن بے خار ،، ایک تنقیدی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی " انتھالوجی ،، ہے ۔ انھوں نے اردو تنقید کو بیش قیمت نظریے دیئے۔ معنی اور الفاظ کے سلسلے میں انھوں نے پہلے پہل معنی کا ساتھ دیا اور تزئین الفاظ کے پیچھے پڑنے والوں کو ان کے مضامین کی سبکی کی طرف توجہ دلائی ۔

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول

کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

یہی معنی کی فکر شیفتہ کو غالب اور مومن میں نظر آئی ۔ اس لیے انھوں نے ان کی بہت تعریف و توصیف کی جسے بعض لوگوں نے ان کی جانبداری پر محمول کیا ۔ ان کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اردو شاعری کی بنیادی روایت سے لوگوں کو آگاہ کیا اور راہ استقامت سے ہٹ جانے والے سے باخبر کیا۔ بے شک اس راستے میں وہ انتہاپرستی کو نہ روک سکے مگر ان کی تنقیدی نظر کی ہمہ گیری اور نظریہ سازی میں احتیاط ایسی معمولی خصوصیات نہیں ہیں کہ ان کے تنقیدی کارناموں ہی سے یک قلم انکار کر دیا جائے ۔ ان کی مدح و ذم میں کسی خدا واسطے کے بیر کو دخل نہیں تھا ، حالانکہ میر تقی میر اور قدرت اللہ قاسم نے ، حاتم ، قائم اور یقین وغیرہ کا ھجوآمیز ذکر کیا ہے۔ شیفتہ سے اگر کوئی کوتاھی ہوئی تو وہ ان کے اپنے نظریوں کو ذرا انتہائی مطابقت دے دینے سے ہوئی ، ورنہ کسی سے ان کی ذاتی پرخاش کا کوئی حال نہیں کھلتا۔ شیفتہ نے دوسرے تذکرہ نویسوں کی باتوں کو نہیں دھرایا ۔ انھوں نے بطور خود اپنے نظریے

قائم کیے - ان کا اطلاق اکثر کافی حزم و احتیاط سے کیا - چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مومن، غالب اور آزردہ ان کی باریک بینی، صفائے خاطر اور بلندیٔ فطرت کا اکثر ذکر کرتے ہیں -

مصحفی پر شیفتہ کی تنقید دقت نظر کی حامل ہے - اس سے بہتر تنقید مشکل ہے - وہ فرماتے ہیں :

" ہرچند بہ تقاضائے شیوۂ بسیار گویان اکثر کلامش بہرکم پایہ و از لطایف خالی است ، اما گزیدہ اشعار او در نہایت رتبت والا و مرتبت عالی است -،، (گلشن بے خار)

حافظ عبدالرحمن خان احسان کہنہ مشق شاعر تھے اور شیفتہ سے تعلقات بھی تھے ، لیکن تبصرۂ کلام کے ذیل میں ان کے رنگ سخن پر لکھتے ہیں :

" اشعار عاشقانہ اش ناخن بہ دل زن است - در صنائع لفظی مانند جناس و اشتقاق و طباق و غیر آن اصرار از حد افزون دارد و با راقم تعارفش ہست -،، (گلشن بے خار)

شاہ نصیر سے شیفتہ کے تعلقات تھے - دھلی کے باشندے انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے - ان کی استادی وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کا ذکر کرتے ہیں مگر تبصرے میں طرز سخن پر رائے نہیں دی ہے - لکھتے ہیں :

" با شعرائے شہر ہر دیار برخوردہ و مطارحہ و مشاعرہ کردہ و بہ استادی نام برآوردہ - ہنگام قیام جہان آباد بہ تاریخ پانزدہم و بست و نہم ہر ماہ محفل مشاعرہ منعقد می سازد و زمین ہائے

سنگلاخ طرح می کنند ۔،، (گلشن بے خار)

شاہ نصیر کے کلام سے ناپسندیدگی کا اظہار حافظ غلام رسول شوق شاگرد شاہ نصیر کے ذکر مین ملتا ھے:

" شوق ۔ تخلص غلام رسول ــــ نسبت شاگردی بہ شاہ نصیر دارد ۔ اکثر کلامش بہ طرز اوستاد خود است ۔،، (گلشن بے خار)

شیفتہ کا یہ رنگ تنقید ظاھر کرتا ھے کہ شعر و سخن پر انھین قدرت کامل حاصل ھے اور انھون نے اپنے عہد کے مشاھیر شعراء کے کلام پر تبصرہ کرنے مین ناانصافی سے کام نھین لیا ۔

(ب) رہ آورد (ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک) ۔فارسی:

١ ۔ ترتیب و اشاعت:

شیفتہ ١٢٥٦ھ (م ١٨٤١ء) مین فریضہ حج بیت اللہ ادا کر چکے تھے ۔ بعد مین انھون نے اپنے سفر حج کی تفصیلات ایک کتاب کی شکل مین مرتب کین ۔ نظامی بدایونی فرماتے ھین :

" آپ نے اپنا سفرنامہ جو دراصل اس مقدّس سفر کا تاریخی روزنامچہ ھے نہایت تفصیل کے ساتھ شستہ فارسی مین مرتب فرمایا تھا ، جس کا عربی

نام " ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک " اور فارسی " رہ آورد "
ہے ۔"[1]

ایک اور اطلاع کے مطابق :

" دیباچے میں انھوں نے کتاب کا نام " رہ آورد " تجویز کیا تھا ۔ چنانچہ اس کی طباعت مطبع مصطفائی دہلی میں ۱۲۸۳ھ میں اسی نام سے ہوئی تھی ۔ لیکن بعد میں انھوں نے اس کے لیے دیا سرورق دوسرے نام سے مطبع مرتضائی دہلی میں چھپوا کر مطبوعہ نسخوں میں سے ۱۲۵ نسخوں میں کتاب کا نام بدل دیا ۔ باقی نسخے اسی نام سے رہے ۔"[2]

نظامی بدایونی فرماتے ہیں :

" ۱۹۱۰ء میں اس کا (سفرنامہ شیفتہ) اردو ترجمہ سید زین العابدین صاحب بی ۔ اے منصرم عدالت ججی فرخ آباد نے شائع کیا جس کا نام " سراج منیر " ہے ۔"[3]

اسی بات کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ محمد ایوب قادری یوں کہتے ہیں :

" اس کا اردو ترجمہ " سراج منیر " کے نام سے زین العابدین ، منصرم عدالت ججی فرخ آباد نے کیا ہے جو نہایت بامحاورہ اور سلیس ہے ۔

۱۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۱۳ ، نظامی بدایونی
۲۔ نقوش (آپ بیتی نمبر) ، جون ۱۹۶۴ء ، ص ۲۳-۱۶۶۲
۳۔ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات) ، ص ۱۳ ، نظامی بدایونی

یہ ترجمہ ١٩١٠ء میں نواب محمد اسحاق خان نے مطبع آگرہ اخبار سے شائع کرا دیا ہے ۔"[1]

صورت حال یہ ہے کہ شیفتہ کے سفرنامے کا عربی نام " ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک " ہے اور فارسی نام کچھ نسخوں میں " بہرہ آورد " اور کچھ میں " رہ آورد " ہے ۔ یہ سفرنامہ ١٢٨٣ھ (م ٦٧-١٨٦٦ء) میں مطبع مصطفائی دھلی میں چھپا ۔ اسی دوران میں اس کا سر ورق تبدیلیٔ نام (فارسی نام) کے ساتھ مطبع مرتضائی دھلی میں چھپا ۔ اس کا اردو ترجمہ " سراج منیر " کے نام سے سید زین العابدین بی ۔ اے محرم عدالت ججی، فرخ آباد نے کیا جس کو ١٩١٠ء میں نواب محمد اسحق نے مطبع آگرہ اخبار سے شائع کرایا ۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتابیں شائع بھی ہوئیں یا نہیں ۔

۲- اسلوب تحریر :

تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ جس طرح فن شعرگوئی اور فن تنقید نگاری میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح فن وقائع نگاری کے رموز سے بھی آشنا تھے ۔ ان کی فارسی تحریر انشاء پردازی کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے ۔ اپنے سفر کی تمام تفصیلات کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے ۔ یہاں بھی ان کا انداز تحریر وہی ہے جو ہمیں " گلشن بے خار " اور " رقعات فارسی " میں ملتا ہے ۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں :

١- جنگ آزادی ١٨٥٧ء (واقعات و شخصیات) ، ص ٣٩١، محمد ایوب قادری

" بهمه حال بدین نوع بان جزیره رسیده شد ـ جزیره بود و چه
جزیره که چشم حاسدازان فراخ تر باشد و دل لئیم ازان کشاده تر
و معهذا نه نهالی که بسایهٔ آن توان نشست و نه در ختی که از
میوهٔ آن بهره توان برداشت نه آب را دران وجودی و نه دانه
را دران نمودی نه راهی که ازان جاتوان گزشت و نه ساحلی که
باجا توان رسید ـــ[1]"

۳- مواد کا تجزیہ :

اس سفرنامہ کا بیشتر حصہ حج و زیارت کے اصول و آداب ، متعلقہ مسائل اور متبرک بیانات پر مشتمل ہے ، لیکن اس کے بعض حصے روزنامچہ سفر کی حیثیت رکھتے ہین ـ پوری کتاب کا مکمل لفظی ترجمہ سید زین العابدین نے " سراج منیر" کے نام سے اردو مین کیا ہے ـ سید وزیرالحسن عابدی نے ان واقعات و حالات کا تاریخ وار اردو مین ترجمہ کیا ہے جو دوشنبہ ۱۷ ذوالحجہ ۱۲۵۴ھ (۲ ـ مارچ ۱۸۳۹ء) سے لے کر ۲/ ربیع الاوّل (۱۲/ مئی ۱۸۳۹ء) تک پھیلے ہوئے ہین ـ[2] اس سفرنامہ مین سفر کی تمام منزلون کے نام اور مختصر حالات درج ہین ـ ان حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے مین دھلی سے بمبئی تک راستے کیا تھے ـ ان راستون کی مختلف منزلون کا حال کیا

۱ـ کلیات شیفتہ و حسرتی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)ص ۱۵ ، نظامی بدایونی

۲ـ نقوش (آپ بیتی نمبر) جون ۱۹۶۴ء، ص ۶۳-۱۲۶۲

تھا ۔ راستے مین کس قسم کے خطرات اور دقتین پیش آتی تھین ۔ سمندر کے سفر مین کیا کیا مشکلات اور دشواریان تھین ۔ اس سفرنامہ مین یمن اور حجاز کے مختلف مقامات کی کیفیت بھی بیان کی گئی ھے ۔ مکّہ معظمہ ، مدینۂ منوّرہ اور طائف کی جو کیفیت ۱۸۴۰ء مین تھی وہ بھی اس سفرنامہ سے معلوم ھو جاتی ھے ۔ سفر کی دقتون اور دشواریون کے علاوہ حج اور زیارت کی پوری تفصیل ، مناسک اور مختلف دعائین بھی درج ھین ۔ شیفتہ نے اس خوبی سے یہ تمام تفصیلات بیان کی ھین کہ حالات و واقعات کا نقشہ آنکھون کے سامنے کھنچ جاتا ھے ۔ اس سفرنامے سے ھمین شیفتہ کے صبر و استقامت کا بھی بخوبی اندازہ ھوتا ھے ۔ اسی سفر کے دوران ان کی نانی اور والدہ یکے بعد دیگرے فوت ھوئین اور اسی سفر کے دوران ان کا جھاز سمندر مین ایک پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ھوگیا ۔ شیفتہ اور ان کے ساتھی ایک ویران، لق و دق جزیرے مین کئی ھفتے پریشان و سرگردان رھے ۔ بھرحال یہ سفرنامہ بھی شیفتہ کی زندگی کے کئی پھلوؤن سے پردا اٹھاتا ھے ، جن کی کچھ تفصیلات تو دوسرے باب مین بیان کی جا چکی ھین اور کچھ اب پیش کی جا رھی ھین ۔

۴۔ شیفتہ کی شخصیت اور سیرت کا عکس :

شیفتہ کے سفرنامے " رہ آورد ،، (ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک) کے مطالعے سے ان کی شخصیت اور سیرت کے کئی چھپے ھوئے گوشون پر روشنی پڑتی ھے ۔ شیفتہ بنیادی طور پر ایک شریف الطبع اور خداترس انسان تھے ۔ انھین قدرت نے ایک ایسا دل عطا کیا

تھا جو شریفانہ اور پرخلوص جذبات سے لبریز تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے دور کے ایک بڑے رئیس اور جاگیردار تھے، وہ غرور و تکبّر سے عاری تھے ۔ انھوں نے اپنے سفر حج کا آغاز ایک قافلے کے ساتھ کیا۔ ان کی حیثیت اس قافلے میں بھی نمایاں تھی لیکن انھوں نے خلق خدا کی خدمت ھی میں خوشی محسوس کی۔ سفر حج پر روانہ ہونے سے پہلے جہاں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملے وھاں بزرگوں کی قبور پر بھی حاضری دی اور مختلف بزرگان دین کے مزاروں پر بھی تشریف لے گئے ۔ دھلی سے بمبئی تک کا خشکی کا راستہ انھوں نے سب کے ساتھ بڑے صبر و تحمل سے کاٹا۔ بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے تو سمندری سفر کے دوران ھی جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا اور انھیں تمام قافلے والوں کے ساتھ ایک ویران جزیرے میں قیام کرنا پڑا۔ وھاں بھی وہ ھر ایک کی دلجوئی کرتے اور حوصلہ بڑھاتے رھے ۔ اللّٰہ تعالیٰ پر نظر کر کے اس کی عبادت کرتے رھے ۔ جو سب نے کھایا وھی شیفتہ نے کھایا۔ شیفتہ نے اپنے لیے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ جب اللّٰہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے اس جزیرے کو چھوڑنے کا وقت آیا تو اس وقت بھی شیفتہ سب کو کشتیوں پر سوار کرانے کے بعد خود سوار ہوئے ۔ شیفتہ کے یہ جذبات کہ اگر جزیرے پر کوئی شخص پیچھے رھا تو وہ میں ھوں گا، یقیناً قابل تحسین ھیں ۔ ورنہ اس نفسانفسی کے عالم میں کون اس قسم کے ایثار کا مظاھرہ کرتا ھے ۔ جب یہ سفر شروع ھوا تو شہیدی بیمار تھے۔ شیفتہ راستے بھر ان کی خدمت کرتے رھے یہاں تک کہ شہیدی نے انھی کے ھاتھوں میں جان دی ۔ شیفتہ کی نانی اور والدہ یکے بعد دیگرے اللّٰہ کو پیاری ھوگئیں ۔ انھوں نے یہ صدمہ بھی صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ میں حج و زیارات سے فارغ

ہونے کے بعد وہاں کے علمائے دین کی خدمت میں حاضر ہو کر کسب علم کرتے رہے اور اپنا وقت عبادت و اذکار میں ہنسی خوشی گزارتے رہے اور رضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہے۔ شیفتہ کے سفرنامے سے جہاں ہمیں ان کی علمیت و قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے کردار کی عظمت و بلندی کا بھی علم ہوتا ہے ۔ شیفتہ نے دوران سفر ہی ایک خط بزبان فارسی مومن خان مومن کو لکھا، جو ان کے مکتوبات میں تو شامل نہیں ہے، لیکن اس کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کی سیرت کی عظمت و بلندی پر مزید روشنی پڑتی ہے:

" رقعہ رقم زدہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (موسومہ حکیم مومن خان صاحب کہ از راہ کعبہ نوشتہ بودم ۔ برادر والا قدر مومن خان صاحب، سلامت ۔

بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے کے دن خط لکھا تھا۔ ۱۵/ کو جہاز چلا اور ہم پانچویں رمضان کو عدن میں پہنچے اور لنگر ڈالا۔ دو دن کے بعد عدن سے روانہ ہوئے اور دسویں تاریخ کو مخا میں آئے ۔ وہاں تین دن ٹھہر کر پندرھویں کو حدیدہ میں نزول کیا۔ یہاں دس دن قیام رہا۔ چھبیسویں کو حدیدہ سے چلے ۔ واضح رہے کہ اگر ہوا موافق چلتی رہے تو حدیدہ سے جدّہ تک پانچ دن کا سفر ہے ۔ ہم نے حدیدہ سے روانگی کے دن یہ سمجھا تھا کہ ہوا موافق ہے اور پانچ دن میں جدّہ پہنچ جائیں گے ۔ تین دن تک چلتے رہے

اور معلّم جہاز کے اندازے کے مطابق جدّہ پہنچنے میں دو دن باقی رہ گئے تھے ، اچانک ڈیڑھ پاس رات گئے ، جہاز ایک پہاڑ کی چٹان سے ٹکرا گیا جو پانی میں چھپی ہوئی تھی ۔ اس سے ٹکراتے ہی جہاز پاش پاش ہو گیا ۔ جہاز میں پانی بھرنا شروع ہوا اور باہر سے موجیں آنے لگیں ۔ پانی کا تلاطم کبھی جہاز کو اچھالتا تھا کبھی پٹکتا تھا ۔ ایسا حال تھا جس کی شرح نہیں کی جا سکتی ہے

شب تاریک ، بیم موج ، گردابے چنیں حائل

کجا دانند حال ما سبکاران ساحل ہا

(اندھیری رات، موجوں کا خوف اور ایسے بھنور کا سامنا ۔ بھلا ساحل پر آرام کرنے والے ہماری اس حالت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ نوٹ : یہ حافظ شیراز کا مشہور شعر ہے)

اچھا لطف یہ کہ کسی کو بھی نہیں معلوم کہ یہ جگہ کونسی ہے، ساحل پر پہنچ کر ٹوٹا ہے یا بیچ راستے میں چکناچور ہوا ہے ۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون ۔

بہرحال صبح کے انتظار میں ایک ایک دم گن رہے تھے کہ اگر صبح کے برآمد ہونے تک جہاز بربادی سے بچ رہا تو معلوم ہوگا کہ قسمت کا بدا کیا ہے ۔ قیاس کرنا چاہیے کہ یہ رات کس جوکھم سے صبح ہوئی ہوگی ۔ غرض یہ کہ محافظ حقیقی نے جہاز کو بالکل تباہ ہونے سے محفوظ رکھا ۔

هرچند اندر ایک قد آدم پانی بھر گیا تھا لیکن سطح بچی رہی ۔ کیونکہ پہاڑ کی چوٹی پر اس سے زیادہ پانی نہ تھا ورنہ جہاز ڈوبے بغیر نہ رہتا ۔ مگر جہاز کے اردگرد تین طرف بہت زیادہ پانی تھا۔ صبح کو ظاہر ہوا کہ کنارے کا دور دور پتہ نہیں ۔ ہاں اتنے فاصلے پر کہ جہاں تک توپ کا گولہ جا سکے ، ایک چھوٹے سے جزیرے کا سراغ نظر آیا۔ ادھر پانی کم تھا۔ لوگ پانی میں کود پڑے کہ جس طرح بھی بن پڑے جزیرے تک پہنچ جائیں ۔ اس کا طول و عرض تقریباً پچاس بیگھہ کا نظر آیا۔ نہ وہاں پانی کا کنواں تھا ، نہ برگ و گیاہ ۔ نہ کوئی ایسا درخت جس کا میوہ کھایا جا سکے ۔ نہ ایسا جھاڑ جس کے سائے میں آرام کیا جا سکے ۔ سوائے گھونگھوں اور کنکریوں کے وہاں کچھ نہ تھا ۔ سامان و اسباب میں سے جو کچھ تھا وہ ہم نے سطح آب پر پھینک دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جو کچھ جاتا ہے وہ چلا جائے گا اور جو قسمت میں ہے ساحل سے آ لگے گا۔ ایسا ہی ہوا جو جانا تھا گیا ، جو بچنا تھا وہ آ گیا۔ بہرحال اب ڈوبنے کا خطرہ دل سے نکل گیا۔ اب یہ خوف رہا کہ اس جزیرے سے نکلنا بظاہر مشکل بلکہ محال ہے ۔ یہاں کھانے پینے کا سامان تو ہے ہی نہیں اور جہاز والے دو سو سے زیادہ ہیں ۔ پانی کے بہنے جو جہاز سے ساحل تک پہنچ سکے تھے صرف

آٹھ صد تھے ، باقی سمندر میں رہ گئے ۔ پھر یہ کہ جہاز
میں پانی بھر چکا تھا ۔ بیوپاریوں نے ہرچند چنا اور باجرہ
کافی مقدار میں بھر لیا تھا لیکن اس کا یہاں تک لانا مشکل تھا ۔
اور لے بھی آئیں تو پانی کے بغیر وہ کس کام آئے گا ؟ پانی پر تو
زندگی کا انحصار ہے ۔ مگر جب معاملہ تدبیر کی حدوں سے
نکل جائے تو کیا کریں ۔ چونکہ سب لوگ مرنے کے لیے آمادہ تھے ،
عافیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ایک چھوٹی
کشتی جو جہاز میں موجود تھی ، کسی طرف بھیجی جائے ۔ اگر ہم
لوگوں کی زندگی باقی ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سلامتی
کے ساتھ واپس آ جائیں ورنہ وہ سمندر میں مر جائیں گے اور ہم
یہاں خشکی میں ۔ یہ طے کر کے کشتی جہاز سے نکالی گئی اور ہم
میں سے دو آدمی جن میں ایک مولوی فضل علی اور دوسرے سعادت
خان سپاہی تھے ، اور تین دوسرے اشخاص اس میں سوار ہوئے اور اس
ناپیدا کنار سمندر میں کشتی چلا دی ۔

جہاز ٹوٹنے کے سولہ دن بعد جب ان کی واپسی نہ ہوئی تو یقین
ہوگیا کہ وہ سب ڈوب گئے ۔ ناگاہ دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں ۔
ہم نے سمجھا کہ یہ ہمارے ہی لوگ واپس آئے ہیں ۔ جب وہ نزدیک آئے
تو پتہ چلا کہ ہمارے لوگوں میں سے تو ان میں ایک بھی نہیں ۔

بہت حیرانی ہوئی ۔ بارے جب کشتی والے ساحل پر اترے تو
معلوم ہوا کہ وہ کشتی ایک ہفتے دریا میں پھرتی رہی اور آخر ساحل
قنفذہ پر سلامت پہنچی ۔ قنفذہ کے حاکم نے جیسے ہی یہ حال
سنا تو ان کے ساتھ چھ کشتیوں کو روانہ کیا جن میں سے دو یہ
ہیں ۔ اور باقی کشتیوں کے نہ آنے کا سبب یہ بتایا کہ تمہارے
لوگوں نے وہاں بحر عرب میں جہاز کا ٹوٹ جانا بیان کیا تھا ۔
چنانچہ وہ کشتی والے اسی سمندر میں کھوج لگا رہے ہوں گے ۔ ہم
تو اتفاق سے راستہ بھول کر یہاں آ گئے ہیں ۔ اس وقت یہ معلوم
ہوا کہ ہم بحر عجم میں ہیں ۔ سبحان اللہ کہاں سے کہاں آ پڑے ۔
بہرحال ان دو کشتیوں سے کیا ہو سکتا تھا ۔ ان راہ گم کردہ کشتیوں
کا انتظار کرنا ضروری ہوا ۔ جب چھ دن تک ان کا کوئی نشان نہ
ملا تو ان دونوں کشتیوں میں کچھ لوگوں کو سوار کر کے روانہ کیا ،
اس خیال سے کہ یہاں جتنے بھی کم لوگ رہیں اچھا ہے ۔ جو بھی
نکل جائے وہ تو نجات پا جائے گا ۔ باقی لوگوں کے لیے بھی خدا
کوئی سبب پیدا کر دے گا ۔ مجھے ان کشتیوں میں جانا اس لیے گوارا
نہ ہوا کہ اگر چلا جاؤں تو دوسروں کی دل شکنی ہوگی اور یہ
مروّت کے خلاف ہے کہ یہ بیچارے یہاں رہ جائیں اور میں نکل بھاگوں ۔
اسی لیے میں نے کہا کہ اگر یہاں ایک آدمی بھی رہے گا تو وہ میں

ہون گا ۔ دوسرے ہرچند بعض لوگون کو کشتی کے جانے سے خوف
لگتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا دل اسی طرح مطمئن
تھا۔ اس کشتی کے روانہ ہونے سے ایک ہفتے کے بعد دو کشتیان اور
نظر آ گئین ۔ خیال ہوا کہ یہ وہی کشتیان ہین جو راستہ
بھول گئی تھین ۔ لیکن ان کے نزدیک آنے پر کھلا کہ یہ وہ نہین
ہین ، بلکہ وہ کشتیان چند دن تک سمندر مین کھوج لگانے کے
بعد اور بحر عرب کے علاقے مین تلاش کر کے قنفذہ واپس پہنچ گئین۔
امیر قنفذہ نے اسی وقت انھین ڈانٹ کر پھر لوٹا دیا اور ایک
کشتی ساتھ کر دی اور کہا کہ یا تم گم شدہ مسافرون کا کوئی سراغ
لگاؤ ورنہ ان کی طرح تم بھی گم ہو جاؤ ۔ ہم اسی طرح پھر بحر
عرب مین ڈھونڈتے رہے اور کوئی نشان نہ ملا ۔ ناگاہ موجون کے
تلاطم نے ھمین وہان سے دور پھینک دیا۔ اب ہم بے خبری کے عالم
مین چلتے رہے ۔ اچانک دور سے جزیرہ نمودار ہوا۔ ہم یہان آئے
تو ہم نے یہ کچھ دیکھا۔ یہ دونون کشتیان اگرچہ پہلی کشتیون سے
بھی چھوٹی تھین لیکن اب کی بار یہی طے ہوا کہ سب لوگ سوار ہو
جائین اور جتنا ہو سکے سامان ساتھ لے لین ، باقی چھوڑ دین ۔ مگر
ہم نے مزید دس دن تک ان تین کشتیون کے آنے کا انتظار کیا۔ کچھ
تیز ہواؤن کا چلنا اور موجون کا تلاطم بھی مانع سفر ہوا۔ بہرحال دس

دن کے بعد اللہ پر بھروسہ کر کے روانہ ہو گئے ۔ اگرچہ راستے میں موجوں کی طغیانی سے جو کچھ پیش آیا، اس سے یہ یقین نہ تھا کہ ہم کنارے تک سلامت پہنچ جائیں گے ، مگر عنایت الہی نے ساحل تک پہنچا دیا ۔ وہاں چھ دن قیام کیا ۔ پھر خشکی کے راستے سے چار دن میں حرم شریف پہنچے (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے) ۔

اب اس سے پہلے کہ اور کچھ بیان کروں، اس آیت کے مطابق کہ (اور اللہ کی نعمتوں کا چرچا کیا کرو) چند نعمتوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس منعم حقیقی کی طرف سے اس ناچیز کو ملیں ۔ ہرچند نعمتوں کا بیان میرے بس کی بات نہیں کیوں ہر آن ہزاروں نعمتیں اس وجود پر نازل ہوتی ہیں، لیکن ان میں سے دو تین کا شمار کرتا ہوں ۔ پہلی یہ کہ جہاز ٹوٹنے کے وقت سے اس وقت تک جب ہم جزیرے سے نکلے مجھے مرتبۂ تسلیم و رضا حاصل رہا کہ زبان سے سوائے شکر اور حمد کے دوسری بات نہیں نکلی ۔ اور گھبراہٹ سے تو کوسوں دور رہا ۔ ورنہ انسان ضعیف البنیان ہے اسے اتنی تاب کہاں ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ جہاز جزیرے کے قریب ہی ٹوٹا ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی ۔ تیسرے یہ کہ اس جزیرے میں آب و دانہ کے بغیر بھی ہمیں زندہ سلامت رکھا ۔ پانی کا قصہ تو میں نے سنایا ہی نہیں ، کہاں تک کہوں، بات طویل ہو جائے گی ۔ مختصر یہ ہے کہ اسی زمانے

میں بارش ہوگئی اور اس کے پانی سے ہم دو تین دن تک سیراب ہوئے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے یہ حکمت ذہن میں آئی کہ سمندر کے پانی کو عرق کی طرح کشید کرکے پیا جائے ۔ اس طرح وہ میٹھا ہوجاتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ایک ایسے جزیرے میں، جو جہازوں کی آمدورفت سے ہٹا ہوا تھا، ہمیں سلامتی کے ساتھ نکال لیا اور اس طرح کہ اہل جہاز میں سے ایک شخص بھی نہیں مرا۔ پانچویں نعمت یہ کہ ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں خوب لد پھند کر لوگ بیٹھے اور ساحل تک پہنچ گئے ۔ چھٹے یہ کہ کعبۂ مراد کی زیارت نصیب ہوگئی، اور یہ ساری نعمتوں سے افضل ہے ۔

بھائی جب سے اس مقام مقدّس میں وارد ہوا ہوں جو فرحت و سرور مجھے حاصل ہے روئے زمین کے بادشاہوں میں بھی کسی کو نصیب نہ ہوگا، اور کیوں نہ ہو میں نے اسی دنیا میں جنت کی زیارت کرلی۔ اب تو صرف ان لوگوں کے حال پر حسرت ہے جو یہاں تک نہ پہنچ سکے، خصوصاً تمہارے حال پر ۔

تجھی کو جو یہاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

خدا کی قسم ایسا ہی ہے ۔ یہ بیت خواص کے لیے بھی ہے اور عوام کے لیے بھی ۔ البتہ عوام کے لیے خطاب کعبہ سے ہوگا اور لفظ " یہاں "

سے مراد یہ دنیا ۔ اور خواص کے لیے مخاطب ربّ کعبہ اور یہاں سے مقصود کعبۂ معظم ۔ اگرچہ ان باتوں کا لکھنا فخر و ریا پر محمول کیا جا سکتا ہے (خدا اس سے محفوظ رکھے) لیکن تمہارے معاملے میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے ۔ زیادہ کہاں تک لکھوں اور لکھنے کا موقع بھی کیا ہے ۔ لہذا ختم کرتا ہوں ۔ والسلام مولوی فضل علی اور سعادت خان کا قصہ بھی بہت طویل ہے ۔ اب لکھنے کے لیے دماغ وفا نہیں کرتا ۔ بہرحال خیریت سے رہے اور ہمارے پہنچنے کے چند دن بعد وہ بھی یہاں آ گئے ۔ اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں پر ۔"

محررہ یکم ذی الحجۃ ۱۲۵۵ھ (مطابق ۵/فروری ۱۸۴۰ء)

(ج) رقعات فارسی (لحن عراق)

۱۔ ترتیب و اشاعت :

شیفتہ نے اپنے رقعات فارسی " لحن عراق " کے نام سے خود ہی ۱۲۸۳ھ (مطابق ۶۷-۱۸۶۶ء) میں مرتب کیے تھے ، لیکن ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکے ۔ رقعات سے پہلے انھوں نے ایک دیباچہ لکھا ہے ۔ طویل نثری حمد و نعت کے بعد انھوں نے رقعات کا سبب جمع و ترتیب بھی بیان کیا ہے اور رقعات کے عنوان و سن ترتیب و جمع کی وضاحت بھی

کر دی ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ رقعات میں جو اشعار جابجا ملتے ہیں وہ بیشتر انھی کے ہیں اور جو شعر ان کا نہیں ہے اس کی وضاحت حاشیہ میں کر دی گئی ہے ۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :

" در ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ
بستم آئین این نگارین نامہ را
آئینہ طبعی بہار اندیشہ"
بو کہ روزی بیند این ہنگامہ را
ریختم سیارہ از نوک قلم
گلفشان کردم صریر خامہ را

تبصرہ ۔ درین دیباچہ ہمہ اشعار راقم است و در مکاتبات آنچہ مخلوط ہم از نامہ نگارست و ہم از سخن طرازان دیگر امتیاز را مصلحت افتاد کہ بر ابیات خود علامتی نگارش نہ پذیرد و شعار اشعار یاران نام شان باشد و بر حاشیہ رقم شود و بر تقدیر عدم علم از نام از قبیل الفاظ لاادری و لااعلم حوالہ قلم شود و مکتوب اگر اطول است دگر اقصر نامہ نام بردہ شود و شمار نامہ و نام مکتوب الیہ در متن مثبت افتد و اگر نام مکتوب الیہ از نخست در مسودات نباشد صرف بر شمار نامہ اکتفا رود و این مجموعہ لحن عراق نام یافت و رقم سنج این نسخہ محمد الشہیر بمصطفیٰ ختم للہ لہ بالحسنی متخلص بہ

شیفتہ در ریختہ و بحسرتی در فارسی۔[1]،،

یہ خطوط پہلی بار ۱۸۸۷ء میں دیوان فارسی کے ساتھ شیفتہ کے بیٹے جناب محمد علی خان نے مطبع نیو امپیریل پریس ، لاہور سے شائع کرائے ۔ خطوط کی تعداد ۵۷ (ستاون) ہے اور مع دیباچہ صفحہ ۱ سے صفحہ ساٹھ تک پھیلے ہوئے ہیں ۔

دوسری بار یہ خطوط ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ و حسرتی (اردو و فارسی) کے ساتھ شیفتہ کے دوسرے بیٹے جناب نواب محمد اسحق خان نے نظامی پریس بدایوں سے شائع کرائے ۔ اس کے بعد معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ خطوط کبھی شائع ہوئے ہیں یا نہیں ۔ ان خطوط کا ایک کرم خوردہ اور نہایت ہی بوسیدہ مخطوطہ جو خلیل الرحمن داؤدی صاحب کی ملکیت ہے میرے پاس بطور امانت ہے ۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب مرتب کیا گیا اور کس نے لکھا؟ مخطوطہ خوش خط لکھا ہوا ہے لیکن بوسیدگی اور خستگی کی وجہ سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ " لحن عراق ،، کے بارے میں حبیب اشعر فرماتے ہیں :

" لحن عراق شیفتہ کے ستاون فارسی رقعات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے انتقال سے تین برس پہلے ۱۲۸۳ھ میں مرتب کیا تھا اور کلیّات حسرتی و شیفتہ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں میں شامل ہے ۔ اس میں دس خط غالب کے نام ہیں ۔ سات آزردہ کے نام، سات نواب عبداللہ خان کے نام، ... تین مومن کے نام،

۱۔ رقعات فارسی (لحن عراق) ص ۷، ۸، از نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ، طبوعہ ۱۸۸۷ء

تین حکیم احسن الله خان کے نام، ایک مولانا فضل حق خیرآبادی کے نام، ایک مولانا فضل الله کے نام، ایک میر جھجّو جان صاحب کے نام اور چوبیس خط ایسے هین جن مین مکتوب الیهم کے نامون کی صراحت نهین کی گئی - یه خطوط اگرچه ذاتی اور نجی هین لیکن ان مین بھی کهین کهین شعر و ادب اور علم و تصوف کے لطیف نکات آ گئے هین - " بهره آورد " کی طرح " لحن عراق " بھی شیفته کی فارسی نثر کا اعلیٰ نمونه هے - "[1]

مس صفیه عبدالحق فرماتی هین :

" --- خطوط زیاده تر علمی مضامین کے حامل هین - زیاده تر خطوط اسدالله خان غالب اور مفتی صدرالدین آزرده کے نام هین - اس کتاب سے شیفته کی فارسی زبان مین انشا پردازی اور بلاغت کا اظهار هوتا هے - ان خطوط سے پته لگتا هے که شیفته صرف ایک ناظم هی نه تھے بلکه ایک ناثر کی حیثیت سے بھی بلند درجے کے مالک تھے - اس مجموعے مین صرف منتخب خطوط هین - "[2]

۱- دیوان شیفته ، ص ۲۸۵ ، مرتبه حبیب اشعر

۲- نواب مصطفیٰ خان شیفته (مقاله ایم - اے) ، ص ۱۹

۲- انداز تحریر:

خطوط نہایت صاف اور شستہ مروّجہ فارسی مین لکھے گئے ھین - القاب و آداب مختصر ھین - بعض خطوط مین بہت علمی نکات پر روشنی ڈالی گئی ھے - بعض مین تصوف کا ذکر بھی آ گیا ھے اور بعض خطوط شیفتہ کے مختلف حالات پر روشنی ڈالتے ھین - ہر جگہ انداز عالمانہ ھے - جیساکہ مندرجہ بالا سطور مین بیان کیا گیا ھے کہ یہ خطوط بھی شیفتہ کی فارسی نثر نگاری اور انشا پردازی کا بہترین نمونہ ھین - اسلوب بیان دلکش اور تصنّع سے پاک ھے - ان خطوط سے ان کی فارسی دانی اور زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ ھوتا ھے -

۳- ذاتی عنصر - شخصیت کا عکس:

شیفتہ نے اپنے نجی خطوط کو " لحن عراق ،، کی شکل مین مرتب کیا ھے - معلوم ھوتا ھے یہ خطوط منتخب خطوط ھین - ان خطوط سے مکتوب الیھم کے ساتھ شیفتہ کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ھوتا ھے - غالب کے نام دس خط ھین جو مختلف اوقات مین لکھے گئے ھین - کچھ خطوط سفر حج کے دوران لکھے گئے ھین جن سے مقصود یہ ھے کہ غالب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دی جائے - کچھ خطوط غالب کے خطوط کے جواب مین لکھے گئے ھین - غالب عام طور پر شیفتہ کو فارسی زبان ھی مین خط لکھا کرتے تھے اور شیفتہ بھی

حسب عادت فارسی زبان ھی مین جواب دیا کرتے تھے ۔ شیفتہ کا ایک خط مقالے کے صفحہ ۱۱۳ پر نقل کیا گیا ھے جو انھون نے غالب کے خط کے جواب مین لکھا ھے اور جس سے معلوم ھوتا ھے کہ شیفتہ عشق مجازی سے تائب ھو کر عشق حقیقی کی طرف مائل ھو چکے ھین۔ کچھ خطوط غالب اور مومن کے نام ایسے ھین جو انھون نے جے پور سے اپنے سفر حج کے دوران لکھے ھین اور جن مین اپنے قیام اور دیگر حالات کے بارے مین بتایا ھے ۔ غالب و مومن سے وہ صرف مشورۂ سخن ھی نھین کرتے تھے بلکہ یہ دونون حضرات شیفتہ کے ذاتی حالات سے بھی واقف تھے ۔ وہ خطوط جن پر مکتوب الیھم کے نام درج نھین ھین، حبیب اشعر کا خیال ھے کہ ان مین سے کچھ خطوط ایسے ھین جو رمجو نزاکت کو لکھے گئے ھین ۔ خطوط کے قرائن سے بھی یھی اندازہ ھوتا ھے ۔ حبیب اشعر کے الفاظ مین :

" لحن عراق مین جو خطوط مکتوب علیھم کے نامون کی صراحت کے بغیر شائع ھوئے ھین ان مین سے اٹھ خط قیاس کھتا ھے کہ رمجو کے نام ھین۔[1]،،

شیفتہ کی شخصیت کے مختلف پھلوؤن پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ھے ۔ ان کا علمی رکھ رکھاؤ اور وقار ظاھر ھوتا ھے، ان کی زندگی کے بھت سے نشیب و فراز کا پتہ چلتا ھے، ان کی علمیت و قابلیت کا اندازہ ھوتا ھے ۔ ذاتی اور نجی خطوط ھی ایسی چیز ھین جن مین بناوٹ نھین ھوتی، جو بات ھے وہ بلا خوف تردید دل سے نکلتی ھے ۔ دوستون سے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ھوتا ھے کیونکہ جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو

۱۔ دیوان شیفتہ ، ص ۲۷۳، مرتبہ حبیب اشعر

خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسااوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے ۔ وہ اپنی رائے میں آزاد اور بیباک ہوتا ہے ، نہ دوسروں سے چوکتا ہے نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے ۔ اس وقت اسے نہ خوف لائم ہوتا ہے نہ نکتہ چیں کا کھٹکا ۔ شیفتہ کے خطوط میں بھی یہی رنگ ہے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو نکھر کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں ۔

(د) چند نوادر

۱۔ وصیت نامہ :

شیفتہ کی اردو نثر عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی ، لیکن یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب وہ ریختہ میں شاعری کر سکتے ہیں تو ریختہ میں کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں نثر بھی لکھی ہوگی ۔ اس کے دو نمونے ہمارے سامنے ہیں ۔ ایک ان کے وصیت نامے کی شکل میں جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دوران حبس تحریر کیا ، اور دوسرا نمونہ غالب کی " تیغ تیز " میں ملتا ہے جس میں شیفتہ نے غالب پر کیے گئے اعتراضات کا جواب اردو زبان میں دیا ہے ۔ شیفتہ کے وصیت نامے کی خبر نظامی بدایونی سے ملتی ہے ، وہ فرماتے ہیں :

" جن ایام میں نواب صاحب باشتباہ بغاوت قید و بند میں مبتلا تھے ایک وصیت نامہ بنام مہین فرزند محمد علی خان صاحب و

غیرهم تحریر فرما دیا تھا اس مین بنظر انتظام جملہ متعلقین و

متوسلین کے لیے مقدار مصارف بالتفصیل معین کر دی تھی ۔

دیون کے ادا کرنے کی تاکید تھی --- آپ نے اس وصیت نامہ مین

منجملہ دیگر امور کے رمضان شریف کے روزون کے قضا کا حساب اور

اس کے کفارے کے ادا کی تاکید جن الفاظ مین لکھی ہے وہ یہ ہین :

" میرے اوپر رمضان شریف کے روزے ہین ، خوب یاد نہین مگر احتیاطاً

دس رمضان کے لکھ لینا جس کے دس مہینے ہوئے ۔ ہر روزہ کی بابت ایک

شخص مسلمان کو دو سیر گندم چاہئین ، جس کے مہینے کے ڈیڑھ من ہوئے

تو دس مہینے کے پندرہ من ہوئے ۔ ان کا دینا ضرور ہے مگر میری موت

کے بعد کس واسطے کہ زندگی مین یہ کفارہ ادا نہین ہوتا ۔ پس جب میری

موت کا حال سن لو جو شخص اس وقت مین زندہ ہو پندرہ من گیہون

کہ ایک ایک فقیر کو دو دو سیر گیہون دے ۔" [1]

محمد ایوب قادری فرماتے ہین کہ نظامی بدایونی مرحوم کا ایک مقالہ دسمبر

۱۹۱۸ء مین ماہنامہ " زمانہ کانپور " مین " نواب مصطفٰی خان شیفتہ " شائع ہوا ہے ۔

اس مین اس وصیت نامہ کی چند سطور کا عکس بھی شائع ہوا ہے ۔ اس سلسلے مین منشی

دیا نرائن نگم آنجہانی (ف ۱۹۴۲ء) نے یہ سطور لکھی ہین :

" یہ وصیت نامہ جناب مولوی نظامی صاحب بدایونی کی عنایت سے

---

۱ ۔ کلیات شیفتہ و حسرتی ، ص ۱۲ ، ۱۳ ، مرتبہ نظامی بدایونی (حضرت شیفتہ کے مختصر حالات)

(*)
ھمین ملا ھے ۔ اگرچہ وصیت نامہ نامکمل ھے اور آخر مین شیفتہ صاحب
کے دستخط بھی نہین ھین لیکن نظامی صاحب نواب اسحق خان صاحب
مرحوم کی شناخت و تصدیق کا حوالہ دے کر تحریر فرماتے ھین کہ جب
شیفتہ ۱۸۵۷ء کے ھنگامے مین محبوس ھوگئے تھے، انھون نے یہ وصیت نامہ
اپنے صاحبزادے محمد علی خان کو جیل سے لکھ کر بھیجا تھا۔[۱]،،

وصیت نامہ کا متن درج ذیل ھے:

" یہ وصیت نامہ ھے عبد گنہگار کی طرف سے بنام محمد علی و شیخ
عبد اور میثذ ھو اور رشید اور عظیم کے کہ اس کے موافق عمل کرین اور
جو کوئی عمل نہ کرے گا گنہگار ھوگا۔ امید ھے خدا کے فضل سے
کہ علاقہ مل جاوے گا، اگر نہ ملا تو کچھ کلام نہین ۔ مگر امید
ھے کہ مل جائے گا۔ تین سو روپے ماھوار کا خرچ رکھین ۔ اس سے زیادہ
ایک خرمہرہ نہین چاھیے اور اس تین سو کو اس طرح پر صرف کرین کہ
(۸۰) روپے ماھواری گھر مین دینا چاھیے والدہ محمد نقشبند کو، اور
چالیس روپے محمد علی اپنے صرف مین لائے ۔ ایک گھوڑا اور دو خدمتگار
اور دیگر ضروریات کو بالفعل کافی ھین ۔ تین برس کے بعد کچھ بڑھانا

(*) نوٹ: محمد ایوب قادری " جنگ آزادی ۱۸۵۷ء،، ص ۳۹۷ پر فرماتے ھین کہ وصیت نامہ تو مکمل ھے کیونکہ آخر مین دعائیہ کلمات درج ھین، البتہ شیفتہ کے دستخط نہین ھین ۔"

ممکن ھے جیل مین ھوتے ھوئے کسی قانونی گرفت کے اندیشے سے شیفتہ نے دستخط نہ کیے ھون اور رازدارانہ طریقے پر وصیت نامہ اپنے بیٹے کو بھجوایا ھو۔(مقالہ نگار)

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۳۹۶، محمد ایوب قادری

ہو بڑھا لینا ۔ اور شیخ عبد اور میٹھو اور رشید اور عظیم کے سب کاروبار سپرد کر دینا ۔ یہ چاہیں جس طرح انصرام کریں ۔ تیس روپے ماہواری شیخ عبد کو، بیس روپے ماہواری میر صاحب کو اور پندرہ روپے رشید کو اور آٹھ روپے عظیم کو اور تین روپے کریم بخش کو اور چار روپے محمد بخش کو، یہ سب اسّی روپے ہوئے اور گھر کا اور محمد علی کا خرچ لگا دو سو روپے ماہواری ہوا ۔ سو روپیہ مہینہ علاقہ کے خرچ کو مع سپاہیوں اور متصدّی اور خرچ آئندہ و روندہ وغیرہ کو کافی ہے ۔ اور میر صاحب کی اوقات بسری (۲۰) ماہواری میں نہ ہو تو یہ سو روپے جو علاقہ کے خرچ کے واسطے ہیں ان میں سے پانچ روپے اور بڑھا دینا ۔ اور اس خرچ کے بعد جو کچھ بچے اس سے میرا قرض جو صحیح ہے وہ ادا کرنا ۔ صحیح قرض سے یہ مطلب کہ سود دینا نہیں چاہیے، اصل لینا بھی غنیمت ہوگا ۔ اور جس کا روپیہ ادا کرو اس سے باقی کی معافی کرا لینا ۔ چھٹے بنیے (کے) پاس اگرچہ تمسک ہے لیکن اس کا روپیہ صحیح نہیں ، کچھ نہ دینا ۔ کیوں کاشی کا روپیہ سود کا ہے جس کے رقعے ہیں اس کا دینا نہیں چاہیے ۔ مگر چار سو روپے کاشی کے جواب لیے تھے دینا ضرور ہے ۔ محمد علی خان کی معرفت کا روپیہ بلاسود ادا کر دینا ۔ مولوی مظہر علی کی امانت کا زیور چھڑا کر مع ان کے روپیوں کے ان کے گھر پہنچا دینا ۔ قلندر شاہ کی امانت بارہ اشرفیاں ہیں یا چھ ہیں مجھے

یاد نہین، غرض جو وہ مانگین دے دینا۔ ساھوکارون کے حساب مین سود کا روپیہ اصل مین شامل ہوگا، ان سے معاملہ اگر نصف مین کرو گے تو ہو جائے گا کس واسطے کہ وہ تو روپیہ پڑا پاتے ہین کسی طرح لے تو سکتے ہی نہین اس واسطے بخوشی معاملہ کر لین گے، مگر بعد معاملے کے معاف ضرور کرا لینا۔ منشی زور آور سنگھ کا تمسک تین ہزار روپے کا ہے۔ پندرہ سو روپے پر اگر معاملہ کر لو گے تو ہو جاوے گا۔ میرے نزدیک دو ہزار روپیہ اس کا واقعی چاہیے۔ اور جن لوگون نے سال گزشتہ مین قسط کے واسطے کہا تھا ان کا روپیہ سب ادا کرنا کہ ان سے نیا معاملہ ہوا ہے۔ اس مین سود شامل نہین، سود نہ دینا۔ مولوی مظہر علی کی امانت دام دام ضرور ادا کرنا۔ جو کوئی اس ساری وصیت پر عمل نہ کرے گا خدا کا گنہگار ہوگا۔ اور حساب سب ساھوکارون کا مجھے اس‌وقت یاد نہین کہ مفصل لکھون۔ تم کو تحقیقات سے معلوم ہو جاوے گا۔ کھتّا پیش‌کار کو بھی نصف کے قدر بلکہ کم دینا۔ اور قصاب کے اور بندہ بزاز دھلی کے روپے ہین۔ وہ دام دام ادا کر دینا۔ اسی طرح سے جس کسے حساب ــــ کا روپیہ ہو وہ سب ادا کرنا۔ ان سب کا حساب رشید کے پاس ہے۔ غرض کے میرے اوپر کسی کا واجبی حق نہ رہ جاوے۔ اور چھوٹی ہمشیرہ بخشی سے جو کچھ حصہ ان کا میری طرف بابت جہانگیرآباد کے ہو بخشوا لینا۔ اور میرے اوپر رمضان شریف کے روزے ہین، خوب یاد نہین

مگر احتیاطاً دس رمضان کے رکھ لینا جس کے دس مہینے ہوئے ۔ ھر روز ے کی بابت ایک شخص مسلمان کو دو سیر گندم چاھیے جس کے مہینے کے ڈیڑھ من ہوئے تو دس مہینے کے پندرہ من ہوئے ۔ ان کا دینا ضروری ھے ۔ مگر میری موت کے بعد کس واسطے کہ زندگی میں یہ کفارہ ادا نہیں ہوتا ۔ پس جب میری موت کا حال سن لو ۔ جو شخص اس وقت میں زندہ ہو پندرہ من گیہوں لے، ایک ایک فقیر کو دو دو سیر گیہوں دے ۔ اتنی باتیں تو اس وقت یاد رھیں ۔ آگے اور جو کچھ یاد آ جائے گا اور موقع تحریر کا ھاتھ لگا تو لکھوں گا ۔ ھر گھر کی ھر طرح سے حفاظت بہت چاھیے ۔ مقدمہ ناموس کا ھے جہاں تک بنے اس کی حفاظت رکھیں ۔ ان سب باتوں پر سب صاحب عمل کریں ۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ۔

اور ایک ضروری بات رہ گئی ۔ والدہ نقش بند کا دس ھزار کا مہر ھے۔ جس طرح اور لوگوں کا ادا کیا جاوے یہ بھی کیا جاوے ۔ غرض کہ خدا کے واسطے کسی کا حق میرے ذمّے نہ رھے ۔ اگرچہ یہ تحریر میری آج مثل شیخ چلی کی باتوں کے ھے مگر خدا کے فضل سے مجھے امید واثق ھے کہ علاقہ مل جاوے گا ، اس وقت یہ سب باتیں ھو سکتی ھیں ۔ جو کچھ اب یاد آیا ، آگے جو کچھ لکھنا ہوگا لکھوں گا ، انشاء اللہ ۔ اور جو کچھ خداوند مجھکو ـــ اس کی بڑی عنایت ہوگی ۔ و آخر

دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ۔[1]"

محمد ایوب قادری اس وصیت نامہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وصیت نامہ بوجوہ ذیل خاص اہمیت رکھتا ہے :

" ١۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی کوئی اردو نثر کی تحریر اس وصیت نامہ کے سوا نہیں ملتی[*] ۔

٢۔ جنگ آزادی ١٨٥٧ء کے متعلق ایک ہم عصر دستاویز ہے ۔

٣۔ اس وصیت نامہ میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے حالات اور ان کی مذہبی زندگی پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے ۔

٤۔ اس وصیت نامہ میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے فرزند محمد علی خان اور نقش بند خان کا ذکر ہے ، مکان اور علاقے کا انتظام ، قرض کے ادا کرنے اور رمضان کے قضا روزوں کا کفارہ ادا کرنے کی ہدایات درج ہیں ۔

ہمیں یہ وصیت نامہ مولوی وحیدالدین مالک نظامی پریس بدایوں ابن مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی مرتب " کلیات شیفتہ و حسرتی "

١۔ جنگ آزادی ١٨٥٧ء (واقعات و شخصیات) ، ص ٣٩٨ ، محمد ایوب قادری

(*) نوٹ: وصیت نامہ کے علاوہ بھی ایک اور مثال شیفتہ کی اردو نثر نگاری کی غالب کی " تیغ تیز " میں اعتراضات کے جواب کی صورت میں ملتی ہے ، جو آئندہ صفحات میں نقل کی جا رہی ہے ۔ (مقالہ نگار)

سے ملا ہے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب ۱۹۱۲ء میں " کلیات شیفتہ و حسرتی ،، نظامی پریس بدایون سے شائع ہوا تو اس وقت کلیات کا مسوّدہ اور بعض دوسرے کاغذات جو نواب محمد اسحاق کے یہاں سے آئے ان میں یہ وصیت نامہ بھی ہوگا اور یہ نظامی پریس بدایون ہی میں رہ گیا۔،،[1]

۲۔ تیغ تیز از غالب میں مندرج شیفتہ کے جوابات :

خلیل الرحمن داودی فرماتے ہیں کہ مرزا غالب " قاطع برہان ،، کی مخالفت میں " محرق قاطع برہان ،، مصنفہ سید سعادت علی ، " ساطع برہان ،، مصنفہ مرزا رحیم بیگ میرٹھی ، " قاطع القاطع ،، مصنفہ امین الدین پٹیالوی کے علاوہ آغا احمد علی نے بھی " موید برہان ،، لکھی تھی --- " موید برہان ،، کو دیکھ کر غالب نے اس کے جواب میں ۳۲ صفحات کا ایک مختصر رسالہ بہ عنوان " تیغ تیز ،، لکھا --- " تیغ تیز ،، میں ۱۷ فصلیں ہیں ۔ اوّلین ۱۲ فصول میں مولوی احمد علی صاحب پر ایک ایک کر کے اعتراضات کیے ہیں اور ساتھ ساتھ ان اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں ۔ آخری یعنی سترھویں فصل میں " برہان قاطع ،، پر چند اور اعتراضات کیے ہیں جو " قاطع برہان ،، میں درج ہونے سے رہ گئے تھے ۔ ان ۱۷ فصول کے بعد ادبی استفتا ٗ ہے، جس میں ۱۲ سوالات ہیں ۔ ان

۱۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ، ص ۳۹۳ ، محمد ایوب قادری

کے جوابات نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ نے دیئے ہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی، مولوی سعادت علی خان اور نواب ضیاء الدین احمد خان نیر و رخشان نے ان جوابات کی تصدیق و تائید کی ہے ۔[1]

وہ سوالات اور جوابات جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

" پہلا سوال : لغت فارسی کی حقیقت اور حروف کی حرکت میں فردوسی و خاقانی سچے ہیں یا ہندوستانی فرہنگ لکھنے والے؟ (مصنف)

جواب: فردوسی و خاقانی سچے ہیں، ہندوستانی ان کے مطابق لکھیں تو سچے، ان کے برخلاف لکھیں تو جھوٹے ۔ محمدالمدعوبہ مصطفیٰ ۔

دوسرا سوال : پیدائی و زیبائی صحیح اور پیدائش و زیبائش غلط یا یہ چاروں لفظ صحیح ؟ (مصنف)

جواب: چاروں صحیح ، محمد المدعوبہ مصطفیٰ

تیسرا سوال : راند و ماند بر وزن چاند صحیح ، بروزن زند و مند لہجہ ہے، اصل میں بوزن تند و کند نہیں ۔ (مصنف)

جواب: راند وماند بر وزن چاند صحیح ، بر وزن رند و کند لہجہ ہے، محمد المدعوبہ مصطفیٰ اصل میں بوزن تند و کند ۔

---

۱ - مجموعہ نثر غالب (اردو) ، ص ۱۸۷، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی

چوتھا سوال : چشم کی صفت " عیب بین ،، صحیح یا " عیب ساز ،، ؟(مصنف)

جواب : " عیب ساز ،، غلط محض اور جو آنکھ کو " عیب ساز ،، کہے وہ احمق بلکہ اندھا ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

پانچوان سوال : فرہنگ نویس حال کی رائے اگر فرہنگ نویس ماضی کی رائے سے مطابق ہو، خواہی ، بحسب اتفاق ، خواہی از روئے مشاہدہ، یہ سرقہ ہے یا تطابق رائے ؟ (مصنف)

جواب : یہ تطابق رائے ہے، سرقہ سے کیا علاقہ ؟ محمد المدعوبہ مصطفیٰ

چھٹا سوال : " شش ضرب نتیجہ خوب،، شکر و عسل و گوہر و زر و مشک و اقسام میوہ کو کہہ سکتے ہین یا نہین؟ (مصنف)

جواب : معاذ اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ کون کہہ سکتا ہے مگر کوئی دیوانہ کہے یعنی ان چھ چیزون کو " شش ضرب نتیجہ خوب ،، نہ لکھین گے، مگر اور کوئی چھ باتون کو لکھین تو لکھین ۔ محمد المدعوبہ مصطفیٰ ۔

ساتوان سوال : یہ مصرع وزن شعر مین درست ہے یا ناموزون؟

" چشم مخالفان بیا زن بہ تیر ،، (مصنف)

جواب : مصرع ہو تو کچھ لکھون، فقرہ ہے، اس کو وزن سے کیا علاقہ ؟ محمد المدعوبہ مصطفیٰ ۔

آٹھوان سوال : آهنگیدن کا صیغۂ ماضی آهنگید ہوگا یا فقط آهنگ؟ (مصنف)

جواب : آهنگید ہو سکتا ہے نہ آهنگ ۔ محمد المدعوبہ مصطفیٰ ۔

نواں سوال : پالوایہ ایک لغت ھے ، فرھنگ نویس کو اس کا ھم وزن چارپایہ لکھنا چاھیے یا چارخایہ ؟ (مصنف)

جواب : وزن دونوں صحیح ھیں لیکن چارپایہ لکھنے والا آدمی ھے اور چارخایہ لکھنے والا چارپایہ ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

دسواں سوال : " گرازان " بمعنی " خرامان " بکاف فارسی مضموم ھے یا " کراران " بکاف عربی مکسور بر وزن صفاھان ؟ (مصنف)

جواب : " گرازان " بمعنی " خرامان " بکاف فارسی مضموم صحیح اور بکاف عربی مکسور غلط محض ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

گیارھواں سوال : کروہ و فرسخ و فرسنگ فارسی میں مقدار مسافت زمین کو کہتے ھیں ، عربی میں کراع بر وزن صراح مقدار مسافت زمین کو کہتے ھیں یا پاچۂ گاو و گوسپند کو ؟ (مصنف)

جواب : صراح میں بمعنی پاچۂ گاو و گوسپند لکھا ھے ، بہ معنی مسافت غلط محض ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

بارھواں سوال : گلہری بکاف فارسی مکسور بر وزن اکھری صحیح یا کلہری بکاف عربی مفتوح بر وزن ابتری صحیح ؟ (مصنف)

جواب : گلہری بکاف فارسی مکسور صحیح ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

تیرھواں سوال : ھندوستان میں دختر نارسیدہ کو " چھوکری " کہتے ھیں ، اھل ولایت " چوکری " کہیں گے بحذف ھائے مضمرہ ، " چکری " بحذف واو غلط

ہے یا صحیح ؟

جواب: " چکری " جو اہل ولایت سے بھی زیادہ بدلہجہ ہوگا، وہ شاید کہے ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

چودھواں سوال: " پا " اور " پای " بہ اضافۂ تحتانی جس کو عربی میں " رجل " کہتے ہیں، ہندی میں اس کا نام پانو مع النون ہے یا پاؤ بے نون (مصنف)

جواب: " پانو " کو " پاو " نہ کہے گا مگر مجنون ۔ محمد المدعو بہ مصطفیٰ ۔

پندرھواں سوال: پریشیدن مصدر جعلی ہے بنایا ہوا لفظ پریشان سے، جز بائے زائدہ اس کے ماقبل لا کر بپریشیدن کہو، بپریشیدن بہر دو بائے فارسی بھی انھیں معنوں میں کہیں آیا ہے یا نہیں ۔ (مصنف)

جواب: کہیں نہیں آیا، اس میں ذہن کو پریشان کرنا کیا ضرور؟

محمد المدعو بہ مصطفیٰ

سولھواں سوال: " خانہ سیل ریز " شراب انگور کو کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ (مصنف)

جواب: " سیل خانہ ریز " شراب کی صفت ہو سکتی ہے، انگوری کی قید بے جا اور " خانہ سیل ریز " مہمل اور غلط اور خبط ۔

راقم محمد المدعو بہ مصطفیٰ ختم اللہ لہ الحسنیٰ

سب جواب مجیب کے صحیح ھین -

الطاف حسین پانی پتی عفی اللہ تعالیٰ عنہ

سب جواب دونون مجیبون کے باصواب ھین -

محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ اسکول ، دھلی

ھر شانزدہ گانہ سوال کے جواب مین مین بھی محمد نواب مصطفیٰ خان صاحب کا ھم زبان و ھم داستان ھون -

الراقم الآثم محمد الملقب بہ ضیاء الدین عفی عنہ "[1]

مندرجہ بالا جوابات جو شیفتہ نے اردو زبان مین دیئے نہایت برجستہ ھین - ان جوابات کی جامعیت اپنی جگہ مسلّم ھے اور شیفتہ کا تنقیدی شعور قابل تحسین ھے - شیفتہ کی اردو تحریر کمیاب ضرور ھے ، لیکن مندرجہ بالا تحریرون سے اندازہ ھوتا ھے کہ انھین اردو زبان پر بھی قدرت اظہار و بیان حاصل تھی -

۳- تقریظ دیوان مومن :

شیفتہ کی یہ تقریظ جو دیباچہ کے عنوان سے کلیات مومن مین شامل ھے فارسی زبان مین ھے - کلب علی خان فائق رامپوری فرماتے ھین کہ مومن کا اردو کلام سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ (مطابق ۲۸-۱۸۲۷ء) مین جمع کیا اور اس پر

۱- مجموعہ نثر غالب (اردو) ، ص ۲۱۷ ، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی -

ایک دیباچہ لکھا ۔[1] شیفتہ فرماتے ہیں کہ جب ۱۲۴۳ھ (مطابق ۲۸-۱۸۲۷ء) میں مومن کا دیوان مرتب کیا تو مومن کی عمر انتیس (۲۹) سال کی تھی ۔ شیفتہ نے دیوان کی ترتیب کی تاریخ " دیوان بے نظیر،، نکالی ہے ۔ مومن کے دیوان کی ترتیب کے وقت ہمارے حساب سے شیفتہ کی اپنی عمر ۱۹/۱۸ سال کی تھی لیکن اس کم عمری میں تحریر کا اتنا پختہ انداز قابل ستائش ہے ۔ شیفتہ فرماتے ہیں :

" بہ زمانۂ کی تہذیب این دلفریب بستان اتفاق افتاد از ہجرت هزار و دو صد و چہل و سہ سال بر وفق ھلال گشتہ بود و سنین عمرش که چون عمر خضر از حد شمار برکران باد بہ بست و نہ رسیدہ ، و از بس کہ این دیوان بے نظیر است تاریخش " دیوان بے نظیر،، است ۔[2]،،

کلام مومن کی تعریف کرتے ہوئے شیفتہ فرماتے ہیں:

" ہر حرفش گنجینۂ مضامین و معانی است و سخن غیر را با کلامش نسبت ہذیانات مسیلمہ و آیات قرآنی ، تگاور طبعش را چرخ چارمین در زیر گام اوّلین است، نازم بہ جولان توسن خیالش کہ فراز فلک تازد و پندارد کہ بر زمین است ، تعالی اللہ دانش آنجنے کہ شعر را پیرایۂ حکمت پوشانیدہ و مقصودش ازین بلند آہنگی نہ بہ واز بطلیموس

---

۱ ۔ کلیات مومن ، جلد اول ، ص ۲۰ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲ ۔ کلیات مومن (دیباچہ اول از شیفتہ) ، ص ۶۰ ، مرتبہ کلب علی خان فائق

گردیدن است ، بل معنی :

" ان من الشعر لحکمة "

را جلوهٔ اظهار بخشیدن ، حبذا سحر بیانی که نظم را هم اثر افسون گردانیده و مدعا پیش نه دوکان هاروتی چیدن است بلکه مضمون : " ان من البیان لسحراً " را به عرصهٔ بروز کشیدن ، اگر به قدح چنگ و رباب نغمه سازی کند زهره به چرخ در آید و اگر به بی داشی خم کده شیناں سخن طرازی دهد فلاطون را درخم نشستن دور از خرد نماید ـ

آبیات

سبحان الله چه نکته دانیست　　یک حرف طلسم صد معانیست

در سینهٔ پاک او ز مضمون　　گنجی و چه گنج ، گنج قارون

مضمون به سرش چو در به دریا　　معنی به دلش چو می به مینا

هر غنچهٔ او چمن بهار ست　　هر گوهر فکرش آب دار ست

رشح قلمش چو ابر آزاد　　گلشن گلشن نماند ه گل زار

خرم گم گلشن معانیست　　نو باوهٔ باغ نکته دانیست

نطقش چو دم مسیح ز اعجاز　　در قالب مرده جان دهد باز "[1]

۱ـ کلیات مومن (دیباچه اول از شیفته) ، ص ۵۲ ، مرتبهٔ کلب علی خان فائق

اسی تقریظ (دیباچہ) میں شیفتہ نے مومن کے کلام کی خوبیاں نہایت عالمانہ اور شاعرانہ انداز میں بیان کی ہیں ۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں :

" ـــــ و دوشیزہائے فکرتش بہ زیور گونان گون صنائع آراستہ ، و چنان بے تکلّف کہ گوشِ گوئندہ را بہ لفظ پیرائی سر ے نہ بودہ ، تنہا آرائش صورت معنی در نظر داشتہ ، طرز گزین ، روش متین ، الفاظ شگفتہ و دل پسند ، معانی تازہ و بلند ، چستیٔ اسطقس تراکیب ، شوکت کلمات ، تومندیٔ اندیشہ ، نزاکت خیال ، رشاقت مضمون ، رعایت مقتضائے مقام ، شوخئی انداز ، جزالت عبارت ، الفاظ آشنا معنی بیگانہ ، تہ شیئ غور ، حسن ادا ، وقت فکرت اوست ـــــ "[۱]

غرض یہ تقریظ (دیباچہ) آٹھ صفحات پر مشتمل ہے ۔

---

۱ ـ کلیات مومن ، جلد اوّل (دیباچہ از شیفتہ) ، ص ۵۸ ، مرتبہ کلب علی خان فائق

پانچواں باب

۱- شیفتہ کے معاصرین اور ان سے باہمی روابط

مومن خان مومن :

مومن سے شیفتہ کے تلمذ کا حال گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے - شیفتہ اور مومن میں صرف شاگردی اور استادی ہی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ دونوں دوست بھی تھے اور دونوں کی بہت سی مزاجی خصوصیات بھی ملتی جلتی تھیں - مثلاً مومن بھی عشق مجازی کے لیے اپنے زمانے میں مشہور تھے اور شیفتہ بھی اس میدان میں قدم رکھ چکے تھے، مومن بھی خاندان شاہ عبدالعزیز سے عقیدت رکھتے تھے اور شیفتہ بھی - دونوں اپنے زمانے کے عالم و فاضل اور بلند پایہ شاعر سمجھے جاتے تھے - دونوں کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہ تھا- یہی کوئی آٹھ نو سال کا فرق تھا- شیفتہ نے کلیات مومن مرتب کیا تو مومن نے بھی "گلشن بے خار،، کی تقریظ لکھی اور شیفتہ اور ان کے کلام کی جتنی تعریف کر سکتے تھے کی - بہرحال زندگی بھر دونوں میں بڑا ربط باہمی رہا- مومن کی وفات کے بعد بھی شیفتہ حق دوستی ادا کرتے رہے - شیفتہ جب تک دلّی میں رہتے، مومن سے ملاقات رہتی تھی - شاعروں میں باہم شریک ہوتے تھے - شیفتہ اور آزردہ کے دولت کدوں پر باری باری ہر ہفتے محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی، وہاں بھی مومن اکثر تشریف لے جایا کرتے

تھے ۔ دونوں میں باہم خط و کتابت بھی تھی ۔ مومن نے جس جان کاھی اور دلسوزی سے " گلشن بیخار،، کی تقریظ لکھی ھے اس سے ان کے خلوص و محبت کا پتہ چلتا ھے اور شیفتہ نے جس پرخلوص انداز میں " گلشن بے خار،، میں مومن اور صاحب (مومن کی محبوبہ) کی تعریف کی ھے اس سے ان کے پرخلوص جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ھے ۔ مومن کی تقریظ کم و بیش آٹھ صفحات پر مشتمل ھے جس میں جا بجا اشعار بھی شامل کیے گئے ھیں ۔ ذیل میں مومن کی تقریظ سے ایک قطعہ بند پیش کیا جا رہا ھے:

" نہ دیدم چنین شاعر نکتہ سنج — کہ ریزد ز کلکش گہر گنج گنج
بہ دقّت اگر موشگافی کند — ز موئے میان شعر بافی کند
قلم را بہ ملک سخن گستری — ز آوازہ دارد جہان داوری
اگر سرو را مصرعے بستہ است — ز شادی خوش از جاے برجستہ است
طلاقت شکر خند تقدیر او — عذوبت زبان بند تحریر او
شرف داد خود را بہ میزان شعر — چہ کرسی نشین است ازو شان شعر
حلاوت دہ ذوق شوریدہ گان — پسندش پسند پسندیدگان
تراود اگر از بش آفرین — دمد جان درا شعر روح الامین
چو نظم شریّا کند انتخاب — شود نقطہ از کاستن آفتاب
بہ نطق گدائے چو جهد سرش — ز سلطان برد ، شاہ بہت افسرش
اگر مصرع زلف پیچان شکست — ز فہم درستش نہ گیرد بدست
سند تا بہ طبعش نیارد بہار — شگفتن ز گل ھاست بے اعتبار

نگارے کہ در کف حنا بستہ است — ز مضمون رنگینش حجت بہ دست

چو رای مہرش نہ دانند صواب — افق خط کشد مطلع آفتاب

ز تحسین او حسن معنی بہ ناز — ہزار آفرین بر چمن امتیاز [1]

اسی تقریظ میں مومن نے " ابیات ،، کے زیر عنوان کچھ اور اشعار بھی لکھے ہیں جن سے جہاں شیفتہ کی شاعرانہ عظمت و ناقدانہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں مومن کے خلوص و محبت کا پتہ بھی چلتا ہے :

ابیات

شیفتہ آں ساحر معجز بیان — کزدمش اعجاز و افسون ہم زبان

دست او را در نگاہ نکتہ بین — صد ید بیضا بود در آستین

گفت نظمش را ملک سحر حلال — لاف سحر سامری شد خاک مال

ناز ہایش دل پسند شاعری — نے رگ گردن کشند شاعری

نالۂ عاشق چہ آید در شمار — طبع او موزون تر است از قدّ یار

برگزیدہ جزئے از اشعار ہا — حرف دل کش چیدہ از گفتار ہا

لختے از تعریف شاعر ہم نوشت — دیگرے با این صفت یا کم نوشت

بر بہار نظم رنگ تازہ بست — نے سخن اوراق گل شیرازہ بست

نغمہ ہائے گل فشاں تا بر کشید — تیغ رشک او سر بلبل برید

از پئے تاریخ سال این کتاب — ہر سخنور مصرعے کرد ے حساب

۱۔ گلشن بے خار (از شیفتہ) ، ص ۲۲۳ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

گفت مومن نکتہ پرداز اجل | انتخاب دل پسند بے بدل
بس کہ با یکتائیش افتادکار | هست از اعداد شاذی در شمار [1]

مولانا صلاح الدین احمد فرماتے هیں کہ اسی تذکرے (گلشن بے خار) کی خود مومن نے جو تقریظ منظوم لکھی هے ، وہ بھی دیدنی هے :

کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا | هے شیفتہ جس کی جان معنی
یوں نکتہ شناس هیں پر ایسا | کوئی نہیں قدردان معنی
هر فقرۂ نثر جان مضموں | هر شعر روان روان معنی
کیا بات هے منتخب کی تیرے | اے منتخب جہان معنی
هر نقطۂ انتخاب تیرا | خال رخ دلبران معنی
تیرے جو سخن سے هے سرافراز | الفاظ کا پایۂ شان معنی
معنی هیں ثنا طراز الفاظ | الفاظ هیں مدح خوان معنی
اے تازہ بہار باغ مضموں | اے گلشن بے خزان معنی
هے تذکرۂ ریاض فردوس | فردوس هے بیا جنان معنی
مومن جب اس میں دیر تک کی | سیر گل و گلستان معنی
غنچہ کی طرح سے سرخرو تھا | یک چند وہ هم زبان معنی
جب نغمہ سرا نہ هو سکا وہ | دستان زن داستان معنی

هاتف نے کہا هے اس کی تاریخ

گلدستۂ گلستان معنی [2]

۱- گلشن بے خار ، از (شیفتہ) ، ص ۲۶۶ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

۲- دیوان شیفتہ (شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۱۶ ، مرتبہ صلاح الدین احمد مولانا

مومن نے " معما بہ اسم نواب مصطفیٰ خان بہادر" میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں شیفتہ سے دوری کے احساس کا اظہار کیا ہے :

" نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے
بہار اک جام بے جا بھر رہی ہے
صدا بے درد قمری کی بلا ہے
سر طاقت بھی جس کا نقش پا ہے
فلک کو کل نہیں بے جورو بے داد
سر مٹنے کیا ہو ، گو ہے فصل فرداد
کہ وہ سرو خراماں یاں نہیں ہے
سرور اپنا تو اب امکان نہیں ہے
بہار سبز پا کے پاؤں شوشیں
کہ درد بے حد حسرت سے چھوٹیں " [1]

شیفتہ ، مومن سے کس درجہ لگاؤ رکھتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے عزیزوں کا کتنا خیال رکھتے تھے ، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی نے بیان کیا ہے:

" مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا (مومن کو) ۔ ایک خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے ۔ نواب مصطفیٰ خان نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آ کر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے ۔ انھوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمے پر ایک مہر ثبت تھی ، جس میں " مومن جنتی " لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے ، تم ان کی خبر لو ۔ صبح کو

---

۱ ۔ کلیات مومن ، جلد دوم ، ص ۹۶ ، مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری

نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے اور خط کا مضمون

بھی کہلا بھیجا۔ ان کے صاحبزادے احمد نصیر خان سلمۃ اللہ

کا بیان ہے کہ فی الواقعہ ان دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت

تکلیف تھی ۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا ۔،،[۱]

اسد اللہ خان غالب:

غالب اور شیفتہ کے تعلقات کی بھی کم و بیش وہی نوعیت تھی جو مومن و شیفتہ کے تعلقات کی ۔ جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مومن کی وفات کے بعد شیفتہ اپنے اردو اور فارسی دونوں کلام کے سلسلے میں غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے ۔ اس تعلق کے علاوہ دونوں میں دوستی بھی تھی اور ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے ۔ایک دوسرے سے خط و کتابت تھی اور ایک دوسرے کے راز و نیاز سے واقف تھے ۔

غالب نے بھی مومن کی طرح شیفتہ کے " گلشن بے خار،، کی تقریظ لکھی اور اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ ویسے بھی غالب اور شیفتہ نے مرتے دم تک وضعداری کو نباہا۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور آپس میں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

حالی فرماتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے (جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف

۱۔ کلیات نثر حالی، جلد اوّل، ص ۳۲۶، مرتبۂ محمد اسمعیل پانی پتی شیخ

کی ھے - اپنے نتائج افکار مین سے کچھ ان کو بھیجا ھے اور ان کی تازہ غزلون کی جو حال مین لکھی ھون ، درخواست کی ھے -[1] مرزا نے اس خط کے جواب مین ایک طولانی خط لکھا ھے اور مصطفیٰ خان شیفتہ کی بڑی تعریف کی ھے - شیفتہ نے جو خط لکھا ھے وہ " رقعات فارسی ،، مین شامل ھے -[2] غالباً یہ تیسرا خط ھے جو شامل " رقعات فارسی ،، ھے - اس پر تاریخ درج نہین ھے، لیکن غالب نے اس کے جواب مین جو خط لکھا ھے وہ " پنج آھنگ ،، مین درج ھے اور وزیرالحسن عابدی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ خط ۱۸۳۵ء کا لکھا ھوا ھے - وزیرالحسن عابدی فرماتے ھین کہ وہ غزل جو غالب نے خط کے آخر مین شامل کی ھے ۱۸۳۸ء سے پہلے کی کہی ھوئی ھے -[3]

شیفتہ نے " گلشن بے خار ،، کا مسوّدہ غالب کے طلب کرنے پر ان کو بھیجا ھے[4] جس کو دیکھ کر مرزا غالب نے خط لکھا اور جس مین مفتی صدرالدین آزردہ کے ذکر کے اضافے کا مشورہ دیا -[5] بعد مین شیفتہ نے ایسا ھی کیا - بہرحال پنج آھنگ مین شیفتہ کے نام ۱۷ خطوط (فارسی) ھیین اور اسی طرح " رقعات فارسی (لحن عراق) ،، مین غالب کے نام ۱۱ (گیارہ) خطوط (فارسی) ھین، جن سے شیفتہ اور غالب کے روابط کا اندازہ ھوتا ھے کہ وہ صرف استادی اور شاگردی ھی کے رشتے مین منسلک نہین تھے بلکہ ان کے روابط آپس مین دوستانہ و

۱- یادگار غالب (از حالی) ، ص ۵۲۹، مرتبہ خلیل الرحمن داودی

۲- رقعات فارسی (لحن عراق) ، ص ۱۲، شیفتہ و حسرتی محمد مصطفیٰ خان نواب

۳- پنج آھنگ (از غالب) ، ص ۲۲۳ و ۶۳۲، مرتبہ وزیرالحسن عابدی سید

۴- رقعات فارسی (لحن عراق) ، ص ۳۰، شیفتہ و حسرتی محمد مصطفیٰ خان نواب

۵- پنج آھنگ (از غالب) ، ص ۲۲۸، مرتبہ وزیرالحسن عابدی سید

برادرانہ تھے ۔

حالی فرماتے ہیں :

" نواب مصطفیٰ خان مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم سے ان کو بمراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے ۔۔۔ مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی موجود تھا ، آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے ، کھانے میں دیر تھی ۔ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے ۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے ۔

نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست

فسون بابلیان فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاج کے طور پر کہا :" دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے،، ، کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی ۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی ، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے ۔ مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی کہنے لگے ، " کلام مربوط ہے مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے،، سب حاضرین ہنس پڑے ۔ جب مقطع کی نوبت آئی مرزا نے مولانا

کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا ؎

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے ۔"[۱]

گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب شیفتہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد قیدو بند کی صعوبتوں میں مبتلا تھے تو غالب کی کیا حالت تھی ۔ وہ ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے، انھوں نے ان کی رہائی کی کوششیں کیں اور ان سے ملنے میرٹھ بھی گئے، ان کی رہائی کے لیے دعائیں کیں اور اپنے متعدد خطوط میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا اور اظہار افسوس کیا۔ غالب نے جو خطوط اردو میں مختلف حضرات کو لکھے ہیں ان سے بھی غالب کے خلوص و محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ شیفتہ کے لیے رکھتے تھے۔ ان خطوط کا ذکر بھی گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے ۔

۱۲۶۳ھ (مطابق ۱۸۴۷ء) میں غالب کو ایک نہایت ہی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ۔ انھیں جوئے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعے کا سن بتاتے ہوئے خلیل الرحمن داودی کہتے ہیں کہ لالہ گھنشیام لال عاصی دھلوی شاگرد شاہ نصیر دھلوی نے اس حادثے کے متعلق ایک قطعۂ تاریخ نظم کیا تھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے ۔ اس کے مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء برآمد ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں ایک معاصرانہ شہادت

۱۔ یادگار غالب (از حالی) ، ص ۲۴۷ ، مرتبۂ خلیل الرحمن داودی

" احسن الاخبار" بمبئی کی ہے - ۲۵/ جون ۱۸۴۷ء کے شمارے میں اس کی تفصیلات ان الفاظ میں قلمبند کی گئی ہیں : " دھلی ۱۵/ جمادی الثانی مرزا اسداللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا - معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔[1]" حالی فرماتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے اس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا - اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر ان کی غم خواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے - اس زمانے میں بہت سے عزیزوں اور دوستوں نے مرزا سے آنکھیں پھیر لیں ، لیکن شیفتہ کے خلوص و محبت میں فرق نہ آیا۔[2] غلام رسول مہر فرماتے ہیں :

> " لیکن بے مہری و حق فراموشی کے اس عام منظر میں صرف ایک شخص کا چہرہ درخشندہ نظر آتا ہے - نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ، خواجہ حالی مرحوم کہتے تھے کہ جونہی انہیں اس واقعے کی خبر ملی فوراً ایک ایک حاکم سے جا کر ملے اور مرزا کی رہائی کے لیے پیہم کوششیں کیں - پھر جب مقدمہ چلا اور اس کی اپیل کی گئی تو تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کیے - جب تک مرزا قیدخانے میں رہے ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہو کر قیدخانے میں جانا اور مرزا سے ملاقات کرنا - وہ لوگوں سے کہتے تھے: " مجھے مرزا

۱- یادگار غالب (از حالی) ، ص ۳۱ (حاشیہ) ، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی

۲- ایضاً ، ص ۳۲

سے عقیدت ان کے زھد و اتقاء کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بناء پر تھی ۔ جوئے کا الزام آج عائد ھوا مگر شراب پینا تو ھمیشہ سے معلوم ھے ۔ پھر محض اس الزام و گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل، ھو جائے؟ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ایسا ھی ھے جیسا پہلے تھا ۔،،[1]

مرزا غالب نے اپنے ایک طویل ترکیب بند میں اس واقعہ کے دوران لوگوں کی بے مہری و بے وفائی کا ذکر کیا ھے، لیکن اسی بند میں مصطفیٰ خان شیفتہ کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ھے اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا ھے :

" ترکیب بند (در بیان احوال و احساسات خود در ایام حبس)

آنچہ فرد است ھم امروز درآمد گوئی
آفتاب از جہت قبلہ درآمد گوئی
دل و دستیکہ مرا بود فروماند ز کار
شب و روزی کہ مرا بود سرآمد گوئی
نہ گزشتم ھمہ رنج و الم آرد گفتی
سر نوشتم ھمہ خوف و خطر آمد گوئی

۱۔ نقش آزاد، ص ۲۸۳، غلام رسول مہر مولانا

بهرهٔ اهل جهان چون ز جهان درد و غم است

بهرهٔ من ز جهان بیشتر آمد گوئی

خستن و بستن من حد کس نیست برو

بر من اینها ز قضا و قدر آمد گوئی

هنرم را نتوان کرد به خستن ضایع

خستگی غازهٔ روئی هنر آمد گوئی

غم دل داشتم اینک غم جانم دادند

زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی

چرخ یک مرد گرانمایه بزندان خواهد

یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

مژه امشب ز کجا این همه خوناب آورد

این چنین گرم ز زخم جگر آمد گوئی

خود چرا خون خورم از غم که بغم خواری من

رحمت حق به لباس بشر آمد گوئی

خواجهٔ هست دریں شهر که از پرسش وی

پایه خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خان که دریں واقعه غمخوار من است

گر بمیرم چه غم از مرگ عزادار من است

۱- باغ‌دودر (از مرزا اسدالله خان غالب)، ص ۳۶، مرتبهٔ وزیرالحسن عابدی

غالب کے اس پورے ترکیب بند کا اردو منظوم ترجمہ چوہدری نبی احمد باجوہ صاحب نے اپنی کتاب " شش جہات غالب،، میں پیش کیا ہے ۔ چند شعر جو مصطفیٰ خان شیفتہ سے متعلق ہیں اور جن کا فارسی متن پیش کیا جا چکا ہے، ملاحظہ کیجیے:

" غم کا کیا غم مجھے غمخواری کو میری ہے جب — کرم حق پہ لباس بشر آیا گویا
شہر میں آتا ہے اک جس کی کہ پرسش سے ہوا — مرتبہ میرا جو پنہاں تھا، ہویدا گویا
مصطفیٰ خان کہ اس غم میں ہے غمخوار مرا
مر بھی جاؤں تو نہیں غم، ہے عزادار مرا ،،[1]

غالب کے کلیات میں ایک قصیدہ بھی مصطفیٰ خان شیفتہ کی شان میں ملتا ہے:

" ـــ

دست رد بر تاج قیصر می نہم — پشت پا بر تخت خاقان می زنم
خردہ می گیرند بر من قدسیان — گر نفس در مدح سلطان می زنم
آن ہمای تیز پروازم کہ بال — در ہوای مصطفیٰ خان می زنم
آن سمی خواجہ کہ اندر خواجگی — از عطایش موج عمان می زنم
عرفی و خاقانیش فرمان پذیر — سکہ در شیراز و شروان می زنم ،،[2]

۱۔ شش جہات غالب، ص ۴۷، نبی احمد باجوہ چوہدری

۲۔ کلیات غالب (فارسی) جلد دوم، ص ۳۵۹، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی سید

اسی طرح غالب اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :۔

" وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں "[1]

حالی ، شیفتہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہی وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں :

" غالب بہ فن گفتگو ناز دبدین ارزش کہ او ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خان خوش نہ کرد "[2]

مفتی صدرالدین آزردہ :

مفتی صدرالدین آزردہ نے بھی شیفتہ کے " گلشن بے خار " کی تقریظ لکھی ہے جو تقریباً چھ صفحات پر مشتمل ہے اور شامل کتاب ہے ۔ شیفتہ اور آزردہ کے گھروں پر باری باری ہر ہفتے مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا اور تمام دوست احباب اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ شیفتہ نے " گلشن بے خار " میں نہایت ادب و احترام سے آزردہ کا ذکر کیا ہے ۔ آزردہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ۔ اپنے زمانے کے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ ان کے والد کا نام لطف اللہ کشمیری تھا۔ مفتی صاحب دہلی میں ۱۷۹۸ء (۱۲۰۳ھ) میں پیدا ہوئے ۔ مولانا شاہ عبدالعزیز ، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسحٰق ، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی ۔

۱۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب ، ص ۲۵۳ ، شادان بلگرامی

۲۔ یادگار غالب (از حالی) ، مرتبہ خلیل الرحمن داودی

غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دهلی مین صدرالصدور اور مفتی تھے ۔ غدر ۱۸۵۷ء مین ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا ۔ گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل مین آئی ، لیکن چند روز بعد رہا کر دیئے گئے اور جائداد کا بھی ایک حصہ واپس دے دیا گیا ۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ " صدرالصدور ،، ہونے کی حالت مین بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے ۔ مفتی صاحب کے شاگردوں مین نواب یوسف علی خان والئی رامپور ، سرسید احمد خان ، نواب صدیق حسن خان بھوپالی بھی شامل هین ۔ عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار هین ۔ شاعری کا بھی ذوق تھا ۔ عربی ، فارسی ، اردو تینون زبانون مین شعر کہتے تھے ۔ آزردہ تخلص تھا ۔ اردو مین شاہ نصیر ، ممنون اور میان مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا ۔ اردو کے شاعرون کا ایک تذکرہ فارسی مین مرتب کیا تھا ، لیکن اب نایاب هے ۔ ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) مین انتقال کیا ۔[1] مرزا غالب ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ، امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص تعلقات تھے اور ان صاحبون سے اردو مین خط و کتابت رکھتے تھے ۔ اردو کی یہی تحریرین مفتی صاحب کی یادگار هین ۔ ایک خط کی چند سطرین نمونہ و تبرک کے طور پر درج کی جاتی هین جو " سوبی مین اردو ،، سے ماخوذ هین :

" نامۂ آزردہ بنام نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

شکر هے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ همہ تن اس مین غرقاب تھا نکالا ، کیسے علائق مین جکڑ بند تھا

---

[1] داستان تاریخ اردو ، ص ۲۱۲

که نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا ۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا ، منصفون اور صدرامینون کے مقدمات کا مرافعہ سننا ، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا ، مقدمات دورہ مین فتویٰ دینا ، کمیٹیون مین حاضر ہونا ، طلبۂ مدرسۂ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا ، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا ، ہزارہا کاغذون پر دستخط کرنا ، پھر گھر مین آ کر طالب علمون کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا ، وہابیون اور بدعتیون کے جھگڑے مین حکم ہونا ، مجالس شادی و غمی اور اعراس مین جانا ، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا ، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا ۔۔،،[1]

شیفتہ نے بھی " رقعات فارسی ،، یعنی " لحن عراق ،، مین آزردہ کو سات خط لکھے ہین جن سے شیفتہ کا مفتی صدرالدین آزردہ سے حسن عقیدت ظاہر ہوتا ہے ۔

غلام علی خان وحشت:[2]

" غلام علی نام، وحشت تخلص میر فرحت اللہ صاحب کے بیٹے تھے ۔ مولد ان کا

۱۔ داستان تاریخ اردو، ص ۲۱۳، حامد حسن قادری

۲۔ مومن ، ص ۱۸۵ ، کلب علی خان فائق رامپوری

مرادآباد ہے اور بنارس و دہلی میں نشوونما پائی ہے ۔ اب انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بلند شہر میں تعینات ہے، شاعری کا ماہ تابان ہے اور آسمان مضامین اور معانی کا روشن سورج ـــ اس کے کلام کی خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حاسد بجائے طنز و تعریض کے مرحبا اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں ـــ انصاف یہ ہے کہ کوچۂ شاعری اس کے تصرّف میں ہے ، ان باتوں سے قطع نظر کم عمری اور آغاز جوانی کے باوجود اکثر کمالات میں اونچا مقام رکھتا ہے اور تقاضائے سن کی وجہ سے رموز عشق سے باخبر ہے اور آثار شیفتگی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں، مخلص اور خالص دوست ہیں، برسوں سے مجھ میں اور وحشت میں دوستی اور اخلاص ہے اور دوستی کا شہرہ پھیلا ہوا ہے ۔ مومن خان کے شاگردوں میں سے ہیں" ۔ یہ رائے شیفتہ کی بحیثیت دوست کے جذباتی کہی جا سکتی ہے (صفحہ ۲۳۵ گلشن بے خار) لیکن یادگار غالب میں حالی(صفحہ ۹۱ و حاشیہ نمبر۱ صفحہ ۹۱) لکھتے ہیں :

" نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جنھوں نے مومن خان مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دیکھایا یا جیسے سید غلام علیخان وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے، مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے :ـ

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

یہ دونون صاحب باہم دگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے، یہان تک
کہ ان کی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی ۔ ایک دفعہ جب
کہ راقم بھی جہانگیر آباد مین موجود تھا، سید غلام علی مرحوم
نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی ان
کا یہان آنا سن لیا تھا۔ انھین دنون مین مرزا صاحب کا خط
نواب صاحب کے نام آیا، اس مین خان صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور
اخیر مین خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل
کر لکھا تھا۔ شعر:

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سن کر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر مین
اس قدر لطف نہ تھا، جیساکہ اس موقع پر مرزا صاحب کے اس تصرّف
سے اس مین لطف پیدا ہوگیا۔"

مندرجہ بالا اقتباس کے بعد، کلب علی خان فائق رامپوری اپنی تالیف " مومن "
کے صفحہ ۱۸۶ پر حاشیہ مین فرماتے ہین:

" یہ صاحب دلّی کے ممتاز لوگون مین تھے، ان کے والد کا نام سید
فرحت اللہ خان تھا اور مولانا رشید علی خان مرحوم کے داماد تھے۔
قطع نظر علم و فضل کے اردو اور فارسی دونون زبانون مین نہایت

خوش بیان اور شعر کا مذاق اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے - اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہوگئے پھر لکھنئو میں سعید اللہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ ان سے قرابت قریبی رکھتے تھے ، ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گئے، وہاں سے پھر الور چلے آئے اور غدر تک وہیں رہے، غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتۂ تعلیم سے مسلک رہے اور نواب مصطفیٰ خان مرحوم ان کی ہر حال میں مدد کرتے رہے-"

جیساکہ گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شیفتہ کا دائرۂ احباب بڑا وسیع تھا- ادیبوں، شاعروں، عالموں اور صوفیوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا- ان کے مختلف احباب کا ذکر مختلف مواقع پر گزر چکا ہے - یہاں اسی پر اکتفا کی جاتی ہے -

۲- شیفتہ اور حالی :

حالی پر شیفتہ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا فرماتے ہیں :

" اردو تنقید میں بعض غلط آراء نے کلیات کی حیثیت اختیار کرلی ہے- ان میں سے ایک رائے یہ ہے کہ حالی کو حالی، شیفتہ نے بنایا- یہ رائے مبالغہ آمیز ہے-"[1]

۱- کریسنٹ حالی نمبر، ص ۱۹۳ ، ستمبر ۱۹۶۹ء، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ ، لاہور

خواجہ محمد زکریا صاحب کی رائے سے اگر اتفاق بھی کر لیا جائے تو بھی اتنی بات تو ماننی ہی پڑتی ہے کہ اس مبالغے کی تہہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے ۔ حالی پر شیفتہ کے جو اثرات مرتسم ہوئے ہیں ان کا سب سے پہلے احساس خود حالی ہی کو ہوا ہے جس کو انھوں نے بڑی دیانت داری اور وسیع القلبی سے اپنی نظم اور نثر میں ظاہر کر دیا ۔ اوروں نے تو حالی ہی کے بیان کی روشنی میں اپنی آراء قائم کی ہیں ۔ آراء تو حالی کی شاعری اور اس کا پس منظر مطالعہ کرنے کے بعد بھی قائم کی جا سکتی تھیں، لیکن ذرا دقت کے بعد ۔ حالی کے اپنے مخلصانہ اور دیانتدارانہ اعتراف کے بعد ذرا آسانی پیدا ہوگئی ۔ حالی کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں　　　شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

مندرجہ بالا شعر کہنے پر حالی کو کسی نے مجبور نہیں کیا تھا ۔ حالی جھوٹ بولنے والے لوگوں میں سے نہیں تھے ۔ انھیں کیا پڑی تھی کہ وہ ایک غلط بات کرتے ۔ ان کا اپنا بیان ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ واقعی حالی شیفتہ سے مبالغے کی حد تک متاثر تھے:

" غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خان مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیرآباد ضلع بلند شہر سے، جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی

ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ـ

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے، اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بہ مراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا ـ انھوں نے ابتداء میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے ـ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق، جو مدّت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی، جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اٹھا ـ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا ـ انھی کے ساتھ میں جہانگیرآباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا ـ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا ـ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقایق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو حسن بیان سے دل فریب بنانا، اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے ـ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے ـ

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیے کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔"[1]

رام بابو سکسینہ حالی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دلّی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیرآباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی[2]۔ نواب صاحب کی صحبت ان کی شعرگوئی کی محرّک ہوئی تھی اور یہیں انھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا اور اب ان کے پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے، کسی چیز کا من و عن بیان سیدھےسادے الفاظ میں جس میں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو، اب ان کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور انھیں کا رنگ ان پر غالب تھا۔ شیفتہ کا اثر اور رنگ بھی ان کے اس زمانے کے کلام میں بہت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر سید اعجاز حسین حالی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کو غالب کی صحبت سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع نہیں

۱۔ کلیات نثر حالی، جلد اوّل، ص ۳۳۹، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی شیخ

۲۔ تاریخ ادب اردو، ص ۳۷۷، رام بابو سکسینہ (مترجم: عسکری، مرتب: مرتضیٰ حسین فاضل)

ملا۔ غدر کے ہنگامے نے کئی سال تک گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا ۔ تین چار برس کے بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے فیض صحبت حاصل ہوا۔ ان کی صحبت سے حالی کے خیالات پر بہت کچھ اثر پڑا ۔[1] شیفتہ مبالغے سے گریز کرتے تھے ۔ سچی باتیں اور سیدھے سادے خیالات کو نظم کرنا ان کے نزدیک شاعر کا فرض اوّلین تھا۔ یہ باتیں ایسی تھیں جو حالی کی جدید شاعری کا پس منظر ہوگئیں۔ حالی کی قدیم غزلوں میں شیفتہ کا اثر نمایاں ہے، جن میں عاشقانہ جذبات نہایت تیز اور پراثر ہیں ۔ حالی کی شاعری پر شیفتہ کے اثرات کی بات کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں :

" میر اور سعدی جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحب ذوق شعراء کی تربیت اور صحبت کی بدولت حالی اس میدان میں بھی بڑی حد تک سنبھلے رہے چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے اور نہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے جو اس وقت بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔،،[2]

ڈاکٹر عبادت بریلوی فرماتے ہیں کہ حالی نے غزل کی اصلاح کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا۔ حالی غزل کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے ۔ ان کے ادبی ذوق اور

۱۔ مختصر تاریخ ادب اردو ، ص ۱۳۲ ، اعجاز حسین سید ڈاکٹر پروفیسر

۲۔ یادگار حالی، ص ۱۷۱ ، صالحہ عابد حسین

شعری شعور کا نشوونما ، غالب ، مومن اور شیفتہ ایسے شاعروں کے زیر سایہ ہوئی تھی ۔ اسی لیے ان کے ذوق اور شعور میں نکھار کی کیفیت ملتی ہے ۔ اصلاح غزل کی تحریک جو حالی کے ہاتھوں شروع ہوئی صرف حالی کی جدّت پسند طبعیت کا نتیجہ نہیں تھی ۔ اس کا محرّک وہ سارا سماجی پس منظر ہے جس میں حالی کی شخصیت کا نشوونما ہوا تھا۔ حالی نے غالب ، مومن اور شیفتہ کی صحبتیں دیکھی تھیں ۔ انھیں غزل کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کا احساس بھی تھا جو ان شعراء کے ہاتھوں پیدا ہو رہی تھی ۔ غالب کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ شیفتہ کے بھی وہ بہت قریب رہے تھے ۔ مومن سے بھی انھیں قربت تھی ۔ اس لیے وہ اس فضا سے متاثر ہوئے جو غزل کے لیے ان شعراء نے پیدا کی تھی ۔ ظاہر ہے یہ شعراء جدید غزل کے پیش رو تھے اور ان کے فنون نے غزل میں جدّت کا رنگ بھرا تھا ۔[1]

بہرحال بے شمار نقادوں ، عالموں اور استادوں کی آراء پیش کی جا سکتی ہیں جن میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ حالی پر شیفتہ کی صحبت اور ان کے شاعرانہ نظریات کا بڑا گہرا اثر ہے اور حالی کی تہذیب و تربیت میں شیفتہ کا بڑا دخل ہے ۔ حالی نے آٹھ سال کا عرصہ ۱۸۶۱ء (*) سے لے کر ۱۸۶۹ء تک جو شیفتہ کی مصاحبت میں گزارا وہ ان

۱۔ غزل اور مطالعۂ غزل ، ص ۳۴۷ ، عبادت بریلوی ڈاکٹر

(*) نوٹ: خلیل الرحمن داودی نے حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حالی ۱۸۶۱ء میں شیفتہ کی مصاحبت میں داخل ہوئے ۔ اگر حالی خود ۱۸۶۳ء کہتے ہیں تو یہ ان کا سہو ہے ، حالات و واقعات اس بات کو تقویت نہیں دیتے ۔ (بحوالہ یادگار غالب (از حالی) ، ص ۱۳ تا ۱۸ ، مرتبہ خلیل الرحمن داودی) ۔ (مقالہ نگار)

کی آئندہ زندگی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا ۔

۳۔ شیفتہ کے معاصر نکتہ چین
اور دور حاضر کے نقاد :

شیفتہ کے " گلشن بے خار،، کے تقریظ نگاروں میں مومن خاں مومن ، اسداللہ خان غالب، مفتی صدرالدین آزردہ ، مولوی امام بخش صہبائی اور عبداللہ خان علوی شامل ہیں ۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز میں شیفتہ اور ان کے تذکرے " گلشن بے خار،، کی دل کھول کر تعریف کی ہے اور ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی داد دی ہے ۔ ان کے علاوہ کچھ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی شیفتہ کی سخن گوئی اور سخن فہمی کے بارے میں اختصار کے ساتھ مثبت رویہ اختیار کیا ہے ۔ ان میں کریم الدین (طبقات الشعرائے ہند) ، نصراللہ خان قمر (گلشن ہمیشہ بہار) ، صابر (گلستان سخن) ، صفا بدایونی (تذکرۂ شمیم سخن) ، ساخ (سخن شعراء) ، صاحب بزم سخن ، مولف تذکرہ طور کلیم، سرسید احمد خان (آثار الصنادید) ، صفیر بلگرامی (جلوۂ خضر) ، محسن (تذکرۂ سراپا سخن) ، کلب حسین خان (تذکرۂ نادر) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں [1] ۔ اس کے برعکس قطب الدین باطن (گلستان بے خزاں) اور نصراللہ خان خویشگی (گلشن ہمیشہ بہار) نے شیفتہ کی تنقید نگاری کے انداز سے ناپسندیگی کا اظہار کیا ہے ۔ باطن نے ذرا سخت الفاظ میں اور نصراللہ خان خویشگی نے ذرا نرم الفاظ

۱۔ کلیات شیفتہ (دیباچہ از مرتب) ، ص ۲۹ تا ۳۲ ، (مرتبہ کلب علی خان فائق رامپوری) ۔

میں ۔ اس ناراضگی اور اختلاف رائے کی وجوہ زیر نظر مقالے کے چوتھے باب میں زیر بحث لائی گئی ہیں ۔ ان کے بعد کے اور موجودہ دور کے بہت سے نقادوں نے، جبکہ تنقیدی شعور پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہو چکا ہے ، خاصی چھان پھٹک کے بعد شیفتہ کی تنقیدی صلاحیتوں کو سراہا ہے ۔ ابتداء سے آج تک اس فہرست میں اور بھی بے شمار نام شامل کیے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً فرحت اللہ بیگ ، نظامی بدایونی، راس مسعود ، حسرت موہانی ، مولانا صلاح الدین احمد ، نظیر لدھیانوی ، سید عابد علی عابد ، کلب علی خان فائق رامپوری ، حبیب اشعر، مظفر علی سید ، حامد حسن قادری ، محمد ایوب قادری ، شمیم احمد ، نیاز فتحپوری ، چوھدری محمد اقبال سلیم گاھندری ، احسن فاروقی ، احسان الحق فاروقی ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر شمس الدین ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، مجید یزدانی ، سید وزیرالحسن عابدی ، خلیل الرحمن داودی ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ ۔ مولانا محمدحسین آزاد نے شیفتہ کی تنقیدی نگاری کے انداز کو زیادہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا ، جبکہ خواجہ محمد زکریا بھی شیفتہ کی تنقید نگاری کو معیاری اور حقیقت پسندانہ نہیں سمجھتے۔ مزیدبرآں ڈاکٹر عندلیب شادانی تو سرے سے شیفتہ کو نقاد ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں ۔ انھوں نے " تحقیق کی روشنی میں " بڑے کھلے لفظوں میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ شیفتہ ایسے سخن فہم نہیں تھے جیساکہ ان کو سمجھ لیا گیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ غلط فہمی غالب اور شیفتہ کے بیانات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ۔ بہرحال ان تمام باتوں کا ذکر مقالے کے چوتھے باب میں مع حوالوں کے گزر چکا ہے ۔ ان کا اعادہ مزید طوالت کا باعث بنے گا ، اس لیے یہ بیان یہیں ختم کیا جاتا ہے ۔

۳- محاکمہ

الف) شیفتہ بحیثیت شاعر :

شیفتہ و حسرتی ، اردو اور فارسی کے ایک صاحب دیوان اور قادرالکلام شاعر تھے۔ مومن اور غالب دونوں سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا اور حالی ایسے نابغۂ روزگار کی عملی تربیت میں حصہ لیا۔ شیفتہ کو اپنے دور کے ثقہ عالموں سے صحبت حاصل رہی ۔ اردو شاعری میں انھیں صف دوّم کے ممتاز شعراء میں تسلیم کیا گیا ہے اور فارسی میں وہ صف اوّل کے شعراء میں شمار کیے جانے کے اہل ہیں ۔ مولانا صلاح الدین احمد کا کہنا ہے کہ شیفتہ کی اردو ادب میں وہی حیثیت ہے جو سر عبدالقادر کی ۔ اول الذکر نے مومن ، غالب اور حالی کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا اور موخرالذکر نے اقبال اور اپنی قوم کو چمکایا۔ ان کے الفاظ میں :

" میری ناچیز رائے میں علمی دنیا کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اقبال کو عبدالقادر جیسا رفیق اور مشیر میسّر آیا جس نے اس کے کاروان خیال کو اس راستے سے بھٹکنے نہیں دیا جو خود فطرت کی دوراندیشی اور فیّاضی نے اس کے لیے تجویز کر رکھا تھا۔ میں اسی طرح یہ اردو شعر و ادب کی خوش قسمتی تھی کہ مومن اور غالب اور حالی کو شیفتہ جیسا صاحب فہم و ذکا رفیق اور مشیر میسّر آیا ، جس نے خود ان کے لیے اور زبان و ادب اردو کے فروغ کے لیے وہی کچھ کیا جو عبدالقادر نے اقبال اور

اپنے ملک و قوم کے مفاد کے لیے کیا تھا۔"[۱]

اسی طرح شیفتہ کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں مالک رام فرماتے ہیں:

" شیفتہ کے کلام سے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا تحصیل حاصل ہے۔ وہ یک فنے تھے یعنی غزل کے سوائے اور کوئی صنف کلام ان کے یہاں نہیں ملتی۔ لیکن انھوں نے غزل کو اس طرح نبھایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے کے عام رنگ سے الگ کچھ زیادہ کلام نہیں، لیکن جہاں اس سے ہٹ کر کہا ہے خوب کہا ہے۔ زبان اور اسلوب بیان اور خیالات ہر لحاظ سے شیفتہ کا کلام زندہ رہنے کا حقدار ہے۔"[۲]

شیفتہ نے اردو غزل کی روایت کو جو مومن اور غالب سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچی قائم رکھا۔ وہ غزل گوئی کے میدان میں مومن اور غالب سے تو متاثر تھے ہی کیونکہ ان سے وقتاً فوقتاً مشورۂ سخن بھی کرتے رہتے تھے، میر تقی میر، مصحفی، ناسخ اور آتش سے بھی انھوں نے اثرات قبول کئے ہیں جو ان کے اشعار میں جھلکتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیفتہ کے یہاں سیاسی شعور بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں کہیں کہیں سیاسی حالات کی طرف بھی واضح اشارے ملتے ہیں۔ اگر شیفتہ کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ الفاظ سے زیادہ شعر کی معنویت پر زور دیتے تھے یعنی خارجیت سے زیادہ ان کی توجہ داخلیت پر تھی۔ لیکن کہیں اشعار میں لفظی آہنگ کا اہتمام

۱۔ دیوان شیفتہ (شیفتہ کے ساتھ چند لمحے) ، ص ۱۳

۲۔ تلامذۂ غالب ، ص ۱۸۲

بھی صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے ۔ اس طرح ان کی شاعری میں لکھنو اور دلی دبستانوں کے اثرات کا اور ان کی خوبیوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے ۔ اور یہی ان کے کلام کا انفرادی رنگ ہے جو انھیں اپنے دور کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے ۔ شیفتہ ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ جس مضمون کو جس رنگ میں چاہا باندھ دیا ۔ ان کے کلام کی اہم خصوصیات میں ان کا انفرادی رنگ ، تغزل کا رچاؤ ، معنی آفرینی و تہہ داری ، جذبات کا خلوص ، حقیقت نگاری ، زبان و بیان کی صفائی ، صنائع بدائع ، حسن ترکیب و بندش الفاظ ، تصوّف ، اخلاق و حکمت ، آشوب زمانہ کی طرف لطیف اشارے ، تسلسل مضامین ، انفرادی و شخصی آہنگ شامل ہیں ۔ ان کے بہت سے اشعار بالکل آجکل کے انداز کے معلوم ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان کی فارسی شاعری کا تعلق ہے وہ بھی اپنے دور کی صف اول کے شعراء کی شاعری سے کم نہیں ہے ۔ ان کے فارسی دیوان میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں جو نظیری ، بیدل اور غالب وغیرہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں اور ان کی غزلوں سے کسی طرح سے کم رتبہ نہیں ہیں ۔ وہی زبان و بیان کی صفائی اور جذبات کا خلوص موجود ہے جو اس زمانے کی فارسی شاعری کا طرّہ امتیاز تھا ۔ ان کی فارسی شاعری کی قدر ان کے زمانے میں بھی کی جاتی اور وہ آج بھی ہمارے ادب کا سرمایہ ہے ۔ فارسی میں انھوں نے اردو کے مقابلے میں کم کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے وہ خوب ہے ۔ غالب اور مومن ایسے استادان فن نے بھی ان کی فارسی شاعری کی اہمیت و عظمت کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے جو بہت بڑی بات ہے ۔ شیفتہ طبعاً فارسی میں شعر کہنا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن بدلتے ہوئے حالات کے تحت اردو شاعری کی طرف بھی توجہ رہی ہے ۔ سچ تو

یہ ھے کہ شیفتہ نے دونون زبانون اردو اور فارسی مین بہترین شاعری کی اور شاعرانہ آداب کو پوری طرح نباھا ۔

بہ حیثیت نقاد و تذکرہ نگار :

شیفتہ اپنے دور کے مشہور سخن فہم تھے ۔ شاعری کے بارے مین ان کا نظریہ انفرادیت کا حامل ھے ۔ وہ صاف ستھرے معانی اور شگفتہ الفاظ کے استعمال کے قائل تھے ۔ وہ حسن بیان اور طرز ادا پر خاص توجہ دیتے تھے ۔ ان کی ناقدانہ صلاحیتون کا آئینہ دار ان کا تذکرہ " گلشن بے خار،، ھے ، جس مین شاعر کے انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی نہایت آزادانہ طریق پر کیا گیا ھے ۔ ان کے جملے مختصر ھین لیکن نہایت ھی معنی خیز ۔ انھون نے اپنے دور کے رواج سے ھٹ کر تنقیدی انداز اختیار کیا ھے ، جو ان کا اپنا ھے ۔ ان کی تنقیدی آراء نے آنے والے نقادون کو راہ دکھائی ھے ۔ ان کی تنقید نگاری کو جدید تنقید نگاری کا حرف اوّل کہا جا سکتا ھے ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی تنقید نگاری کے میدان مین شیفتہ کا موازنہ انگریزی ادب کے نقاد سر فلپ سڈنی سے کرتے ھین ۔ وہ فرماتے ھین :

" ھمارے تذکرہ نگارون مین اگر کسی کو نقاد کے دائرے مین لایا جا سکتا ھے تو وہ شیفتہ ھین ۔ جی چاھتا ھے کہ اردو تنقید مین انھین وھی مقام دیا جائے جو انگریزی مین سر فلپ سڈنی کو حاصل ھے ۔ شیفتہ اور سڈنی مین بہت سی مناسبتین ملتی ھین ۔ دونون

عالی خاندان صاحبان ذوق تھے ، شاعروں کے مربّی اور دوست اور خود بھی پیدائشی شاعر۔ دونوں کے کردار کی شرافت اور نیک دلی مشہور ھے ۔ انگریزی لفظ NOBLE سر فلپ سڈنی کے ساتھ منسوب ہوگیا اور یہی لفظ جس میں شرافت ، متانت اور بہت سے معنی آ جاتے ھیں شیفتہ کی تعریف کے لیے بھی مناسب ٹھہرے گا۔ دونوں شدّت کے مبتلائے عشق تھے اور دونوں نے اس کا اظہار شاعری میں کیا ھے۔ سڈنی کی شاعری صنف " سانیٹ ،، سے تمامتر وابستہ جو ھماری غزل سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ھے اور شیفتہ کی شاعری تمام تر غزل گوئی ھے ۔ مگر ان سب مناسبتوں سے زیادہ اھم مناسبت یہ ھے کہ دونوں اپنے اپنے ادب میں اسی چیز کی بنیاد رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ھیں جو نکتہ چینی کے دائرے سے نکل کر تنقید کے دائرے میں آ جاتی ھے ۔ سڈنی سے پہلے یوروپ کی تنقید میں بھی اسی قسم کی نکتہ چینی تھی جیسی ھمیں شیفتہ سے پہلے کے تذکرہ نگاروں میں ملتی ھے ۔ سڈنی نے اپنے تنقیدی مضمون میں عام اصولوں کی وضاحت کی اور اپنے دور کے ادب کا جائزہ لیا ۔ شیفتہ اس درجے تک نہیں پہنچے ھیں ۔ ان کا " گلشن بےخار" تذکرہ ھی ھے اور زیادہ تر تذکرے ھی کے خصوصیات رکھتا ھے ۔ مگر خاص بات اس میں یہ ھے کہ شاعروں کے ذکر اور ان پر رائے میں ھمیں وہ نظر ملتی ھے جو ھمیشہ تنقید نگاری کی جان اور روح رواں

رهے گی۔"[1]

شیفتہ کی ناقدانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان کے زمانے میں بھی اس دور کے شقہ لوگوں نے کیا اور آج بھی کیا جاتا ہے ۔ گلشن بے خار اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ شیفتہ اپنے دور کے بڑے نقاد تھے اور ان کے بعد آنے والے ناقدین ادب نے بھی ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا ہے ۔ شیفتہ بذات خود اگر بڑے شاعر نہ ہوتے تو شاید وہ بڑے نقاد بھی نہیں ہو سکتے تھے ۔ جس طرح ایک ماہر فن تعمیر ہی کسی عمارت کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اسی طرح ایک بڑا شاعر ہی شاعری کے حسن و قبح کی نشاندھی کر سکتا ہے ۔ گلشن بے خار میں مختلف شعراء کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ بڑی وزنی ہیں ۔ شیفتہ کے اختصار نے انھیں اور بھی معنی خیز بنا دیا ہے ۔ شیفتہ سے پہلے تنقید شعر کا انداز صرف تعریف و توصیف ہی تک محدود تھا مگر شیفتہ نے جہاں خوبیاں گنوائی ہیں وہاں خامیوں کی طرف بھی واضح اشارے کئے ہیں ۔ ان کا یہ انداز تنقید ان کے زمانے میں بھی کچھ لوگوں کو کھلا اور آج بھی کچھ لوگوں کی طبع نازک پر بار گزرتا ہے ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس زمانے میں تو ایسی تنقید کا رواج ہی نہیں تھا اور آج بھی ہم جلدی سے اپنے ہیرو کی کسی خامی کو آسانی سے سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔ شیفتہ ہی کے انداز تنقید سے متاثر ہو کر حالی نے جدید تنقید کی داغ بیل ڈالی اور مقدمہ شعر و شاعری ایسی تصنیف پیش

۱۔ گلشن بے خار (از شیفتہ) ، (پیش لفظ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی) ، ص ۲۵
مرتبہ محمد احسان الحق فاروقی

کی ۔ بلاشبہ شیفتہ اگر جدید تنقید نگاری کے بانی نہیں تو پیش رو ضرور ہیں ۔ حالی کی تربیت میں جو کردار شیفتہ نے ادا کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے ۔ حالی خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو شیفتہ کی مصاحبت سے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ کہیں اور سے حاصل نہیں ہوا ہے ۔

ج) بحیثیت نثر نگار :

شیفتہ نے زیادہ تر فارسی نثر لکھی ہے ۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خار گو اردو شاعروں کا تذکرہ ہے مگر فارسی زبان میں لکھا گیا ہے ۔ تذکرہ کی زبان مروّجہ اور معیاری ہے ۔ شیفتہ نہایت روانی و سلاست سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کے بیان میں کشش اور جاذبیت ہے ۔ اسی وجہ سے تنقید ایسا خشک موضوع بھی شیفتہ کے یہاں خشک نہیں رہتا ۔ شیفتہ کی تحریر اکثر حشو و زوائد سے پاک ہے ۔ شیفتہ کے طرز تحریر کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زبان و بیان پر کمال قدرت حاصل ہے ۔

شیفتہ کی دوسری فارسی تحریر ان کے خطوط ہیں جو " رقعات فارسی (لحن عراق) " کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔ شیفتہ کے خطوط سے جہاں ان کی فارسی دانی کا پتہ چلتا ہے وہاں ان کی عالمانہ شان بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ شیفتہ کے خطوط فارسی ادب کا شاہکار کہے جا سکتے ہیں ۔ ان کی زبان نہایت شستہ اور رواں ہے ۔ بالکل اہل زبان کا سا انداز ہے ۔ ان کی علمی و ادبی بصیرت اور ناقدانہ صلاحیتوں نے ان کی تحریر کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے ۔

شیفتہ کی اردو نثر کے صرف دو نمونے ہمارے سامنے آ سکے ہیں ۔ ایک تو ان کے وصیت نامے کے حوالے سے اور دوسرا غالب کی " تیغ تیز ،، میں مندرج جوابات کے حوالے سے۔ ان دونوں اردو تحریروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اردو میں بھی کبھی کبھی نثر نگاری کیا کرتے تھے ۔ " تیغ تیز ،، میں مندرج جوابات کی زبان گو اردو ہے لیکن اس پر فارسیت کا غلبہ ہے ۔ جوابات نہایت مختصر مگر جامع ہیں ۔ وصیت نامے کی زبان خالص اردو ہے جو نہایت سلیس اور عام فہم ہے ۔ شاید اس لیے کہ وہ عام لوگوں کے لیے ہے ۔ بہرحال ان دونوں تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ شیفتہ اردو نثر نگاری میں بھی عبور رکھتے تھے اور اردو نثر میں بھی اپنا مافی الضمیر بخوبی ظاہر کر سکتے تھے۔

د) بحیثیت درویش صفت ثقہ عالم دین :

شیفتہ جہاں شعر و شاعری میں مومن غالب سے مشورہ کرتے تھے وہاں دینی معاملات میں نقشبندیہ سلسلے میں بیعت بھی تھے ۔ شیفتہ ایام جوانی کے آغاز میں کچھ عرصہ " صہبا و صنم ،، کے چکر میں رہے مگر بہت جلد تائب ہو گئے ۔ شیفتہ کو بزرگان دین کی خدمت کا شروع ہی سے بہت شوق تھا ۔ حج بیت اللہ نے تو ان کی کایا ہی پلٹ دی ۔ اب ان کا زیادہ تر وقت ذکر و اذکار میں گزرتا ۔ شاہ عبدالغنی مجدّدی نقشبندی نے آپ کو نقشبندیہ سلسلے میں سند خلافت بھی عطا کی ۔ شاہ صاحب ان کو اپنے خلفائے اجل سے سمجھتے تھے اور اپنے مریدین کو تکمیل کے واسطے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے ۔ شیفتہ نے علوم دین کا خود بھی گہرا مطالعہ کیا اور مختلف اوقات میں دیگر علماء

سے بھی استفادہ کیا اور سلوک کی منزلیں بھی طے کین ۔ شیفتہ آخر عمر تک پابند شرع رہے اور درویشانہ مسلک پر قائم رہے ۔ شیفتہ کے گھر پر اکثر درویشون اور اہل اللہ کا مجمع لگا رہا کرتا تھا ۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادات مین گزرتا تھا ۔ شیفتہ بزرگان دین کے مزارات پر جا کر حاضری بھی دیا کرتے تھے ۔

۵۔ شیفتہ ایک نظر مین :

۱۔ شیفتہ کے دادا (ولی داد خان) وارد ھند ھوئے	۱۷۵۴ء تا ۱۸۰۶ء
۲۔ شیفتہ کے والد (نواب مرتضیٰ خان) کی پیدائش (قیاس)	۱۷۶۷ء کے قریب
۳۔ شیفتہ کے والد کو ھوڈل پلول کی جاگیر ملی	۱۸۰۴ء (اواخر)
۴۔ شیفتہ کے والد نے جہانگیرآباد کا علاقہ خریدا	۱۸۱۳ء
۵۔ شیفتہ کے والد کی وفات (قیاس)	۱۸۱۷ء
۶۔ شیفتہ کی ولادت	۱۲۲۴ھ - ۱۸۰۹ء
۷۔ شیفتہ کی شاعری کا باقاعدہ آغاز (عمر سولہ سال)	۱۲۴۰ھ - ۱۸۲۴-۱۸۲۵ء
۸۔ شیفتہ کے عشق مجازی کا آغاز	۱۲۴۴ھ - ۱۸۲۸-۱۸۲۹ء
۹۔ شیفتہ کے شغل شاعری مین کمی (عمر تئیس سال)	۱۲۴۷ھ - ۱۸۳۱-۱۸۳۲ء
۱۰۔ شیفتہ کے عشق کا انجام	نومبر ۱۸۳۸ء
۱۱۔ شیفتہ کے سفر حج کا آغاز	۲/ مارچ ۱۸۳۹ء
۱۲۔ شیفتہ کی سفر حج سے واپسی	۱۵/ فروری ۱۸۴۱ء

۱۳- شیفتہ کی پہلی شادی (قیاس)	۱۲۵۸ھ - ۱۸۴۲-۱۸۴۳ء
۱۴- شیفتہ کی دوسری شادی (قیاس)	۱۲۶۷ھ - ۱۸۵۰-۱۸۵۱ء
۱۵- شیفتہ کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت کے الزام میں سزا	اپریل ۱۸۵۸ء
۱۶- شیفتہ کی قید و بند سے رہائی	اواخر ۱۸۵۸ء یا اوائل جنوری ۱۸۵۹ء
۱۷- شیفتہ کی جائداد اور پنشن واگزاشت نہیں ہوئی	فروری ۱۸۶۰ء تک
۱۸- شیفتہ کو کچھ جائداد مل گئی مگر پنشن واگزاشت نہ ہوئی	۲۰- جنوری ۱۸۶۱ء تک
۱۹- شیفتہ کی مصاحبت میں حالی کا آنا	۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۹ء
۲۰- شیفتہ کی وفات بہ عارضۂ سرطان (دہلی)	یکشنبہ یکم ربیع الثانی ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۸۶۹ء -

------

کتابیات

۱- آزاد محمد حسین — آب حیات — شیخ مبارک علی لاہور، بار چہاردہم

۲- آزاد محمد حسین (مرتب) — دیوان ذوق — علمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء

۳- ابوالحسنات ندوی — ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں — الیکٹرک پریس امرتسر ۱۳۳۱ھ

۴- ابوالحسن علی ندوی — سیرت سید احمد شہید — خواجہ بک ڈپو لاہور ۱۹۵۸ء

۵- ابوالخیر کشفی — اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر — کراچی ، اگست ۱۹۷۵ء

۶- ابواللیث صدیقی ڈاکٹر — تذکرۂ حالی — مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۳۸ء

۷- ایضاً — لکھنؤ کا دبستان شاعری — اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء

۸- ایضاً — نظیر اکبرآبادی ان کا عہد اور شاعری — اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء

۹- ایضاً — جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری — اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۵۳ء

۱۰- اثر نواب امداد امام سید — کاشف الحقائق — مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۶ء

۱۱- احتشام حسین سید — تنقیدی جائزے — الہ آباد پبلشنگ ہاؤس ، الہ آباد ۱۹۵۱ء

۱۲- اختر قاضی احمد میاں جوناگڑھی (مرتب) — تذکرہ اہل دہلی (سرسید احمد خان) — انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۵ء

۱۳- اصغر علی شیخ وغیرہ — اردو زبان و ادب — مکتبۂ کاروان، لاہور

۱۴- اعجاز حسین سید ڈاکٹر	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۶ء
۱۵- افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء
۱۶- ایضاً (مرتب)	کلیات نظم حالی جلد اوّل	ایضاً ، ۱۹۶۸ء
۱۷- ایضاً (مرتب)	ایضاً جلد دوم	ایضاً ، ۱۹۷۰ء
۱۸- افسر حامد اللہ میرٹھی	تنقیدی اصول اور نظریے	نامی پریس، لاہور ۱۹۶۵ء
۱۹- اقتدا حسین ڈاکٹر (مرتب)	تذکرہ مخزن نکات (قائم چاند پوری)	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء
۲۰- الطاف علی سید بریلوی	حیات حافظ رحمت خان	آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس ۱۹۶۳ء
۲۱- الطاف علی و محمد ایوب قادری (مرتب)	علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں	ایضاً ۱۹۷۰ء
۲۲- امیر احمد علوی	بہادر شاہ ظفر	لکھنؤ ، ۱۹۳۵ء
۲۳- باری علیگ	کمپنی کی حکومت	سویرا آرٹ پریس، لاہور ۱۹۶۹ء
۲۴- باطن، قطب الدین	گلستان بے خزاں	نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء
۲۵- بشیر احمد ارشد (مترجم)	ظہور پاکستان (از چوہدری محمد علی)	مکتبہ کاروان، لاہور
۲۶- بشیرالدین احمد دہلوی	واقعات دارالحکومت	شمسی مشین پریس، آگرہ ۱۹۱۹ء
۲۷- تبسم کاشمیری (مرتب)	تاریخ ادب اردو (سکینہ)	علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۶۷ء
۲۸- تنویر احمد علوی (مرتب)	کلیات ذوق، جلد اول	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
۲۹- ایضاً	ایضاً جلد دوم	ایضاً ۱۹۶۷ء

۳۰- تنہا عبدالحیٔ	مراۃ الشعر، جلد اول	شیخ مبارک علی، لاہور
۳۱- ایضاً	ایضاً جلد دوم	ایضاً
۳۲- جلیل احمد وغیرہ (مترجم)	اصول تنقید (ایبر کرومبی)	اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء
۳۳- جمیل جالبی ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو، جلد اول	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۵ء
۳۴- حالی الطاف حسین خواجہ	حیات جاوید	اورنگ آباد، ۱۹۳۹ء
۳۵- ایضاً	ایضاً	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور ۱۹۶۵ء
۳۶- ایضاً	دیوان حالی	مظفر بک ڈپو، لاہور
۳۷- ایضاً	یادگار غالب، جلد دوم (فارسی)	اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۲ء
۳۸- ایضاً	مقدمہ شعر و شاعری	کشمیر کتاب گھر، لاہور ۱۹۷۳ء
۳۹- حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۶ء
۴۰- حبیب اشعر (مرتب)	دیوان شیفتہ (اردو کلام)	مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۶۵ء
۴۱- حبیب الرحمن خان شروانی (مرتب)	نکات الشعراء (میر تقی میر)	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد
۴۲- حسرت موہانی	نکات سخن	انتظامی پریس، حیدرآباد
۴۳- حسرت موہانی و فراق گورکھپوری	دیوان مصحفی (انتخاب)	مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۵ء
۴۴- حسن نظامی	پرانی دہلی (ترجمہ درگاہ قلیخان)	
۴۵- حکیم فصیح الدین رنج	بہارستان ناز	مطبوعہ دارالعلوم، میرٹھ ۱۸۶۹ء

۴۶- حکیم قدرت اللہ خان قاسم	مجموعۂ نغز (مرتبہ محمود شیرانی)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۳ء
۴۷- حمید احمد خان (مرتب)	دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ)	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۹ء
۴۸- خلیق احمد نظامی	تاریخ مشائخ چشت	دہلی، طبع اول، ۱۹۵۳ء
۴۹- خلیل الرحمن داؤدی (مرتب)	تذکرہ گلستان سخن (قادربخش صابر)	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء
۵۰- ایضاً	مجموعہ نثر غالب (اردو)	ایضاً ۱۹۶۷ء
۵۱- ایضاً	یادگار غالب (از حالی)	ایضاً ۱۹۶۳ء
۵۲- ذکی احمد خواجہ (مرتب)	انتخاب کلام نواب مصطفی خان شیفتہ	جدید کتاب گھر، دہلی ۱۹۵۹ء
۵۳- رزاقی شاہد حسین	سید امیر علی	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۰ء
۵۴- رفیق حسین ڈاکٹر	اردو غزل کی نشوونما	لالہ رام نرائن پبلشر، الہ آباد ۱۹۵۵ء
۵۵- رئیس احمد جعفری	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	کتاب منزل، لاہور ۱۹۵۵ء
۵۶- ایضاً	واجد علی شاہ اور ان کا عہد	ایضاً ۱۹۵۷ء
۵۷- ریاض فاطمہ	شیفتہ کی ادبی خدمات (مقالہ ایم - اے)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۶ء
۵۸- زبیری ہلال احمد (مترجم)	برّعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ (از اشتیاق حسین قریشی)	کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۶۷ء
۵۹- زور محی الدین قادری ڈاکٹر	روح تنقید	مکتبہ معین الادب، لاہور ۱۹۵۵ء
۶۰- زین العابدین سید (مترجم)	(رہ آورد از شیفتہ) سراج منیر	مطبع آگرہ اخبار، آگرہ ۱۹۱۰ء

۶۱- سرور آل احمد	نئے اور پرانے چراغ	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۵ء
۶۲- سری رام لالہ	خمخانہ جاوید (تذکرہ ہزار داستان)	کتاب ہمدرد پریس، دہلی ۱۹۲۶ء
۶۳- سلام سندیلوی ڈاکٹر	ادب کا تنقیدی مطالعہ	میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۳ء
۶۴- سودا مرزا رفیع	کلیات سودا، جلد اول	منشی نولکشور، لکھنؤ ۱۹۳۲ء
۶۵- سید محمد مولوی	ارباب نثر اردو	مکتبہ معین الادب، لاہور ۱۹۵۰ء
۶۶- سید احمد خان سر	اسباب بغاوت ہند	اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۵۷ء
۶۷- سید عبداللہ ڈاکٹر	شعرائے اردو کے تذکرے	مکتبۂ جدید، لاہور ۱۹۵۲ء
۶۸- ایضاً	مباحث	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۵ء
۶۹- ایضاً	ولی سے اقبال تک	مکتبہ خیابان ادب، لاہور ۱۹۶۶ء
۷۰- ایضاً	اشارات تنقید	ایضاً ۱۹۶۶ء
۷۱- سید سبط حسن رضوی ڈاکٹر	فارسی گویان پاکستان جلد یکم	مرکز تحقیقات فارسی، راولپنڈی ۱۹۷۴ء
۷۲- شادان بلگرامی	روح المطالب فی شرح دیوان غالب	شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۶۷ء
۷۳- شبلی نعمانی مولانا	شعرالعجم جلد چہارم و پنجم	تاج بک ڈپو، لاہور
۷۴- شنکر داس لالہ	کارونیشن دربار دہلی کی سیر	مطبع مفید عام، لاہور ۱۹۰۳ء
۷۵- شوق قدرت اللہ رامپوری	طبقات الشعراء مرتبہ نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۸ء
۷۶- شیخ چاند	سودا	انجمن ترقی اردو، دکن ۱۹۳۶ء

۷۷- شیفتہ نواب محمد مصطفی خان	رہ آورد (ترغیب السالک الی احسن السالک)	مطبع مصطفائی، دہلی ۱۲۸۳ھ/۶۷-۱۸۶۶ء
۷۸ - ایضاً	دیوان و رقعات فارسی	مطبع نیو امپیریل پریس، لاہور ۱۸۸۷ء
۷۹- ایضاً	کلیات شیفتہ و حسرتی	نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۶ء
۸۰- ایضاً	دیوان شیفتہ (مرتبہ صلاح الدین احمد)	اکادمی پنجاب، لاہور ۱۹۵۴ء
۸۱- ایضاً	گلشن بے خار	مطبع منشی نولکشور، لکھنو ۱۸۷۴ء
۸۲- ایضاً	گلشن بے خار (اردو ترجمہ)	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۴ء
۸۳- صابر قادر بخش مرزا	گلستان سخن	طبع اوّل ، دہلی
۸۴- صادق قریشی	ذکر حالی	اردو مرکز، لاہور ۱۹۴۹ء
۸۵- صالحہ عابد حسین	یادگار حالی	آئینۂ ادب، لاہور ۱۹۶۶ء
۸۶- صدیق الرحمن چغتائی	ماسٹر رام چندر	دہلی، طبع اول ۱۹۶۱ء
۸۷- صدیق حسن نواب	شمع انجمن	مطبع شاہجہانی ، ۱۲۷۸ء
۸۸- صفدر حسین ڈاکٹر	سر شیخ عبدالقادر کی حیات و خدمات (قلمی ـ مقالہ پی ایچ ڈی)	شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی
۸۹- صفیر بلگرامی	جلوۂ خضر حصہ اول	مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

۹۰- صفیہ عبدالحق مس	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ (مقالہ ایم - اے اردو - ٹائپ)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۵۰ء
۹۱- ضمیر احمد	تذکرۂ اوراق گل	کتاب خانہ ، رامپور ۱۹۲۳ء
۹۲- ضیاء الدین احمد برنی (مرتب)	تذکرۂ مولوی ذکاء اللہ دہلوی (از سی - ایف - اینڈریوز)	تعلیمی مرکز، کراچی ۱۹۵۲ء
۹۳- طفیل احمد (مترجم)	تذکرہ اشپرنگر (یادگار شعراء)	الہ آباد اکیڈمی، ہندوستان ۱۹۳۳ء
۹۴- عابد علی عابد سید	اصول انتقادیات	مجلس ترقی اردو، لاہور
۹۵- ایضاً	تنقیدی مضامین	مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۶ء
۹۶- ایضاً (مرتب)	موازنہ انیس و دبیر (از شبلی)	مجلس ترقی ادب، لاہور
۹۷- عبادت بریلوی ڈاکٹر	شاعری اور شاعری کی تنقید	اردو دنیا، کراچی ۱۹۶۵ء
۹۸- ایضاً	غالب اور مطالعۂ غالب	رائٹرز اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۹ء
۹۹- ایضاً	غزل اور مطالعۂ غزل	انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۵ء
۱۰۰- ایضاً	مومن اور مطالعۂ مومن	اردو دنیا، کراچی ۱۹۶۱ء
۱۰۱- عبدالاحد خان خلیل	اردو غزل کے پچاس سال	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ
۱۰۲- عبدالحکیم خلیفہ ڈاکٹر	افکار غالب	مکتبہ معین الادب، لاہور ۱۹۵۴ء
۱۰۳- عبدالحق مولوی (مرتب)	تذکرۂ ہندی گویان (مصحفی)	انجمن ترقی اردو،دکن ۱۹۳۳ء
۱۰۴- ایضاً	انتخاب کلام میر	انجمن ترقی ہند ، دہلی ۱۹۳۵ء
۱۰۵- ایضاً	مرحوم دہلی کالج	انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۶۲ء

۱۰۶- عبدالحمید ڈاکٹر وغیرہ	مطالعہ پاکستان	پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور ۱۹۷۵ء
۱۰۷- عبدالرزاق جمالی (مرتب)	نگارشات غالب	تاج بک ڈپو، لاہور ۱۹۵۲ء
۱۰۸- عبدالحئی سید	گل رعنا (تذکرۂ شعرائے اردو)	مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۷۰ھ/۱۹۴۹-۵۰ء
۱۰۹- عبدالسلام خورشید ڈاکٹر	داستان صحافت	مکتبہ کاروان، لاہور ۱۹۷۳ء
۱۱۰- ایضاً	صحافت پاکستان میں	لاہور ۱۹۶۳ء
۱۱۱- عبدالشکور احسن (مرتب)	دستنبو (از غالب)	مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۸ء
۱۱۲- ایضاً	مہر نیمروز (از غالب)	ایضاً
۱۱۳- عبدالعلیم نصراللہ خان خویشگی	گلشن ہمیشہ بہار	۱۹۵۳-۵۴ء
۱۱۴- عبدالصمد صارم	مقام غالب	ادارۂ عالیہ، لاہور ۱۹۶۸ء
۱۱۵- عبداللہ ملک	بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جہد آزادی	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
۱۱۶- عبداللہ یوسف علی	انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	کریم سنز، کراچی ۱۹۶۷ء
۱۱۷- عبدالقادر سروری	جدید اردو شاعری	کتاب منزل، لاہور ۱۹۴۳ء
۱۱۸- عبدالقدوس ہاشمی	تقویم تاریخ (قاموس تاریخ)	مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی، کراچی ۱۹۶۵ء

۱۱۹۔ عبدالرسول صاحبزادہ	تحریک پاکستان	ایم - آر- برادرز، لاہور ۱۹۷۲ء
۱۲۰۔ عرشی امتیاز علی	دیوان غالب (نسخہ عرشی)	انجمن ترقی اردو (ہند)، علیگڑھ ۱۹۵۸ء
۱۲۱۔ علی حسن خان نواب	صبح گلشن	مطبع شاہجہانی، ۱۸۷۸ء
۱۲۲۔ علی صفدر جعفری وغیرہ	تاریخ ادب اردو (ثانوی سطح کے لیے، مقالہ ایم - ایڈ)	ادارہ تعلیم و تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۶ء
۱۲۳۔ عندلیب شادانی ڈاکٹر	تحقیق کی روشنی میں	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۳ء
۱۲۴۔ غالب اسداللہ خان	اردوئے معلّی (ہر دو حصے)	ایضاً ۱۹۲۶ء
۱۲۵۔ ایضاً	عود ھندی	مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۹۳۱ء
۱۲۶۔ غلام حسین ذوالفقار ڈاکٹر	اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	مطبع جامعہ پنجاب، لاہور۱۹۶۶ء
۱۲۷۔ فائق کلب علی خان رامپوری	مومن	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۱ء
۱۲۸۔ ایضاً	گلشن بے خار (از شیفتہ)	ایضاً ۱۹۷۳ء
۱۲۹۔ ایضاً	کلیات شیفتہ (اردو)	ایضاً ۱۹۶۵ء
۱۳۰۔ ایضاً	کلیات مومن جلد اوّل	ایضاً ۱۹۶۴ء
۱۳۱۔ ایضاً	کلیات مومن جلد دوم	ایضاً ۱۹۶۴ء
۱۳۲۔ فرحت اللہ بیگ مرزا	دھلی کی آخری شمع (دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ)	تاج بک ڈپو، لاہور
۱۳۳۔ ایضاً	ایضاً	شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۵۰ء

۱۳۴۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۲ء
۱۳۵۔ فیاض محمود سید (مدیر خصوصی)	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھویں جلد	پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء
۱۳۶۔ فیاض محمود سید و عبادت بریلوی (مدیر خصوصی)	ایضاً نویں جلد	ایضاً ۱۹۷۲ء
۱۳۷۔ کریم الدین	تذکرہ طبقات شعرائے ہند	(مملوکہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۸۴۸ء
۱۳۸۔ کنہیا لال پنڈت	تاریخ بغاوت ہند	مطبع منشی نولکشور، لکھنو ۱۸۸۹ء
۱۳۹۔ کوکب تفضل حسین (مرتب)	سوانح دہلی	مطبع افتخار، دہلی، ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵-۹۶ء
۱۴۰۔ کیفی برجموہن دتاتریہ	منشورات	مکتبہ معین الادب، لاہور ۱۹۵۰ء
۱۴۱۔ ایضاً	کیفیہ	ایضاً ۱۹۵۰ء
۱۴۲۔ گارساں دتاسی	خطبات	اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
۱۴۳۔ مالک رام	ذکر غالب	مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، دہلی ۱۹۶۳ء
۱۴۴۔ ایضاً	تلامذۂ غالب	مرکز تصنیف و تالیف، نکودر ۱۹۵۷ء
۱۴۵۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مرتب)	کلیات غالب (فارسی) جلد اول	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
۱۴۶۔ ایضاً	ایضاً جلد دوم	ایضاً
۱۴۷۔ ایضاً	ایضاً جلد سوم	ایضاً

۱۴۸- مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مرتب)	تاریخ ادب اردو (سکسینہ)	ولی سنز پبلشرز، لاہور
۱۴۹- مرزا ادیب (مرتب)	تنقیدی مقالات حصہ اول	لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۵ء
۱۵۰- ایضاً	ایضاً حصہ دوم	ایضاً ۱۹۶۴ء
۱۵۱- محمد احسان الحق فاروقی (مترجم)	گلشن بے خار (از شیفتہ)	آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، کراچی ۱۹۶۲ء
۱۵۲- محمد اسمعیل شیخ	کلیات نثر حالی، جلد اول	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
۱۵۳- ایضاً	ایضاً جلد دوم	ایضاً ۱۹۶۸ء
۱۵۴- ایضاً	تذکرہ حالی	حالی بکڈپو پانی پت، ۱۹۳۵ء
۱۵۵- ایضاً	مکاتیب حالی	اردو مرکز، لاہور ۱۹۵۰ء
۱۵۶- محمد اکرام شیخ	غالب نامہ (آثار غالب)	شیخ نذیر احمد کتب خانہ، بمبئی، چوتھا ایڈیشن
۱۵۷- ایضاً	حکیم فرزانہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۷ء
۱۵۸- ایضاً	رود کوثر	فیروز سنز، لاہور ۱۹۵۸ء
۱۵۹- ایضاً	موج کوثر	ایضاً ۱۹۶۶ء
۱۶۰- ایضاً	آب کوثر	ایضاً ۱۹۶۵ء
۱۶۱- محمد ایوب قادری	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات	پاک اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۶ء
۱۶۲- ایضاً (مرتب)	عہد بنگش (از ولی اللہ فرخ آبادی)	آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس کراچی ۱۹۶۵ء

۱۶۳- محمد ایوب قادری (مرتب) وقائع عبدالقادر خانی جلد اول کراچی ۱۹۶۰ء

۱۶۴- محمد بشیر دکتر (مرتب) فہرست مخطوطات شیرانی جلد اول دانشگاہ پنجاب ، فیروز سنز ، لاہور ۱۹۶۸ء

۱۶۵- ایضاً (مرتب) ایضاً جلد دوم دانشگاہ پنجاب، دین محمدی پریس، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۶۶- ایضاً (مرتب) ایضاً جلد سوم دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۶۷- محمد جمیل احمد بریلوی تذکرۂ شاعرات اردو قومی کتب خانہ، دہلی ۱۹۴۳ء

۱۶۸- محمد خان بہادر میر نواب اعظم الدولہ عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱۶۹- محمد شفیع خواجہ دہلوی دلّی کا سنبھالا مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۳۸ء

۱۷۰- ایضاً ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی مکتبہ جدید ، لاہور ۱۹۵۷ء

۱۷۱- محمد شریف میاں جمالیات کے تین نظریے مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء

۱۷۲- محمد عارف (مترجم) تخلیق ادب (میکنگ آف لٹریچر) لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۵ء

۱۷۳- محمد عتیق صدیقی گلکرسٹ اور اس کا عہد انجمن ترقی اردو ہند ، علیگڑھ ۱۹۶۰ء

۱۷۴- ایضاً ہندوستانی اخبار نویسی علی گڑھ ۱۹۵۷ء

۱۷۵- محمد عسکری مرزا (مترجم) تاریخ ادب اردو (سکسینہ) عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور

۱۷۶- محمد مختار قریشی تاریخ التعلیم پنجاب کتاب گھر اردو بازار، لاہور

۱۷۷- محمد میاں سید علماء ہند کا شاندار ماضی مکتبۂ محمودیہ، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۷۸- محمد موسیٰ مقام غالب ادارہ نئی تحریریں ، پشاور ۱۹۶۵ء

۱۷۹- محمود احمد فاروقی (مترجم)	منتخب اللباب (از خافی خان)	نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء
۱۸۰- مختارالدین احمدڈاکٹر	نقد غالب	انجمن ترقی هند، علیگڑھ ۱۹۵۲ء
۱۸۱- مسعود حسن رضوی	ھماری شاعری	نولکشور پریس، لکھنؤ ۱۹۵۳ء
۱۸۲- معین الحق سید (مرتب)	آثار الصنادید (سرسیداحمدخان)	پاکستان هسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۶ء
۱۸۳- ممتاز منگلوری (مرتب)	طیبت غزل	لاهور اکیڈمی، لاهور ۱۹۶۵ء
۱۸۴- مهدی بیگم (مرتب)	افادات مهدی	شیخ مبارک علی، لاهور ۱۹۳۹ء
۱۸۵- مهر غلام رسول مولانا	۱۸۵۷ء کے مجاهد	کتاب منزل، لاهور ۱۹۳۹ء
۱۸۶- ایضاً	۱۸۵۷ء	ایضاً
۱۸۷- ایضاً	سرگزشت مجاهدین	ایضاً ۱۹۵۶ء
۱۸۸- ایضاً	سید احمد شهید	ایضاً ۱۹۵۳ء
۱۸۹- مهر غلام رسول مولانا (مرتب)	خطوط غالب حصہ اول	کتاب منزل، لاهور ۱۹۵۷ء
۱۹۰- ایضاً	خطوط غالب حصہ دوم	ایضاً ۱۹۵۷ء
۱۹۱- ایضاً	ایضاً جلد اول	مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی لاهور ۱۹۶۹ء
۱۹۲- ایضاً	ایضاً جلد دوم	ایضاً ۱۹۶۹ء
۱۹۳- ایضاً	نقش آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد)	لاهور ۱۹۵۸ء
۱۹۴- ایضاً	غالب	شیخ مبارک علی، لاهور ۱۹۳۶ء

۱۹۵- ناصرالدین ناصر	دبستان غالب (پیش لفظ علی صفدر جعفری)	مکتبۂ الفتح، لاہور ۱۹۲۹ء
۱۹۶- ناصر کاظمی وغیرہ	سن ستاون میری نظر میں	آئینۂ ادب، لاہور ۱۹۵۷ء
۱۹۷- ناظر حسن زیدی	مومن دہلوی (مقالہ پی ایچ ڈی)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۱۹۸- نبی احمد باجوہ	شُشجہات غالب	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، لاہور
۱۹۹- نذیر احمد ملک (مرتب)	اردو نثر پر تنقیدی نظر	تاج بک ڈپو، لاہور ۱۹۶۶ء
۲۰۰- ایضاً	اردو زبان اور ہماری ثقافت	ایضاً ۱۹۶۶ء
۲۰۱- ایضاً	ادب اور تنقید	ایضاً ۱۹۶۶ء
۲۰۲- ایضاً	اردو نظم پر تنقیدی نظر	ایضاً ۱۹۶۶ء
۲۰۳- نساخ	سخن الشعراء	مطبع نولکشور، لکھنو ۱۲۸۱ھ/ ۶۵-۱۸۶۴ء
۲۰۴- نصیب اختر (مترجم و مرتب)	شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار (لوئی آنتی پولیر و لوئی لوران دوپیسی)	ایچ - ایم - سعید اینڈ کمپنی کراچی ۱۹۶۷ء
۲۰۵- نصیر حسین خان خیال	داستان اردو	ادارۂ اشاعت اردو، دکن
۲۰۶- نشتر جالندھری	روح غالب شرح دیوان غالب	
۲۰۷- نظامی خلیق احمد (مرتب و (مترجم)	۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (از عبداللطیف)	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء
۲۰۸- نورالحسن نواب	نگارستان سخن	مطبع شاہجہان ۱۲۹۵ھ/ ۱۸ ۵ء

۲۰۹- نورالحسن ہاشمی	دلّی کا دبستان شاعری	ادارہ فروغ اردو، لکھنو ۱۹۶۵ء
۲۱۰- نیاز فتحپوری	انتقادیات	ادارہ ادب العالیہ، کراچی ۱۹۵۹ء
۲۱۱- وفا راشدی	بنگال میں اردو	مکتبہ اشاعت اردو، حیدرآباد سندھ ۱۹۵۵ء
۲۱۲- وقار عظیم سید (مدیر خصوصی)	تاریخ ادبیات پاکستان و ہند ساتویں جلد	پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء
۲۱۳- ایضاً	ہماری داستانیں	اردو مرکز، لاہور ۱۹۶۳ء
۲۱۴- وحید قریشی ڈاکٹر (مرتب)	مقدمۂ شعر و شاعری (از حالی)	مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۵۳ء
۲۱۵- ایضاً *	پنجاب میں اردو (محمود شیرانی)	کتاب نما، لاہور ۱۹۷۳ء
۲۱۶- ایضاً *	دیوان آتش (انتخاب)	مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۶ء
۲۱۷- وزیرالحسن عابدی سید (مرتب)	سبد چین (غالب)	مجلس یادگار غالب، جامعہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۹ء
۲۱۸- ایضاً *	باغ دو در (غالب)	اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۸ء
۲۱۹- ایضاً *	پنج آہنگ (غالب)	مجلس یادگار غالب، جامعہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۹ء
۲۲۰- وزیر حسن	دلّی کا آخری دیدار	دہلی ۱۹۳۵ء
۲۲۱- ولی اشرف صبوحی (مرتب)	بزم آخر (فیض الدین مشی دہلوی)	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۵ء
۲۲۲- ہاشمی فریدآبادی سید	تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۳ء

۲۲۳- یونس احمر (مترجم) سیرالمتاخرین(زوال سلطنت مغلیہ از غلام حسین طباطبائی) نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۸ء

مخطوطات :

۱- دیوان شیفتہ (اردو)	رضا لائبریری رامپور
۲- ترغیب السالک الی احسن المسالک (رہ آورد)	ایضاً*
۳- ایضاً*	مملوکہ خلیل الرحمن داودی، لاہور
۴- رقعات فارسی (لحن عراق)	ایضاً*
۵- گلشن بے خار	* شیفتہ کلکشن ،، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

رسائل و اخبارات :

۱- آجکل	جنوری ۱۹۳۱ء ، دهلی
۲- آجکل (غالب نمبر)	۱۹۵۳ء ، دهلی
۳- ادب لطیف	مارچ ۱۹۵۰ء ، لاهور
۴- ادب لطیف (غالب نمبر)	جلد ۶۹، شمارہ ۱۱، ۱۲، لاهور
۵- الزبیر (تحریک آزادی نمبر) ۱۸۵۷ء	اردو اکیڈمی ، بہاولپور ۱۹۷۰ء
۶- اردو ڈائجسٹ هما (غالب نمبر)	جلد ۵، شمارہ ۳۳، مارچ ۱۹۶۹ء، هما پبلیکیشنز، دهلی (نئی دهلی)

۷- اردو نامہ — شمارہ ۳۰، جنوری ۱۹۶۸ء، ترقی اردو بورڈ، کراچی

۸- اردو نامہ — شمارہ ۳۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۸ء، ترقی اردو بورڈ، کراچی

۹- اردوئے معلّی — اکتوبر ۱۹۰۳ء، علی گڑھ

۱۰- اورینٹل کالج میگزین — جلد ۱۳، عدد ۱، بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء، عدد مسلسل ۵۱، لاہور

۱۱- ایضاً — جلد ۲۹، عدد ۳-۴، عدد مسلسل ۱۱۳-۱۱۴، بابت ماہ مئی و اگست ۱۹۵۳ء، لاہور

۱۲- ایضاً — جلد ۳۲، عدد ۱، عدد مسلسل ۱۲۳، نومبر ۱۹۵۵ء، لاہور

۱۳- ایضاً — نومبر ۱۹۵۹ء

۱۴- ایضاً — ستمبر و دسمبر ۱۹۷۱ء، جلد ۴۷، عدد ۳، ۴، شمارہ مسلسل ۱۸۶، ۱۸۷، لاہور

۱۵- ایضاً — خصوصی شمارہ بتقریب جشن صدسالہ اورینٹل کالج لاہور"، جلد ۴۸: عدد ۱، ۲، شمارہ مسلسل ۱۸۸، ۱۸۹، مارچ، جون ۱۹۷۲ء، لاہور

۱۶- ایضاً — جلد ۵۰، عدد ۱، ۲، ۳، ۴- شمارہ مسلسل ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۱۹۷۴ء لاہور

۱۷- ایضاً — جلد ۵۱، عدد ۳، ۴- شمارہ مسلسل ۲۰۲، ۲۰۳، لاہور

۱۸- اورینٹل کالج میگزین	شمارہ مخصوص دسمبر ۱۹۷۰م و فارس ، ژوئن ۱۹۷۱م، جلد ۴۶ ، عدد ۳ ، شمارہ مسلسل ۱۸۳ ، ۱۸۴ ، ۱۸۵ ، جلد ۴۷ ، عدد ۱ ، ۲ ، لاہور
۱۹- ایضاً* (فہارس) ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین	۱۹۲۵ میلادی تا ۱۹۶۷ء ، لاہور ۱۹۸۰ء میلادی
۲۰- تسنیم (مدیر خانی بدایونی)	جلد اول ، جنوری ۱۹۳۱ء ، شمارہ ۱ ، آگرہ
۲۱- ایضاً*	جلد اول ، فروری ۱۹۳۱ء، شمارہ ۲ ، آگرہ
۲۲- ایضاً*	جلد اول ، مارچ ۱۹۳۱ء، شمارہ ۳ ، آگرہ
۲۳- جامعة	مئی ۱۹۲۷ء ، دہلی
۲۴- حیات سخن	جلد ۱ ، جنوری ۱۹۳۱ ، نمبر۳ ، حیدرآباددکن
۲۵- ایضاً*	جلد ۱ ، جنوری ۱۹۳۱ء، نمبر ۳ ، حیدرآباددکن
۲۶- ایضاً*	جلد ۱ ، فروری ۱۹۳۱ء، نمبر ۵ ، حیدرآباددکن
۲۷- حیات سخن	جلد ۱ ، مارچ ۱۹۳۱ء، نمبر ۶ ، حیدرآباددکن
۲۸- دہلی کالج میگزین (قدیم دہلی کالج نمبر)	۱۹۵۳ء ، دہلی
۲۹- سرسید نمبر (نقش ثانی)	۱۹۶۸-۱۹۶۹ ، اردو کالج ، کراچی
۳۰- سویرا	شمارہ ۲۹ ، لاہور
۳۱- صحیفہ	نمبر ۳۳، شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء ، مجلس ترقی ادب لاہور
۳۲- صحیفہ	جون ۱۹۵۸ء ، مجلس ترقی ادب لاہور

۳۳- صحیفہ — دسمبر ۱۹۵۸ء ، مجلس ترقی ادب لاہور

۳۴- ایضاً — ستائیسواں شمارہ، اپریل ۱۹۶۴ء، مجلس ترقی ادب لاہور

۳۵- ایضاً (غالب نمبر) — اڑتالیسواں شمارہ ، جولائی ۱۹۶۹ء ، ایضاً

۳۶- عالمگیر — فروری ۱۹۳۳ء

۳۷- علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) — علی گڑھ

۳۸- کریسنٹ (حالی نمبر) — ستمبر ۱۹۶۹ء ، اسلامیہ کالج ، ریلوے روڈ ، لاہور

۳۹- کریسنٹ (شبلی نمبر) — جنوری ۱۹۷۱ء ، ایضاً

۴۰- مخزن — اپریل ۱۹۵۰ء ، جلد ۳، نمبر ۴، لاہور

۴۱- نقوش (ادب عالیہ نمبر) — ۱۹۶۰ء ، ادارۂ فروغ اردو، لاہور

۴۲- نقوش (آپ بیتی نمبر) — جون ۱۹۶۴ء ، ایضاً

۴۳- نقوش (غزل نمبر) — طبع ثانی فروری ۱۹۵۶ء، ایضاً

۴۴- نقوش (خطوط نمبر) — شمارہ ۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ایضاً

۴۵- نقوش (شخصیات نمبر) — اکتوبر ۱۹۵۶ء

۴۶- نگار سالنامہ (مومن نمبر) — ۱۹۳۹ء ، دہلی

۴۷- نگار — جلد ۶۶، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۵۵ء، دہلی

۴۸- نگار — شمارہ ۵، مئی ۱۹۶۰ء ، دہلی

۴۹- نگار (سالنامہ) — ۱۹۶۰ء ، کراچی

۵۰- نگار (تذکروں کا تذکرہ) — ۱۹۶۴ء ، کراچی

۵۱- نگار (مسائل ادب نمبر) شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۹۶۸ء، کراچی

۵۲- نگار (مومن نمبر) ۳۳ واں سال ، کراچی

۵۳- نگار (اصناف شاعری نمبر) نومبر دسمبر کا مشترکہ شمارہ ۱۱، ۱۲، کراچی ،

۵۴- نگار جون ۱۹۳۷ء

۵۵- امروز (روزنامہ) جمعۃ المبارک ۷ دسمبر ۱۹۷۹ء، جلد ۳۲، نمبر ۲۵۸،
لاہور

English Books:

1. Abdul Latif: The Influence of English Literature on Urdu literature

2. Arnold Mathew: The function of criticism at the present time.

3. -do- The study of poetry.

4. Cunningham: History of the Sikhs; S. Chand and Co. Delhi.

5. Eliot T.S: Essays on Poetry and Criticism.

6. G. Allana: Our Freedom Fighters (1562-1947) Pradise Subscription Agency, Karachi 4-1965.

7. Garett: Legacy of India.

8. Grahame Bailey: A History of Urdu Literature - Al-Biruni, Lahore, 1977.

9. Horace: Art of Poetry (translated by Filmer).

10. Hudson W.D: An Introduction to the Study of Literature.

11. Husaini S.A.Q: Administration under the Mughals-The Paradise Library Booksellers and Publishers, Dacca 1952.

12. Ikram S.M.: Muslim Rule in India and Pakistan, Lahore 1966.

13. Irvine William: Later Mughals vol.I & II (1719-1739).

14. J. Allan etc. etc. The Cambridge Short-History of India, S. Chand & Co., New Delhi-1964.

15. K. Ali: A New History of India & Pakistan, The Caravan Press, Lahore 1974.

16. M.A. Bhatti & Prof. Shujauddin: Star Golden History of Pakistan and India, Star Book De Lahore (New third edition).

17. Muhammad Hussain & others: History of Freedom Movement (Vol.I)(1707-1831), Pakistan Historical Society, Karachi 1960.

18. -do- Vol.II (1831-1905).

19. Muhammad Sadiq Dr: A History of Urdu Literature, Oxford University Press, London 1964.

20. Pakistan Historical Board: A Short History of Indo-Pakistan-Historical Society, Karachi 1963.

21. Perceval Spear: Twilight of the Mughals.

22. Russell Dr. & Khurshid-ul-Islam: Three Poets of Delhi (UNESCO-America).

23. Scott James: The Making of Literature.

24. Shelley: Defence of Poetry-Kitab Mahal, Lahore.

25. The Encyclopaedia Britanica: Eleventh Edition, Vol. xvi (L to R) Cambridge University Press, London.
